
ماہنامہ
کرن
اپریل 2024
www.pklibrary.com

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شجاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
قانونی مشیر ——— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز



واٹس اپ
03172266944

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ --- 25000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

کرن کتاب

مستقل سلسلے

اپریل 2024
جلد 46 شمارہ 01
قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

حمد باری تعالیٰ

حمد کثیر تیری شکر تمام تیرا
اے مالک دو عالم رحمٰن نام تیرا

تعریف کا ہے تُو ہی حق دار دو جہاں میں
ادراک سے ہمارے بالا مقام تیرا

فاران کی چوٹیوں سے ماہِ عرب جو نکلا
اس پر صلوٰۃ تیری، اس پر سلام تیرا

رحم و کرم کے والی نظرِ کرم تو کر دے
غفار ذات تیری بخشش ہے کام تیرا

جاؤں کدھر الٰہی گر چھوڑ دوں میں تجھ کو
در ایک ہی ہے جھکتے ذی احترام تیرا

سجدے میں تیرے آگے میں پڑ گیا ہوں آقا
منظور کر لے گرچہ بندہ ہوں خام تیرا

عزت کی زندگی دے دنیا و آخرت میں
ہم مانگتے ہیں تجھ سے انعام نام تیرا

مفتی شعیب اللہ خان

نعت رسول مقبولؐ

میں نعت شفیع اممؐ لکھ رہا ہوں
میں ان کو خدا کا کرم لکھ رہا ہوں

وہ مولا سے اُمّی لقب پانے والے
انہیں تاجدارِ حرم لکھ رہا ہوں

ہیں شافعِ روزِ جزا میرے آقا
تبھی ان کو ابرِ کرم لکھ رہا ہوں

شب و روز نعت ہی میں مگن ہوں
مگر پھر بھی غم ہے کہ کم لکھ رہا ہوں

خدا پر خدا کی خدائی ختم ہے
نبوت کو انؐ پہ ختم لکھ رہا ہوں

ابوبکرؓ و فاروقؓ و حیدرؓ و غنیؓ ہوں
محمدؐ کے نقشِ قدم لکھ رہا ہوں

تصور میں ارشدؔ ہے نامِ محمدؐ
قلم خم ہے آنکھیں ہیں نم لکھ رہا ہوں

سعید ارشد

مُدیرہ

یہ شمارہ ملے گا تو آخری عشرہ کی عبادتوں کے بعد آپ عید کا استقبال کر رہی ہوں گی۔

آپ سب کو ہماری جانب سے دلی عید مبارک

ہماری دعا ہے کہ عید آپ سب کے لیے خوشیوں کا تحفہ لے کر آئے۔ آپ کو اپنے پیاروں کے ساتھ عید کی خوشیاں نصیب ہوں۔ آمین

اللہ تعالیٰ نے انسان کا مزاج اس طرح کا بنایا ہے کہ وہ یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمام مصروفیتوں اور فکرات سے آزاد ہو کر کچھ دن خوشی منائے۔

کسی بھی قوم یا مذہب میں کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جن سے پوری قوم کی کوئی اجتماعی خوشی وابستہ ہوتی ہے۔ وہ دن اس کے لیے خاص ہوتے ہیں۔ قومیں نسل در نسل اس خوشی کو یاد رکھتی ہیں۔ اسے وہ اتنی اہمیت دیتی ہیں کہ وہ دن ان کے قومی تہوار بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے تہوار ایک علیحدہ اور جداگانہ شان رکھتے ہیں۔ اللہ کریم نے ہمیں خوشیاں منانے کے لیے سال میں دو دن عطا فرمائے ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ یہ عیدیں ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اس کا شکر ادا کر کے مناتے ہیں۔

روز افزوں مہنگائی کی صورت حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عید کے موقع پر ہر شخص اپنی حیثیت اور استطاعت سے بڑھ کر اپنے اور اپنے بچوں کے لیے خریداری کرتا ہے۔ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں۔ آپ کے احباب اور رشتہ داروں میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو بمشکل سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوں گے۔ اپنی عید کی خریداری میں ان مستحق لوگوں کا حصہ ضرور رکھیں۔ عید اجتماعی خوشی کا تہوار ہے۔ اس کے رنگ اسی وقت نکھرتے ہیں جب سب کے دل خوش ہوں۔

اس شمارے میں

☆ "میرا بچپن میری عید" شاہین رشید کا عید کے حوالے سے سروے

☆ سعدیہ عزیز آفریدی سے ملاقات

☆ "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول

☆ "سعیعہ عمیر کا مکمل ناول "سنگ ریزہ"

"سپاس گزار" میمونہ صدف کے ناولٹ کی آخری قسط

☆ ثمامہ دالعباد کا ناولٹ "میرے مہرباں"

☆ "تیری باندی کی شفا ہیں تیری بانہیں شاہا" سعیعہ مرزا کا ناولٹ

☆ قرۃ العین خرم ہاشمی کا ناولٹ "تو میرا رنگِ عید"

فرح انیس، صبا واجد، مریم شہزاد، نیہا ملک، صبا تحریم اور حفیظ لعل دین کے افسانے اور مستقل سلسلے

میرا بچپن، میری عید

شاہین رشید

زمانہ بہت بدل گیا ہے سوشل میڈیا اور موبائل اور دیگر سہولیات نے لوگوں کو بہت ماڈرن کر دیا ہے۔ اب نہ سادگی رہی ہے نہ سادگی کا معیار...... نہ پہلے جیسے تہوار رہے ہیں اور نہ ہی تہواروں کا اہتمام۔ اب تو عید کی خوشیاں بھی ماند پڑ گئی ہیں کہ اب لوگوں کا لائف اسٹائل بہت بدل گیا ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ ہر دن عید اور ہر شب شب برات ہے۔ گھروں میں روزوں کا جو اہتمام ہوتا تھا اب وہ بھی چیدہ چیدہ گھروں میں ہی نظر آتا ہے۔

عید کی یادیں بھی انہی کے دلوں میں زندہ ہیں جنہوں نے واقعی اہتمام کے ساتھ عیدیں گزاری ہیں۔ نئی نسل میں عید اور رمضان کا وہ جذبہ ہی نہیں رہا جو ہمارے وقت میں تھا۔ اس لیے اس سروے میں نئی نسل کے لوگوں نے حصہ نہیں لیا اور مصروفیت کا بہانہ کر دیا۔

سوال یہ تھا کہ

آپ بچپن میں کیسے عید مناتے تھے۔

ڈاکٹر نسیم اختر...... پروفیسر



آپ نے کیا یاد دلا دیا۔ عید سعید کے خوب صورت لمحات میں بچوں کی سب سے بڑی خوشی خوب صورت رنگ برنگے ملبوسات زیب تن کرنا اور سب سے عیدی وصول کرنا ہوتا تھا۔ اس تصور میں رات گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ صبح اٹھتے ہی نہا دھو کر والدہ صاحبہ نے رنگ برنگی تتلی جیسا لباس پہنانا جو کہ بہت قیمتی ہوتا تھا۔ نئے جوتے پہننا...... اور پرس ہاتھوں میں لینا تو بہت ضروری ہوتا تھا۔ کھانے کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ بس انتظار ہوتا تھا کہ بابا جان اور بڑے بھائی عید پڑھ کر آئیں تو ہم ان سے عیدی کا مطالبہ کریں۔ نظریں دروازے پر لگی ہوتی تھیں اور جیسے ہی وہ عید پڑھ کر آتے تھے زور شور سے عید مبارک کہنا اور عیدی کی فرمائش کر دینی۔ تو بابا جان نے کڑکتے نئے نوٹوں سے ہمارے پرس کا پیٹ بھر دینا۔ اور پرس کا پیٹ بھرتے ہی ہمیں اپنے خالی پیٹ کی فکر ہونے لگتی۔ پھر اماں نے کہنا اب تو سویاں کھالو، شیر خورمے میں آج تمہاری خاطر میٹھا بھی کم ڈالا ہے۔ بہت مشکل سے سویاں کھائیں اور اس کے بعد اماں اور بھائیوں عیدی لینی اور اس کے بعد میلے پر جانے کے لیے اصرار ہوتا ہے۔ عید سے ایک

دن قبل ہمارے شہر میں میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میں کھانے پینے کے اسٹالز، کئی ایرانی سرکس، موت کا کنواں، چڑیا گھر میں دوسر والا بچہ اور جل پری دیکھنا اور یہ سب کچھ ٹکٹ خرید کر دیکھا کرتے۔ میلے میں کھانے پینے کے اسٹالز سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ مگر بچوں کے کھلونوں کی عارضی دکانیں دلچسپی کا مرکز ہوتی تھیں۔ عیدی والے سارے پیسے خرچ کر کے جب گھر واپسی ہوتی، تو پرس بھی خالی ہوتا تھا اور دونوں ہاتھوں میں مختلف خریدی ہوئی چیزوں کے شاپرز ہوتے تھے۔ گھر داخل ہوتے ہی ان چیزوں کو اشتیاق سے دیکھنا، ان سے کھیلنا اور انہیں سجانا عید کے دن کی اولین ترجیح ہوتی تھی۔ عیدی خرچ کرنے کے بعد پرس کے خالی ہونے کا احساس بھی شدت سے ہوتا تھا لیکن عید کے دوسرے دن پرس پھر کچھ نہ کچھ بھر جاتا تھا۔ میلہ تین دن رہتا مگر ہم بچوں کو صرف ایک ہی دن کسی بڑے کے ساتھ جانے کی اجازت ہوتی۔ آج وہ ایام زندگی میں خوب صورت خواب کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ "میرے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے دن"

شازیہ گوہر ...... آرٹسٹ



رمضان المبارک کے شروع ہوتے ہی عید کی آمد کا انتظار شروع ہوجاتا تھا۔ فیملی کے ساتھ ہی عید کی شاپنگ ہوتی تھی اور ساری شاپنگ چاند رات کو ہی ہوتی تھی۔ فن کا فن اور شاپنگ کی شاپنگ...... اور گھر آنے سے پہلے ہاتھوں میں مہندی لگوا کے فجر کے وقت گھر آتے تھے۔ نیند سے آنکھیں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ آدھا ایک گھنٹہ سوتے۔ ہوتا یہی تھا کہ نانی صبح ہی صبح اٹھا دیتی تھیں۔ اور یوں ساری عید نیند میں ہی گزر جاتی تھی۔ لنچ کے بعد تھوڑا آرام ملتا تھا۔ اور شام کو پی ٹی وی کے پروگرام دیکھ کر ہی ٹائم گزرتا تھا۔

فصیحہ آصف خان...... رائٹر+شاعرہ

عید کا لفظ ہی خوش کن اور مسحور کن ہے۔ رنگا رنگ کپڑے، چوڑیاں، نیا جوتا، جیولری اور مہندی اور عیدی یہ سب مل کر عید کے احساس کو دلفریب بنا دیتے ہیں۔ بچپن کی عید کی خوشیوں اور مسرتوں کا کوئی شمار ہی نہیں ہوتا تھا۔ چاند رات کو پیالے میں گھلی مہندی۔ امی ہمارے، دونوں ہاتھوں میں لیپ کر کے کپڑا باندھ دیتی تھیں۔ صبح دیکھتے تو ہاتھ لال سرخ ہوتے جو ہمیں بے انتہا خوش کرتے تھے۔ سہیلیاں ایک دوسرے کو دکھا کر داد وصول کرتی تھیں۔ بچپن کی چاند رات بہت طویل لگتی تھی کہ کب صبح ہو، نئے چمکدار لباس پہنیں، بندے یا کانٹے، بالوں میں رنگا رنگ پنیں اور کلپ لگا کر خود کو حسین تر محسوس کرنے کا جاں فزا احساس کسی خزانے سے کم نہ ہوتا تھا۔

مرد حضرات تیار ہو کر عید کی نماز پڑھنے چلے جاتے اور ہم تیار ہو کر بے تابی سے ان کا انتظار کرتے کہ جلدی آئیں اور ہم عیدی وصول کریں۔ اپنے لش پش کرتے بٹوے کو عیدی سے بھرا دیکھ کر جو اطمینان اور خوشی ہوتی تھی وہ آج کے ہزاروں روپے کے مقابلے میں کروڑوں کے برابر تھی۔ امی دودھ میں مزیدار سویاں بناتی تھیں۔ ان پر دودھ کھوئے میں بھگوئے چھوہاروں کا ذائقہ آج تک پھر نہ ملا۔ بچپن کی عید ہر فکر، پریشانی اور دکھ سے مبرا تھی۔

دوپہر کو خاص پلاؤ اور قورمہ بنتا۔ رشتے دار ملنے آتے عیدی بھی دیتے تھے۔ عید کے دن یا اگلے دن کہیں نہ کہیں سیر سپاٹے کا پروگرام بھی بنتا تھا۔ سہیلیاں آتی تھیں مل جل کر کھایا پیا جاتا۔ گول گپے آئس کریم بوتل سب کے لیے پسندیدہ ہوتے تھے۔ ڈٹ کر عیدی خرچ کرتے تھے۔ بہت سہانی عیدیں تھیں۔ وہ دور ہی مسکراہٹوں بھرا تھا۔

اب نا وہ لوگ نا وہ ماحول، نا وہ سکون بھرے حالات اک نفسانفسی کا زمانہ ہے، دلوں سے سچی خوشیاں جیسے اداسی کی چادر اوڑھے بیٹھی ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے دلوں میں سچا ایمان اور خوشی مقید کردے۔ آمین

شاداب احمد صدیقی...... پروفیسر + کالم و مضمون نگار + صداکار

زندگی کے کسی بھی دور میں بچپن کی نٹ کھٹ یادیں جب سر اٹھاتی ہیں تو چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور لے آتی ہیں۔ میرا بچپن بھی اس طرح کی شوخ و چنچل اور معصوم یادوں سے بھرا پڑا ہے۔ عید کے کپڑے ہمیشہ تیار ہونے کے بعد میرے سپرد کیے جاتے۔ بچپن میں ڈیزائن پوچھنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ والدین جس بھی کلر کے ڈریس دلواتے ہیں اسے حاصل کرکے خوشی سے باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اس خوشی کی جھلک آج کے دور کے بچوں کو ان کی پسند اور خواہش کے مطابق سب کچھ دلوانے کے بعد بھی نظر نہیں آتی۔ بچپن کی عید کا مزا ہی کچھ اور تھا جس کی تیاریاں نصف رمضان سے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ جس میں کپڑے، جوتے، چشمے، رومال اور عطر وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اور دلچسپ بات یہ کہ جب سب چیزیں مل جاتی تھیں اور امی اسے الماری میں رکھ دیتی تھیں تو میں امی کی نظروں سے بچ کر کئی بار چپکے چپکے اپنی چیزوں کو نکال کر دیکھتا اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھ دیتا تھا۔ اور بے تابی سے عید کا انتظار کرتا۔

عید سے دو تین دن پہلے گھر کی صفائی ستھرائی کی جاتی تھی اور برقی قمقموں سے سجایا جاتا تھا۔ بچپن میں فرداً فرداً درجہ بہ درجہ دوستوں اور رشتے داروں کو عید کارڈز دینے کا بھی بہت رواج تھا اور جب سب کے یہاں سے کارڈ آتے تھے تو اس کو وصول نے کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی تھی اور عید کارڈز آنے کا سلسلہ چاندرات تک ''ڈاکیا'' کو عیدی دے کر عید کارڈز کی آخری کھیپ وصول کرنے پر ختم ہوتا تھا۔

آج کل کے بچے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کی لکھائی سے خصوصی طور پر لکھے گئے ان عید کارڈوں کی اچھوتی خوشی سے محروم ہیں۔ واٹس ایپ پر فیملی اور براڈ کاسٹ گروپس کے سو دو سو ممبرز کو ''گوگل بابا'' پر موجود بنے بنائے برقی کارڈ ایک ہی کلک میں پوسٹ کرکے بھگتا دیا جاتا ہے۔

چاندرات ہزاروں خوشیاں لے کر آتی۔ امی جان شیر خورما چنا چارٹ، دہی بھلے اور عید کی نماز کے کپڑوں کی تیاری میں مگن ہو جاتی تھیں۔ بہنیں گھر میں خصوصی طور پر مہندی کا عرق تیار کرتیں اور سب بہنیں اپنی ہتھیلیاں خوب صورت مہندی سے سجاتی۔ اہل محلہ سب مل کر عید کی نماز کے لیے جایا کرتے تھے اور خواتین گھر کو صاف ستھرا کرکے بچوں اور مردوں کا انتظار کرتیں۔ اب باری ہوتی تھی عیدی کی، انتظار ہوتا تھا کہ کب ابو اور چچا نماز پڑھ کر آئیں اور ہمیں عیدی دیں۔ اس وقت ملنے والے کرارے نوٹوں کے کاغذ کی تازہ خوشبو اب تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ 5 اور 10 روپے کی نوٹوں کی گڈی بنک سے منگوائی جاتی تھیں۔ عیدی کے تازہ نوٹ اپنے چھوٹے سے بٹوے میں جمع کرنا عید کے روز سب سے بڑا اور اہم مشن ہوتا تھا۔

امی عید کے دن دیسی مرغ کا قورمہ بناتی تھیں اور شیرمال کلچوں سے سب گھر والے دستر خوان چٹائی پر سجا کر مل کر کھانا تناول کرتے تھے۔ شام کو چچا جان کی فیملی آجاتی اور سب مل کر پرتکلف دعوت سے لطف اندوز ہوتے اور ہم سب کزنز مل کر کھیلا کرتے

تھے۔ اور یوں عید کا اختتام ہوتا تھا۔ اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ اب عید پہلے جیسی نہیں رہی۔"

ریاض فاطمہ.......رائیٹر + کالم، مضمون نگار + سابقہ ایڈیشنل ڈائرکٹر سوشل ویلفیئر



بچپن میں بڑے شوق سے عید مناتے تھے۔ صبح اٹھ کر رات کو لگائی گئی مہندی کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تو ڈیزائن والی مہندی کا رواج نہیں تھا تو صبح اٹھ کر مہندی کا چڑھا رنگ دیکھ کر بہت اچھا لگتا تھا۔

عید کی شاپنگ میں جو کپڑے چوڑیاں جوتے ہوتے ہیں انہیں رات کو اٹھ کر دیکھنا...... تو بڑی انجانی سی خوشی ہوتی تھی کہ ہم عید کے دن اسے پہنیں گے۔ عید کے دن صبح ہی نہا دھو کر تیار ہو جاتے تھے اس کے بعد امی ناشتا دیتی تھیں۔ اور ناشتے میں ہمیشہ امی عید کے دن قیمے کے سموسے امی ایک خاص طریقے سے بناتی تھیں جو کہ بہت لذیذ ہوتے تھے اور مجھے یاد نہیں کہ میں کتنے کھا جاتی تھی اور دیگر بہن بھائی بھی۔ اس کے علاوہ شیر خورما ہوتا تھا جو ہم پیالہ بھر کے کھاتے تھے اور عید کا بے تابی سے انتظار بھی اس ناشتے کی وجہ سے اور نئے کپڑے اور مہندی کی وجہ سے ہوتا تھا۔

پھر ناشتے سے فارغ ہو کر ہم۔ بہن بھائی ہوتے تھے، سہیلیاں ہوتی تھیں اور مزے ہوتے تھے اور چونکہ میرا بچپن ملیر کینٹ میں گزرا ہے تو اس کی خوب صورت یادیں ابھی تک میرے دل و دماغ میں ہیں۔ لیجیے عیدی کا تذکرہ تو رہ ہی گیا۔ عیدی ملتی تھی جسے انتہائی حفاظت سے رکھا جاتا تھا اور امی اسے واپس لینے کی کوشش کرتی تھیں کہ کچھ تو دے دو، ہمیں بھی آگے دینے ہیں۔ تو کچھ واپس ہم کر بھی دیتے تھے مگر زیادہ تر نہیں دیتے تھے واپس کرنا ہمارے موڈ پر منحصر تھا۔

بس اب تو یادیں رہ گئی ہیں۔ سب کچھ بکھر گیا ہے۔ اب نہ والدین رہے اور نہ ہی اس گھر میں بہن بھائی، سب شادی شدہ ہو کر کچھ ملک کے دور دراز علاقوں میں جا بسے اور کچھ ملک سے باہر چلے گئے۔ تو پرانی یادیں تو اب سہانا خواب ہی رہ گیا ہے۔

جویریا نیر......آرٹسٹ

ہمارے دور کی عیدیں بہت مزے کی ہوا کرتی تھیں مجھے ایسا لگتا ہے۔ کیونکہ اس دور کے بچے اس طرح انجوائے نہیں کرتے جتنا کہ ہم کیا کرتے تھے۔ اور مجھے یاد ہے کہ میں 9 سال کی عمر تک اپنے ابا کے ساتھ مسجد جا کر عید کی نماز پڑھا کرتی تھی۔ کبھی شلوار قمیص کے ساتھ اور کبھی پینٹ شرٹ کے ساتھ...... عید کی نماز پڑھ کر اور گھر آ کر دوسرا ڈریس جو خاص طور پر عید کے لیے سلوایا ہوتا تھا پہنتی تھی اور پھر عیدی کی خواہش اور میٹھا کھانے کی طلب۔ سب سے پہلے ابا اور امی اور پھر بھائی وغیرہ عیدی دیا کرتے تھے ......اور چونکہ چھوٹی تھی تو زیادہ ملا کرتی تھی۔

ہمارے یہاں پورا سال کولڈ ڈرنک نہیں آتی تھی لیکن عید کے دن تو ہر چیز کھانے کی اجازت ہوتی تھی۔ خوب عیاشی ہوتی تھی اور کیا کیا الم غلم کھایا کرتے تھے۔ جھولے جھولنا، پارک جانا اور آئسکریم تو بے حساب ہی کھاتے تھے۔

شام کو ننھیال اور دیگر رشتے داروں کے گھروں

میں عید ملنے جایا کرتے تھے۔ اور عید کے بعد پھر سہیلیوں کے ساتھ اور اسکول میں عید ملن پارٹیاں ہوتی تھیں اور سب چیزیں اپنی اماں سے بنوا کر لے جایا کرتے تھے۔ بس اسی طرح عید گزر جاتی تھی۔

افراز علی نازش۔ ایڈیٹر ماہنامہ "شی" میگزین انٹرنیشنل



یادیں سہانی بھی ہوتی ہیں اور غم ناک بھی۔ البتہ بچپن کا زمانہ چونکہ بے فکری و بادشاہی کا ہوتا ہے تو اس میں انسان رنج والم سے متعارف نہیں ہوا ہوتا۔ اس لیے بچپن کی یادیں عام طور پر سہانی ہی ہوتی ہیں۔

ویسے تو بچپن کی ساری ہی یادیں حسین ہوتی ہیں لیکن غالباً ان میں سب سے زیادہ خوش کن یادوں کا تعلق اس دور کی عیدوں سے ہی ہوتا ہے۔ عید کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا تعلق اپنے شہر سے بہت گہرا ہوتا ہے کیونکہ عید وہ خاص تہوار ہے جسے ہر شخص اپنے شہر میں ہی منانا چاہتا ہے۔

عید کی نماز تک ہم خود کو ایک قیدی تصور کرتے تھے۔ نماز کی ادائی کے بعد سب سے زیادہ عیدی اکٹھی کرنے کا جنون ہوتا تھا اور یہ جنون بھی ایک دلکش مشغلہ ہوتا تھا۔ ابو اور چچا لوگوں سے جیب بھرنا شروع کر دیتے تھے۔ اور اس بہانے قریبی رشتے داروں سے بھی مل لیتے تھے۔ پھر ظہر کے بعد دوبارہ بن سنور کر گھر سے نکلتے اور قریبی فٹ پاتھ پر بجے فوٹو اسٹوڈیو پہنچ کر بڑے اہتمام سے عید کی تصویریں بنواتے تھے اور پھر وہ تصاویر کئی دن کے بعد (ڈھل) ملا کرتی تھیں جو کہ بلیک اینڈ وائیٹ ہوا کرتی تھیں۔

بچپن کی عید کا کھلونوں سے بھی بڑا گہرا تعلق ہوتا تھا اور ایک روپے میں کئی کھلونے آجایا کرتے تھے۔ اس دور کے کھلونے بھی بڑے انوکھے ہوا کرتے تھے۔ عید کے موقع پر بازار تو بند ہوتے تھے مگر مٹھائی کی دکانیں کھلی رہتی تھیں جن پر خوب سجاوٹ ہوتی تھی۔ ہمارے دور میں ہاتھ میں گھڑی باندھنے کا بھی بڑا فیشن ہوا کرتا تھا اور عید کے موقعوں پر طرح طرح کی نقلی گھڑیاں مارکیٹ میں آجاتی تھیں جن کو پہن کر اتراتے پھرتے تھے ہم......

وہ کہانیوں، رسالوں اور ناولوں کا بھی دور تھا۔ بچوں کے جو مہنگے ناول ہم عام دنوں میں نہیں خرید پاتے تھے وہ عید کے موقع پر عیدی کے پیسوں سے خرید لیتے تھے۔ اپنی پسند کی کئی کتابیں ہم نے عید کے پیسوں سے خریدیں اور اس زمانے میں مطالعہ کا بھی شوق بہت ہوا کرتا تھا۔

شازیہ الطاف ‏ ‏ افسانہ نگار + ناول نگار



ہمارے بچپن کی عیدیں بہت خوب صورت اور خوش گوار ہوتی تھیں۔ رمضان شروع ہوتے ہی میں نے امی کا سر کھالیتا کہ مجھے روزہ رکھنا ہے اور روزہ رکھ کر سارا دن ابو کے ساتھ دکان پر بیٹھتی تھی اور جب وہ کوئی سودا وغیرہ لینے جاتے تو مجھے ساتھ ہی لے جاتے تھے کہ کہیں اسے روزے کی شدت محسوس نہ ہو۔

عید کے دن کڑکتے دس روپے کے نوٹ کا بھی شدت سے انتظار ہوتا تھا۔ ان سے رنگ برنگے گولے گنڈے اور پگھلتی قلفیاں ہم چاروں بہنیں بڑے شوق سے کھاتی تھیں۔ اور جس بہن کی قلفی گرنے والی ہوتی تو مجھ سے کہا جاتا کہ تھوڑی سی کھالو...... یوں ان کی قلفیوں میں سے میں اپنا حصہ نکال لیا کرتی تھی۔ لباس کے معاملے میں میری یہ فرمائش ہوتی تھی کہ لباس دور سے چمکے۔ تو ایک بار بجٹ آ کر اور ابو کے لاڈ کی وجہ سے امی نے ایک بار چمکیلا سا فراک سی دیا تھا جسے پہن کر میں پورا دن سرشار رہی کہ میں تو سب سے الگ لگ رہی ہوں۔ حالانکہ امی مجھے بار بار کہتی رہیں کہ "تم تو عالم لوہار" لگ رہی ہو۔ مگر مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی تو بس عید ایسی ہی ہوتی تھی پورا دن گلیوں میں گھومنا پھرنا، دوستوں کو کپڑے دکھانا اور کھانا پینا۔ عید کے دن امی حلوہ بنایا کرتی تھیں جو بھی حلوہ بن جاتا تھا تو بھی پنجیری...... تو ہم ابو سے پوچھتے کہ کیا بن رہا ہے تو وہ کہتے کہ اس بات کا پتا تو تمہاری ماں کو بھی نہیں ہوگا جو بن رہا ہے وہ کھالینا۔

اپنی دوستوں کو ایک ایک روپے والا عید کارڈ دینا اور پھر ان کی طرف سے عید کارڈ کا انتظار کرنا۔ تو بہت خوب صورت یادیں ہیں بچپن کی عیدوں کی۔ اب تو عید صرف ایک تہوار کا نام رہ گیا ہے ہر کوئی موبائل پر ہی وش کر لیتا ہے۔ پہلے والی گرم جوشی نہیں رہی ہے۔ ایک شعر میں آخر میں سنانا چاہوں گی جو میری بچپن کی دوست گلزار عرف گاما نے مجھے عید کارڈ کے اوپر لکھ کر بھیجا اسے پڑھ کر مجھے بہت شرم آئی تھی مگر آپ نے شرمانا نہیں ہے۔

ہری ہری گھاس پہ گدھا چرنے آ گیا
شاعری کرنی آتی نہیں پیار کرنا آ گیا

مریم عزیز...... رائٹر، ناول نگار

انسان کی زندگی کا بہترین دور اس کا بچپن ہوتا ہے۔ میرے لیے تو میرا بچپن میرا سب سے حسین دور تھا اور ابھی جو بچپن کی عید یاد آ رہی ہے۔ وہ، وہ عیدیں ہیں جو میری میرے ابو کے ساتھ گزری ہیں۔ ان کے بعد تو بس عید کا دن ایک تہوار کی طرح گزر جاتا ہے وہ بھی سو کے۔

عید سے ایک دن پہلے بڑی ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی۔ مجھے بچپن میں مہندی، چوڑیوں اور میچنگ جیولری کا بہت شوق تھا۔ ویسے یہ کام امی کے ہوتے ہیں لیکن میری میچنگ جیولری میرے ابو لے کر آتے تھے۔ مہندی لگانے کے بعد یہی خواہش ہوتی تھی کہ میرا مہندی کا کلر سب سے اچھا آئے اور ڈارک ہو اور مزے کی بات یہ ہے کہ میری مہندی کا رنگ ہمیشہ ڈارک ہوتا تھا۔

اب تو میں عید کے دن ذرا لیٹ ہی اٹھتی ہوں کہ پتا ہوتا ہے کہ اٹھ کر کام ہی کرنے ہیں اس لیے اب مہندی بھی نہیں لگاتی کیونکہ فائدہ کچھ نہیں ہے صبح اٹھ کر امی کے ساتھ کچن میں کام ہی کروانے ہوتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ عید کے دن صبح اٹھ کے امی کے ساتھ کچن میں جاتے تو سویاں تیار ہوتی تھیں۔ پھر ابو اور بھائی کا انتظار ہوتا ابو عید کے دن عید کی نماز کے بعد قبرستان چلے جاتے پھر واپس آ کر ہمارے ساتھ کچن میں آ جاتے ہمارا کچن کافی بڑا تھا۔ خیر پھر ابو ہمیں عیدی دیتے تھے اور ہماری عیدی ہمارے سب کزنز سے زیادہ ہوتی تھی اور ہم ان کے درمیان بڑے مغرورانہ انداز میں پھرا کرتے تھے۔

ہم سارے پیسے کھانے پینے میں اڑا دیتے تھے۔ لیکن میں پھر بھی بچت کر لیتی تھی۔ اور ابھی بھی

عادت ہے بچت کی۔

دوپہر کے بعد نانو کے گھر چلے جاتے تھے۔ اور اگر لاہور سے عید پر ہمارے کزنز آئے ہوئے ہوتے تو عید کا مزا دوبالا ہو جاتا۔ ہم سب مل کر بہت مستی کرتے تھے۔ نانی کے گھر کا صحن کافی بڑا تھا تو ہم وہاں ہر طرح کے گیمز کھیلا کرتے تھے پکڑم پکڑائی، چھپن چھپائی۔ کرکٹ اور پھر سب مل کر گھر سے باہر چنا چاٹ کھانے نکل جاتے تھے اور وہ بھی بڑوں سے چھپ کر۔ نانو کا بڑا گھر مجھے بہت پسند تھا۔ پرانا تھا اور حویلی ٹائپ کا تھا بڑے بڑے کمرے تھے اس کے ......اور ......اور پھر سب الگ الگ ہو گئے اور وہ گھر بھی نہ رہا۔ مجھے وہ گھر بہت یاد آتا ہے۔ کافی سال پہلے وہاں گئی تھی۔ اب تو کافی کچھ بدل گیا ہے وہ گھر بھی نیا بن گیا ہے۔

خیر بچپن کی سب عیدیں یادگار تھیں۔ اب تو وہ مزا ہی نہیں رہا نہ ہی وہ لوگ جن کی وجہ سے عید عید لگا کرتی تھی۔

اقبال بانو ......ڈرامہ نگار + افسانہ و ناول نگار



ہمارا بچپن تو بڑا سیدھا سادھا اور معصوم سا تھا۔ آج کے بچوں کی طرح تیز طراری تو ہم میں تھی ہی نہیں۔ امی نے جو کپڑے بنا دیے ہنسی خوشی پہن لیتے تھے۔ کبھی بھی شور شرابا نہیں کیا تھا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے دلوں میں بھی ایسی کوئی خواہش جنم نہیں لیتی تھی کہ ہمیں یہ لینا ہے وہ لینا ہے۔ میری امی مجھے عید کے دن کے لیے خوب صورت فراک بنا کے دیتی تھیں اور عید پر ایک ہی سوٹ بنتا تھا، آج کل کی طرح نہیں کہ روز سوٹ بن رہے ہیں اور عید کے تینوں دن کے لیے بن رہے ہیں۔ سوٹ کے ساتھ ایک خوب صورت سا چھوٹا سا پرس بھی ضرور ہوتا تھا، سینڈل ہوتے تھے......اور یہ ساری چیزیں رات کو سرہانے رکھ کر سوتے تھے اور جب آنکھ کھلتی اسے ضرور بلکہ بار بار دیکھتے تھے۔ ہائے وہ خوب صورت سا بچپن کہاں گیا وہ دن کیا ہوئے۔

رات کو ہاتھوں میں مہندی لگائی جاتی تھی آج کل کی طرح ڈیزائن نہیں ہوتے بلکہ سیدھی سادی ہوتی تھی۔ مٹھی میں مہندی رکھ کر مٹھی بند کر دی جاتی تھی اور بڑی احتیاط کے ساتھ امی مٹھی بند کر دیتی تھیں اور صبح اٹھ کر جب مٹھی کھولتے تھے تو ایک پنج سی بن گئی ہوتی تھی اور خوب صورت رنگ بھی نکل آتا تھا۔

امی صبح شیر خورمہ بناتی تھیں ڈھیر سارا جس کو محلے میں بانٹنے کا کام میں انجام دیا کرتی تھی اور جس گھر بھی جاتی تھی پانچ روپے کا کڑکڑاتا نوٹ مل جایا کرتا تھا عیدی کے طور پر جسے ہم اپنے چمکیلے پرس میں رکھ دیا کرتے تھے۔ بچپن کی وہ عید کی خوشیاں بڑے ہو کے ہم نے کبھی نہیں منائیں۔ برسوں گزر گئے کبھی مہندی نہیں لگائی ہاتھوں پہ......اب تو عید بھی پھیکی پھیکی سی گزرتی ہے بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ ہمیں تو عید بھی رلانے کے لیے آتی ہے۔ سو ہماری بچپن کی عیدیں یادگار ہیں اور بڑے پن کی عیدیں بیکار ہیں۔"

☆☆

سعدیہ عزیز آفریدی سے ملاقات

شاہین رشید

افسانہ نگار اور ڈرامہ رائٹر۔ یہ ان کا تعارف ہے فری لانس کام کرتی ہیں، رائٹنگ کے علاوہ ایڈیٹنگ کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں۔ محبت کرنے والی سعدیہ عزیز سے ایک چھوٹی سی ملاقات آپ سب کے لیے۔



''کیا حال ہے؟''

''الحمدللہ۔''

''آج کل کیا مصروفیات ہیں، گھریلو بھی اور پروفیشنل بھی؟''

''پروفیشنل میں تو یہ کہ عید کے بعد ''گرین چینل'' پے ایک پروجیکٹ آن ایئر ہوگا۔ اور آج کل فری لانس رائٹر کے طور پر کام کر رہی ہوں۔ اور ۔اور گھریلو مصروفیات تو وہی ہیں جو ساری خواتین کی ہوتی ہیں۔ ہمیں رائٹر ہونے اور جاب کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ملتا بلکہ گھر اور آفس کو توازن سے لے کر چلنا پڑتا ہے۔''

''چلیں تو پھر مزید سوالات سے پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟''

''جی ضرور۔ میرا پورا نام سعدیہ عزیز آفریدی ہے سعدیہ کا مطلب نیک، پارسا اور متقی ہے۔ عزیز میرے والد صاحب کا نام ہے اور والد کی طرف سے ہم ''یوسف زئی'' ہیں۔ اب آ جائیں ''آفریدی'' پر تو آج یہ بات میں آپ کے توسط سے کھول دیتی ہوں کہ میری جہاں بیعت ہوئی تھی وہ پیر صاحب آفریدی تھے تو میرے نام کے ساتھ آفریدی اس طرح لگا کہ جب 1993ء میں، میں نے اپنا افسانہ بھیجا تو اسی سرنیم سے بھیجا تھا یعنی سعدیہ عزیز آفریدی کے نام سے۔ تو یہ نام مشہور ہو گیا اور یوں میرے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جڑ گیا۔

میں 3 جنوری 1972ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ والد کے انتقال کو اکیس سال ہو گئے ہیں جبکہ والدہ کے انتقال کو نو سال ہو گئے ہیں۔ ہم تیرہ بہن بھائی ہیں۔ مجھے اور سب سے چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر سب شادی شدہ ہیں، اور سب اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم اور آباد ہیں۔

تعلیم کے معاملے میں تھوڑی بدقسمت رہی۔ بہت اعلا تعلیم حاصل نہیں کر پائی لیکن زندگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ سیکنڈ ایئر میں تھی جب ڈیڈی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو زندگی ویسے ہی سوتیلے بچے جیسا سلوک کرتی ہے۔ اور ماہ و سال ایسے ہی گزرنے لگے تو میں نے

لکھنے لکھانے کو سنجیدگی کے ساتھ لے لیا۔ تو تعلیم کے راستے مزید رک گئے۔ ہاں مطالعہ کا شوق تھا تو وہ میں کسی نہ کسی طریقے سے پورا کرتی رہتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں۔ اور اکیلا پن بہت تھا تو پھر لفظوں کو ہی اپنا دوست بنالیا۔"

"لکھنے کا آغاز جیسا کہ آپ نے بتایا 1993ء سے کیا۔ کس میگزین سے؟"

"مجھے "قدم بھر زمین" کرن نے دی، سفر کی پہلی شروعات تھی پھر اس کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کراچی کے مختلف رسائل میں لکھا اور بہت



لکھا۔ پھر "جیو" میں جاب ہوئی بطور رائٹر کے، تو پھر مصروفیات بھی اچھی خاصی ہوگئیں اور جاب کی مصروفیات اتنی زیادہ ہوگئیں کہ پھر وقت ہی نہیں ملا۔ میگزین میں لکھنے کا۔ اس دوران امی کا انتقال ہوگیا تو زندگی بالکل بے رنگ ہوگئی۔ بس پھر مشین کی طرح جت گئی۔ گھر سے آفس اور آفس سے گھر...... پھر کسی طرف نہیں دیکھا۔ ایک دو تحریریں بھیجیں خواتین اور کرن میں لیکن وہ ریجیکٹ ہوگئیں تو رہی سہی دلچسپی

بھی ختم ہوگئی...... کچھ عرصہ قبل "جی این این میں جاب کررہی تھی آج کل جاب لیس ہوں۔ فری لانس ایڈیٹنگ، ڈرامہ اسکرپٹ رائٹنگ سے ہی منسلک ہوں۔"

"کتنے ڈرامے کرچکی ہیں۔"

"اسکرین پے کم ہی لکھے مگر جتنے بھی کیے وہ خاصے پسند کیے گئے۔ کیونکہ آفس کی زیادہ مصروفیات تھیں جیو سے "میکے کی یاد نہ آئی" کیا ایک ٹیلی فلم "ہونا تھا پیار" کی، ایک ہے "اے پلس" سے کیا۔ یتیم کے نام سے ایک پلے کیا جو ادھورا رہ گیا "کووڈ" کی وجہ سے اسے جلدی ختم کردیا گیا تو کافی تنقید کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ جسے ناظرین انجام سمجھ رہے تھے وہ میرے ڈرامے کا وسط تھا۔ پھر وہ ہو نہیں سکا تو وہ کوتاہی بھی بطور رائٹر میرے سر گئی۔"

"جو لکھا وہی ڈرامہ بنا؟"

جی اللہ کا شکر ہے کہ میں نے جو کہانی دی ویسے ہی "من و عن" بنی بھی۔ اور جنہیں اس معاملے میں Suffer کرنا پڑا تو کبھی کبھی یہ ہماری یعنی

پروڈکشن ہاؤسز اور چینل کی مجبوری ہوتی ہے۔ کہانی میں ٹویسٹ اینڈ ٹرن اور کہانی کو مضبوط کرنے کے لیے ہمیں کچھ ٹریکس ڈالنے پڑتے ہیں اور کچھ غیر ضروری ٹریک حذف کرنے پڑتے ہیں۔ کہانی بھی کبھی کبھی اس تبدیلی سے بہت عمدہ ہو جاتی ہے اور یہ بات رائٹرز بھی تسلیم کریں گے۔"

"سنا ہے کہ معاوضہ بہت اچھا ملتا ہے رائٹرز کو؟"

"جی بالکل۔ لیکن ان رائٹرز کو جو اب شہرت پا چکی ہیں جن کے نام پر ڈرامہ خریدا جاتا ہے۔ ان رائٹرز کو واقعی بہت معاوضہ ملتا ہے۔ اتنا اچھا معاوضہ ملتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گھر کو اچھے طریقے سے چلاتی ہیں بلکہ اپنے لیے اچھا سا گھر بھی خرید سکتی ہیں۔ باقی اوسط درجے اور سی کیٹیگری یا گھوسٹ رائٹرز ان ساری سہولیات سے مبرا ہوتی ہیں یا ہوتے ہیں۔ وہ تو روزانہ کی بنیاد پر کنواں کھودتے ہیں اور روز پانی پیتے ہیں۔"

"گھوسٹ رائٹر سے کیا مراد ہے؟"

"جی گھوسٹ سے مراد وہی رائٹر ہیں جو کسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے رائٹر ہیں جو پیسوں کے لیے "گھوسٹ" رائٹنگ کرتے ہیں۔ رائٹنگ میں ان کا نام نہیں جاتا بس پیسے مل جاتے ہیں۔ اور یہ اندر کی بات ہے اور چونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں تو مجھے سب معلوم ہے۔"

"لکھنے کے معاملے میں کبھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یا بس اسکرپٹ لکھ دیا کافی ہے؟"

"میں دراصل بطور رائٹر اور بطور ایڈیٹر کے "جیو" میں داخل ہوئی تھی۔ اس لیے لکھنے کے معاملے میں باہر بیٹھ کے فری لانس لکھنے کے مقابلے میں کم مشکلات پیش آئیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں کے مصداق میں مشکلات سے کھیلتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ مجھے باہر بیٹھ کر کام کرنے میں مشکلات پیش نہیں آتیں میں "ای میل" کردیتی ہوں۔ وہ انہیں وصول ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کچھ چینج کرنا ہو تو اسی طرح وہ ایک میل کردیتے ہیں اور کام آسان ہو جاتا ہے اور

سب کچھ ٹھیک طرح سے چلتا رہتا ہے۔ اور اب تو لوگ ملک سے باہر بیٹھ کر بھی آسانی سے اسکرپٹ لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اب لکھنا پہلے کی بہ نسبت آسان ہو گیا ہے۔"

"آج کل ساس بہو کے ڈرامے کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ کیا اس موضوع پر لکھنا آسان ہے۔"

"ہاہاہا۔ سازشی ساس، بہو پر لکھنا واقعی آسان کام لگتا ہے لیکن جب میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو مجھے مشکل لگتا ہے۔ کیونکہ ایسا بھی کیا ہی نہیں جیسا اسکرین کی ڈیمانڈ پر لکھنا پڑتا ہے۔ اور ایسے ڈرامے لکھنا رائٹر کے لیے مجبوری ہوتے ہیں۔ کیونکہ خواتین جتنی مرضی برائیاں کریں، برا بھلا کہیں لیکن دیکھنا بھی ایسے ہی ڈرامے چاہتی ہیں۔ تب ہی تو ریٹنگ بڑھتی ہے اور خواتین دیکھتی ہیں تو ریٹنگ آتی ہے۔ یہ بات تو آپ بھی مانیں گی۔"

"پلاٹ کیسے ذہن میں آتا ہے، ہجوم میں، تنہائی میں یا یونہی چلتے پھرتے؟"

"جی چلتے پھرتے، کام کے دوران کسی بھی بات سے اچانک کوئی خیال آجاتا ہے تو اسے پکانا شروع کردیتی ہوں اور اسے مکمل شروعات، وسط اور اختتام کے ساتھ اس کا ون لائنر لکھ لیتی ہوں۔ میں جب پرنٹ میڈیا میں تھی تو بھی ایسا ہی کرتی تھی کہ اپنے آئیڈیاز لکھ لیتی تھی۔ رجسٹر بھرے پڑے ہیں آئیڈیاز سے لیکن لگتا ہے میرے بعد بھی ایسے ہی پڑے رہ جائیں گے۔"

"ایسی مایوسی کیوں؟ میں فیس بک پر بھی تمہاری مایوسی والی تحریر پڑھ رہی تھی۔ تو ایسا کیوں ہے؟ کیا رویوں نے دکھ دیا ہے؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔ جب کبھی بھی انسان اکیلا ہوتا ہے تو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ یہ زندگی کب تک کی ہے؟ پھر دل چاہتا ہے کہ وہ دوست جو آج مصروفیات کا شکار ہیں ان سے ہوں جا کر کہ پلیز، یہ بات سمجھیں کہ مصروفیات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی لیکن زندگی کی انتہا ہے، حد مقرر ہے۔ اس کا اختتام ہے۔ لیکن ہم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔ اس وقت تک تو بالکل بھی نہیں جب

تک کوئی پکارنے والا خاموش ہو کے ہماری زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلا نہیں جاتا۔ میں بس لوگوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کسی کی قبر پر پھول رکھنے سے بہتر ہے کہ آپ اس کی زندگی میں چاہے ایک پھول دیں مگر دیں ضرور تاکہ اس کے رویے سے اس کی زندگی میں ایک امنگ پیدا ہو جینے کی۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اب آ جائیں تھوڑا انجی لائف کی طرف۔ امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"امور خانہ داری سے مجھے بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ میں اور میرے بعد چار بھائی تھے تو میں بھی ایک بھائی بن چکی تھی، کھیل کود، کرکٹ اور لڑکوں والے گیمز کھیلنا ان میں زیادہ دلچسپی تھی لیکن پھر میٹرک کے بعد امی اور تائی نے زبردستی کچن میں لے جا کر کھڑا کر دیا کہ آج تم روٹیاں بناؤ گی تو سب کھانا کھائیں گے ورنہ نہیں۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ رو دھو کے اور کوئی راستہ نظر آنے پر روٹیاں پکائیں۔ اور بس۔ پھر تو پورا کچن اور گھر کی ڈھیروں ذمہ داریاں ہمیں سونپ دی گئیں۔ جو کہ ہم نے نبھائیں اور آج تک نبھا رہی ہوں۔"

"سیر و سیاحت سے لگاؤ؟ گیمز وغیرہ سے لگاؤ ہے؟"

سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے لیکن موقع نہیں مل پاتا۔ شاید کبھی زندگی سے اپنی مرضی کا وقت چرا کر یا چرا پاؤں تو پھر گھوم لوں گی بھی۔ پر ایسا کہاں ہوتا ہے۔ کرکٹ کی زبردست فین ہوں لیکن جب سے پاکستان نے غیر سنجیدگی سے بڑے بڑے ٹورنامنٹ میں گلی محلے کے بچوں سے بھی بی زیادہ بری کارکردگی دکھائی ہے تو ہم نے تو کرکٹ سے ہی منہ موڑ لیا ہے۔"

"آپ نے سیریل لکھے ہیں۔ آپ کو خود کیا پسند ہے سیریل سیریز یا سوپ؟ اور مزاح کتنا پسند ہے؟"

"مجھے سیریل پسند ہیں اور محمد احمد کا لکھا ہوا مزاح پسند ہے ویسے عموماً سنجیدہ ہی چیزیں زیادہ دیکھی ہوں۔ ایک ٹیلی فلم "ہوتا تھا پیار" میں نے محمد احمد صاحب کی سپرویژن میں لکھی تھی۔ اور سوپ میں نادیہ خان کا "دل ہی تو ہے" بہت پسند آیا تھا۔

جب میں شیراز احمد قاضی کی سپرویژن میں کام کر رہی تھی تو ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ روزانہ آن ایئر ہونے والے ان ڈراموں پر بحث کرتے تھے جن کی ریٹنگ کافی ہوتی تھی۔ اس کی اچھائی برائی۔ کمی بیشی پر رائے لیتے تھے۔ تو مجھے ہر طرح کے ڈرامے دیکھنے کی عادت ہو گئی۔ آج کل ذاتی طور پر مجھے محبت اور تھرل ٹائپ کے ڈرامے پسند کر رہے ہیں جیسے "ذخی" اور "کابلی پلاؤ" بہت پسند آ رہا ہے۔"

"آپ نے بتایا کہ والدین حیات نہیں ہیں، بہن بھائی سب شادی شدہ ہیں تو کیا اکیلی رہتی ہیں؟"

"جی والدین کا انتقال ہو چکا ہے لیکن میری ایک بہن بیوہ ہیں، ایک کو طلاق ہو چکی ہے اور ایک بہن کا شوہر دبئی میں ہوتا ہے۔ تو ہم تین بہنیں اور ایک بھائی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہم سب ساتھ رہتے ہیں اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"مزاجاً کیسی ہو؟"

"میں مزاجاً بہت نرم ہوں۔ محبت بانٹنا میرا کام ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنہیں محبت کے سوا کوئی کام نہیں آتا۔ پہلے غصے کی تیز تھی لیکن پھر بھی غصے میں چپ ہو جاتی تھی۔ میرا غصہ چیخنے چلانے والا نہیں ہوتا۔ میں چپ ہو کر سامنے والے کو انسان ہونے کا مارجن دیتی ہوں۔ میرا غصہ دیر تک نہیں رہتا۔ معاف کر دینے میں پہل کرتی ہوں اور اس بات کی قائل نہیں کہ ناراضی یا غصے میں کسی کی دنیا اور آخرت خراب کرنے کے لیے معاف نہ کروں۔ میں ہمیشہ معاف کر دینے پر یقین رکھتی ہوں۔ کیونکہ میرا ماننا ہے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انسان دوسروں کو بھی وہی کچھ دیتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے تو میرے پاس تو دوسروں کے لیے محبت اور عنایت ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے سعدیہ عزیز آفریدی صاحبہ سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆☆

مریم شہزاد

بن تیرے عید کیسی

تالیہ بیڈ پر اوندھی لیٹی بلاوجہ ہی موبائل فون کو تکے جارہی تھی، یوں تو اس نے فیس بک آن کی ہوئی تھی مگر وہ اس پر کیا ڈھونڈ رہی تھی اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا۔ کتنی ہی دفعہ وہ موبائل بند کر کے رکھ چکی تھی



اور کچھ ہی دیر بعد دوبارہ اٹھا لیتی۔ بجن روٹھا ہو تو کب کچھ اچھا لگتا ہے۔ ایک بار پھر اس نے موبائل بیزاری سے بند کر کے رکھ دیا کہ اچانک ہی واٹس ایپ کی بیل بج اٹھی۔ اس نے دیکھا تو عبید کا میسج تھا اس نے بے تابی سے کھولا۔

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے تیرا چہرہ دیکھا تھا

تالیہ نے عبید کا میسج پڑھا تو پچھلی چاند رات کا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

"ہائے مر گیا!!! ہائے تالیہ جان جلدی آؤ۔ تالیہ۔"

عبید چھت پر چاند دیکھنے گیا تھا کہ اچانک ہی اس نے تالیہ کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ تو ہول ہی گئی، بھاگی بھاگی سیڑھیاں چڑھ کر پھولتی سانسوں کے ساتھ اوپر پہنچی تو عبید آنکھیں بند کیے اس کو آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہوا عبید؟ کیا ہوا؟"

عبید نے جھٹ آنکھیں کھول دیں اور شرارت سے بولا۔

"بس ٹھنڈک پڑ گئی۔ چاند کو دیکھ کر سب سے پہلے تم کو دیکھنا تھا۔ عید مبارک زوجہ محترمہ۔"

"حد کر دی آپ نے بھی۔ اگر امی یا ابو آ جاتے تو۔" تالیہ نے پریشان ہو کر کہا کہ ابھی مہینہ بھر تو ہوا تھا شادی کو، ساس سسر کیا سوچتے۔

"ما بدولت نے دیکھ لیا تھا امی ابو کو جاتے ہوئے۔" عبید نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ابھی وہ پرانی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ موبائل دوبارہ بج اٹھا۔

"عید آئی ہے تو آج پھر میرے سینے میں
اک خواہش نے بہت زور سے انگڑائی لی
جی میں آیا تو ساتھ ہو اور تنہائی ہو
رت بھیگی سی ہو اور شام جو گہری نیلی
[illegible] سے اٹھ کر تری ٹھوڑی [illegible]
اور دھیرے سے تجھے عید مبارک کہہ دوں"

تالیہ نے عبید کا میسج پڑھا اور دل میں کہا

"ہونہہ جھوٹا۔" اور کچھ دیر سوچنے کے بعد جوابی میسج ٹائپ کرنے لگی۔

تیور موسم کے بہت تیکھے ہیں
چوڑیاں، بندے اور ٹیکے ہیں
اتنا سب کچھ ہے مگر آپ کی چاہت کے بغیر
عید کے رنگ بہت پھیکے ہیں

عبید نے تالیہ کا میسج پڑھا اور بولا

"یہ عورتیں بھی نا اپنی فرمائشیں کسی نہ کسی صورت پہنچا ہی دیتی ہیں۔ مگر کیا کروں عید میں کچھ ہی دن رہ گئے ہیں منانا تو پڑے گا ہی۔" اور میسج لکھنے لگا۔

ہے کتنا دل فریب، دل آویز و دل ربا
ان کا ہر اک لفظ، مگر خاص کر 'نہیں'
وہ بھی میرے وصال میں رہتے ہیں مضطرب
مگر جو اضطراب ادھر ہے ادھر نہیں

"افوہ! کیا کہنے ہیں جناب کے، جو اضطراب ادھر ہے ادھر نہیں۔ کوئی ہم سے پوچھے کہ کیسے دن رات گزر رہے ہیں جناب کے بغیر، یہ نہیں کہ ڈائریکٹ لینے آ جائیں بس واٹس ایپ سے کام چلا رہے ہیں۔ اب کیا لکھوں۔" اور ٹائپ کرنے لگی

کیوں پشیمان ہوں اظہار تمنا کر دیا
میں نے جو موزوں مناسب سمجھا کر دیا

عبید نے شعر پڑھا اور بولا "کیا کہنے ہیں آپ کے، سبحان اللہ، یعنی کوئی غلطی کا احساس ہی نہیں۔" پھر ٹائپنگ کرنی شروع کی۔

ہنس ہنس کے سہے جائیں گے ترے جور و ستم
شکووں سے مگر تم کو پشیمان نہ کریں گے

☆☆☆

ایک ہی گھر میں الگ الگ کمروں میں بیٹھے ایک دوسرے کو میسج کر رہے تھے۔ چھوٹی سی بات پر دونوں کی بات چیت بند تھی ساس سسر بڑے بیٹے کے پاس عید منانے گئے ہوئے تھے اور اب دونوں ہی بے چین تھے مگر آج عبید نے پہل کر ہی دی تھی۔

ہم گئے تھے ان کو منانے کے لیے
وہ خفا اچھے لگے، ہم نے انہیں خفا رہنے دیا

تالیہ نے لکھا تو عبید نے اس کے تصور سے کہا
''تمہاری ایسی کی تیسی۔ خفا اچھا لگا خفا رہنے دیا۔ ابھی بتاتا ہوں۔ بیڈروم میں تو میں ہوں۔ آنا تو بیگم تم کو ہی پڑے گا۔ کب تک ڈرائنگ روم میں بسیرا کرو گی۔''اور ڈائری کے بیچ پلٹ کر کوئی پھڑکتا ہوا شعر ڈھونڈنے لگا۔

نجانے تم نیند کے نشے میں اتنا کیسے ڈوب جاتے ہو
ہم تو کروٹ بھی بدلتے ہیں تو تم یاد آتے ہو۔''

''اچھا۔ جی'' تالیہ نے کہا اور فوراً ہی لکھا۔

ہم ان کے لیے اہم
واہ دل تیرے وہم '

''اے یار کیسے مانیں گی بیگم صاحبہ''

عشق میں اک صرف تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے ، تمہارا ہے

عبید کا یہ شعر پڑھ کر تالیہ ایک دم چونک گئی۔

''یہ شعر کہاں سے دیکھ کر لکھ رہے ہیں۔ اتنا کوئی شوق تو نہیں ہے ان کو شعروشاعری کا۔ اتنی جلدی جلدی نیٹ سے سرچ کررہے ہیں کیا۔ یا کسی دوست سے مشورہ۔''اس نے سوچا''اف! میری ڈائری۔ ہائے اللہ میری شعروں والی ڈائری ہاتھ لگ گئی ہے۔ اب کیا کروں۔''

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک شعر اور آیا اس کی طرف سے۔

اپنا کام ہے صرف محبت ، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے

''غالب، غالب۔ چھوڑوں گی نہیں اگر میری ڈائری کو کچھ ہوا۔'' اس نے خود کلامی کی، اس کے تصور میں ڈائری کے اوپر رکھا چائے کا کپ آیا تو وہ اپنی پسندیدہ ڈائری کا حشر سوچ کر ہی گڑبڑا اٹھی۔''دوستی کرنی ہی پڑے گی عبید صاحب۔'' تالیہ نے جلدی سے لکھا۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

''عبید نے میسج پڑھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔''یس''

ہر شخص اپنے چاند سے تھا محو گفتگو
میں چاند ڈھونڈتا رہا اور عید ہوگئی۔

عبید کا لکھا ایک اور شعر پڑھ کر اس کی بس ہوگئی کون سا جھگڑا کیسا جھگڑا سب بھول بھال گئی۔

''ہائے میری ڈائری۔ بس آرہی ہوں کمرے میں۔'' تالیہ نے بے چینی سے کہا اور جلدی سے ٹائپ کرکے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

''پھولوں کے کاغذ پر
چاند کی روشنائی سے
دل کے قلم نے لکھے ہیں۔
آپ کے لیے صرف دو لفظ
''عید مبارک''

اور کمرے میں داخل ہو کر اس کے پاس آئی اور ڈائری اس کے ہاتھوں سے لے کر بولی

''عورت کے ہاتھ میں مہندی اور مرد کے ہاتھ میں مہندی بھرے ہاتھ اچھے لگتے ہیں۔ بیگم کی ڈائری سے شعر چرانا اچھی بات نہیں۔''

''اور اپنے سرتاج سے ناراض ہو کر اس کو کمرے میں اکیلا چھوڑ دینا بہت اچھی بات ہے۔ ہے نا؟''عبید نے اور پھر پوچھا۔

''تو ناراض کرتا کون ہے؟ایسی باتیں کرتے ہوئے خود بھی کچھ سوچنا چاہیے نا۔'' تالیہ نے ناز سے کہا۔

''اچھا!!!!۔ بھلا کیا کہا تھا میں نے ذرا بتانا تو۔''عبید نے کہا تو تالیہ نے کچھ سوچنے لگی۔

''ویسے کچھ یاد ہے ناراض ہوئی کس بات پر تھیں؟''عبید نے ایک بار پھر چھیڑا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ تالیہ کا سارا دھیان اس کی ڈائری کی طرف ہے۔

تالیہ ایک دم گڑبڑا گئی کیونکہ وہ خود ہی بھول گئی تھی کہ ناراض ہوئی کیوں تھی اور دونوں ہی اس بات پر ہنس پڑے۔

آ بھی جاؤ اب تاب انتظار نہیں
خدا نے تم کو بنایا ہے میرے لیے

عبید نے آخری پڑھا ہوا شعر پڑھا تو تالیہ مسکرا دی۔ اور قریب آکر بولی۔

''عید مبارک''

☆☆

ایمن رضا

تاش گھر

پچھلی قسط کا خلاصہ

باریشہ شام کے وقت ڈاک کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو بارش شروع ہو جاتی ہے۔ وہ واپسی کے لیے ایک گلی میں داخل ہوتی ہے تو ایک لڑکا اس پر پستول تان کر اس کو مارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اتنی دیر میں دوسرا لڑکا آ کر اس کی جان بچاتا ہے جو اپنا نام ضامن بتاتا ہے۔ ضامن سردی کی وجہ سے باریشہ کو اپنی شرٹ پہننے کو دیتا ہے۔ جس میں وہ جان بوجھ کر اپنا وزیٹنگ کارڈ رکھ دیتا ہے اور باریشہ کو اس کے گھر چھوڑ دیتا ہے۔

خیام اپنے گھر میں باریشہ کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے کہ جب اس نے باریشہ پر پستول تانی تھی تو اس کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ اپنا مقصد بھولنے لگا تھا۔

ضامن سو رہا ہوتا ہے تو خیام اٹھ کر اسٹوڈیو میں جاتا ہے اور باریشہ کی تصویر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۹۷۴

بستامی چاند سے کہتا ہے کہ وہ کومل سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

روشن بیگم حویلی آتی ہیں اور چاند سے کہتی ہیں کہ وہ رجائی کو ایمن سے شادی کرنے پر راضی کرے اور اس گھر میں کومل کو مالکانہ حقوق دے۔

تعبیر کمال کے گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ رات بھر چلنے کے بعد بمشکل تمام بس اسٹاپ تک پہنچتی ہے جہاں سے ٹیکسی میں وہ حویلیاں پہنچ سکے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کا انتظار کر رہی ہوتی ہے تو کمال وہاں پہنچ جاتا ہے۔



تیسویں قسط

روشن بیگم سے کہی گئی اپنی بات کے مطابق چاند اب دن بدن خود کو محدود کر رہی تھی۔ تہمینہ پھوپھو نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہ حویلی جس قدر بستامی کی ہے اتنی ہی چاند کی بھی ہے۔ اور کپڑے کے کاروبار کا خیال چاند



کا تھا اور ساری محنت اسی نے کی تھی۔ بستامی اور رجبانی نے تو باہر کے معاملات دیکھے ہیں بس...... وہ بھی اتنی لاپروائی سے کہ دین بابا کی موت کے بعد نقصان ہی نقصان ہوا ہے۔ لیکن چاند نے کہا تھا کہ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ کاروبار میں کس نے کتنی زیادہ محنت کی ہے۔ وہ بنا کسی بدمزگی کے سب کچھ کومل کو سونپ دینا چاہتی تھی۔

چاند کومل کو کچن اور کارخانے کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ اس طرح سے کہ کومل کو یہ سب بوجھ بھی نہ لگے اور وہ سب کچھ آسانی کے ساتھ سنبھال بھی لے۔ کتنے ملازم ہیں، کیسے کام لینا ہے، تنخواہ کا حساب کتاب، منڈی اور کپڑے کا حساب کتاب، ایک جوڑا کتنے دن میں تیار ہو جانا چاہیے۔ ملازموں کے لیے کیا کیا کھانا بنتا ہے۔ کب کب چھٹی دینی ہے۔ اور سال کے اختتام تک کس کس کا حساب کرنا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ گھر کے معاملات...... مہمانوں کی خاطر تواضع، نیاز، پورے سال کا اناج ذخیرہ کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ کومل سب سنتی تھی۔ لیکن کسی بات میں دلچسپی ظاہر نہیں کرتی تھی۔ وہ چاند کی باتیں بے دلی سے سنا کرتی تھی۔ اسے دولت سے تو غرض تھی لیکن اس سب سے نہیں جو چاند اسے بتا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ محنت کر کے کھانا کیا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ساری قیمت اداؤں کی تھی۔ جو اسے اچھی خاصی مل جایا کرتی تھی۔

چاند یہ ہی سمجھے ہوئے تھی کہ کومل کبھی خاندانی گھر میں نہیں رہی ہے اس لیے اب یہ سب سمجھنا اسے مشکل لگ رہا ہے۔ جبکہ درحقیقت چاند کی باتیں سنتے ہوئے کومل چاند کے لیے ترس محسوس کیا کرتی تھی۔ کن الجھنوں میں الجھایا ہوا تھا چاند نے خود کو...... گھرداری، ملازم، کپڑا، کارخانہ...... جبکہ ان کاموں کے لیے آرام سے ایک مینجر رکھا جا سکتا تھا۔ جو خود ہی سب اچھے سے سنبھال سکتا تھا۔ کیا عورت اس لیے بنی ہے کہ اپنی زندگی ان سب کاموں میں برباد کرے۔ چاند کو دیکھ کر اسے الجھن ہوا کرتی تھی۔ جس نے اپنی جوانی اپنے مرچکے منگیتر کی خاطر ضائع کر لی تھی۔ کومل کے نزدیک یہ حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ زندگی کی قیمت کا اندازہ اسے روشن بیگم کو دیکھ کر ہوتا تھا جو بڑی سے بڑی پریشانی کو بھی خود پر اس لیے سوار نہیں کیا کرتی تھیں کہ کہیں ان کا حسن نہ مرجھا جائے۔ اور ایک یہ چاند تھی جس نے حسن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی پژمردہ کر لی تھی۔

کومل کو تو تب بھی شدید حیرت ہوئی تھی جب اس نے لڑکیوں کو سردیوں کے لیے پنیاں اور پنجیری بناتے دیکھ لیا تھا۔ اُف...... جب بازار سے ہر چیز مل جاتی ہے تو کیا ضرورت ہے گھر پر خواری اٹھانے کی۔ اسے تو لڑکیاں اپنے سوتوں پر کڑھائی کرتے، بیل بوٹے بناتے اور اپنے کپڑوں کو رنگ دیتی دوسری ہی دنیا کی مخلوق لگا کرتی تھیں۔ انہی باتوں کا اظہار اس نے ایک روز لڑکیوں سے بھی کیا تھا۔

''ایسے کام لڑکیوں سے ان کی نزاکتیں چھین لیتے ہیں میری جان......'' ایک دن اس نے سب کو پاس بٹھا کر پیار سے کہا تھا۔ کومل میں نجانے کیا بات تھی کہ لڑکیوں کو اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ کومل کی باتوں میں انہیں تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتا تھا۔ جو مدتوں سے حویلی کی بند فضا میں کسی اور طرف سے وارد نہ ہوا تھا۔

''تو پھر لڑکیوں کو کیا کرنا چاہیے۔؟'' روشانے نے پوچھا تھا۔

''صرف اور صرف اپنے حسن پر توجہ دینی چاہیے۔'' کومل نے اتراتے ہوئے کہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کے کنگن بج اٹھتے تھے۔ لڑکیوں نے ایسے کردار بس فلموں میں دیکھے تھے۔ اب جب بنی ٹھنی ہیروئن ان کے سامنے آ بیٹھی تھی تو وہ اس سے متاثر ہوئے بنا کیسے رہ سکتی تھیں۔ لڑکیوں نے ایک دوجے کی طرف دیکھا تھا۔ کومل کی بات نئی تھی۔ ایسی باتیں ان کی ماؤں نے انہیں آج تک نہ کی تھی۔

''گھرداری اچھی بات ہے۔ لیکن جب اللہ نے ہمیں دولت دی ہے کہ ہم ملازم رکھ سکیں جو ہمارے گھر

کو سنبھال سکے تو کیوں نہ سب کام انہی کے سپرد کر دیں۔"
"سب کام ملازم کریں گے تو پھر ہم سارا دن کیا کریں گے؟"
"بھئی خود پر توجہ دو...... اپنے بال دیکھو سب...... کیسے اُجڑے ہوئے لگتے ہیں۔ لباس دیکھو اپنا...... کتنے پرانے فیشن کا ہے۔ ایسے کپڑے تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں اب......" کومل نے کہا تھا۔
لڑکیوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لباس کو دیکھا تھا۔ کومل کی باتیں نجانے کیوں انہیں حرف بہ حرف سچ لگی تھیں۔ دو ایک نے اپنے بالوں کو بھی چھوا تھا۔ کومل کی زلفوں کے آگے تو ان کے بال گھونسلا تھے۔ سالوں سے بنتی آ رہی چٹیا انہیں ایک دم سے ہی بری لگنے لگی تھی۔
"ویسے تم لوگ کپڑے کہاں سے سلواتی ہو۔"
"چاند امی سی دیتی ہیں یا ہماری اپنی امی......"
سارا نے بتایا تو کومل نے کوفت سے گہرا سانس لیا تھا۔
"ایک تو نجانے کیوں تم لوگ چاند پر زبر کرتے ہو۔ بھئی وہ پرانے زمانے کی روح ہے۔ آج کے دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتی ہے......" کومل نے چاند کا مذاق بنایا تو سب کو ہنسی آ گئی۔ "میں یہ نہیں کہہ رہی کہ اپنا جسم دکھاؤ...... لیکن کھلے ڈلے کپڑوں پر بھی جدت لائی جا سکتی ہے۔"
"جی...... دیکھا ہے ہم نے آپ کے کپڑوں پر......"
"میرے کپڑے تو شروع سے ماسٹر جی سیتے ہیں۔"
"ہمارے ہاں ماسٹر سے کپڑے سلوانے کا تصور نہیں......"
"اس لیے تم سب اپنی ماؤں کی بیٹیاں لگنے کے بجائے ان کی بہنیں لگتی ہوں۔" کومل نے کہا تو نجانے کیوں سب کو شرمندگی ہوئی تھی۔ اور نہیں احساس ہوا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ وہ اپنی ماؤں کی بیٹی کم اور بہن زیادہ لگتی ہیں۔ "اگر تم کہوں تو آج کے بعد تمہارے کپڑوں کی سلائی میں کروا دیا کروں گی۔"
"کیا سچ میں کومل آنٹی......" لڑکیاں تو نہال ہی ہو گئی تھی۔ خاص طور پر کرن......
"ہاں کیوں نہیں...... شوق سے...... بس اپنی امیوں کو سمجھانا تمہارا کام ہے۔"
"اس کی آپ فکر مت کریں۔" زارا نے جی داری سے کہا تھا۔
"اور اس حویلی کا ماحول کتنا بورنگ ہے۔ کیا حویلی میں کوئی گیٹ ٹو گیدر نہیں ہوتی......"
"وہ کیا ہوتا ہے۔"
"مطلب لوگوں کا آنا جانا...... ملنا، کھانا پینا...... ہنسی مذاق، شور شرابا......"
"نہیں...... ایسا تو کچھ نہیں ہوتا ہے یہاں پر......"
"لگتا ہے کہ تم سب پاکستان بننے کے پہلے کے ماحول میں جی رہی ہو۔ کیا تمہارا کوئی سوشل سرکل نہیں ہے۔؟"
"سوشل سرکل......" لڑکیوں نے سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔
"تمہاری کوئی سہیلیاں بھی نہیں ہیں کیا......؟"
"ہیں نا...... بہت سی ہیں۔ لیکن گھر پر کم کم ہی آتی ہیں۔"
"تو ان کو بلاؤ...... ہم گھر پر ایک گیٹ ٹو گیدر کا اہتمام کرتے ہیں۔ تم اپنی تمام سہیلیوں کو بلاؤ...... ہم اچھے اچھے کھانے بنوائیں گے۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔ اس شام کے لیے بہترین کپڑے بنوائیں گے۔ کیا خیال ہے۔؟"

"خیال تو اچھا ہے۔لیکن مانے گا کون......"

"اعتراض کون کرے گا۔؟"

"کوئی بھی کرسکتا ہے۔چاند امی......"

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... اب اس حویلی کی مالکن میں ہوں۔چاند نہیں...... یہاں وہی سب کچھ ہوگا جیسا میں چاہوں گی۔بس تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔" کومل نے کہتے ہوئے سب کی طرف دیکھا تھا۔ لڑکیوں نے مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا تھا۔

نادان لڑکیاں نہیں جانتی تھیں کہ جسے وہ تازہ ہوا کا جھونکا سمجھ رہی ہیں وہ انہیں کنوئیں کی دم گھوٹ فضا میں دھکیلنے کے ارادے رکھتی ہے۔

☆☆☆

شام کی اوس میں آنسوؤں کی تراوٹ تھی۔ایسے جیسے آسمان رو رہا ہو۔زمین میں ارتعاش تھا۔جیسے دھرتی سینہ کوبی کررہی ہو۔اور نرم گداز قالین کی بنت میں تعبیر کی آنکھوں سے نکلتے آنسو جذب ہورہے تھے۔ہچکیوں کے باعث قالین کا رواں اس کے نتھوں میں گھس رہا تھا۔اور اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔اس کا سارا جسم کسی زخم کی طرح درد کررہا تھا۔ایسے جیسے کسی نے اسے خاردار تاروں پر ننگے بدن سے گھسیٹا ہو۔شاید گھسیٹ لیتا تو اسے اتنی درد نہ ہوتا...... جتنی اپنی شکست کی ہو رہا تھا۔اس کی کمر سے قطروں کی شکل میں خون رس رہا تھا۔ اور اس کی روح کو گھائل کررہا تھا۔

بس اسٹاپ پر ایک تماچا تعبیر کے منہ پر مارنے کے بعد کمال نے اگلے ہی پل اسے بالوں سے دبوچ لیا تھا۔تعبیر نے ایک آہ بھری تھی۔کمال کے ہاتھ کی گرفت مضبوط نہ بھی ہوتی تو وہ بھاگنے کا تردد نہیں کرسکتی تھی۔اتنی دور بھاگ کر آنے سے وہ خود کو کمال کی دسترس سے بچا نہیں سکی تھی۔اس لیے اب مزید بھاگنا بے کار تھا۔

"یہ سارا علاقہ میرا ہے۔یہ سارے لوگ...... جو چل پھر رہے ہیں۔انہیں میرا ملازم ہی سمجھو۔تم نے کیسے سمجھ لیا کہ تم یہاں سے بھاگ سکتی ہو۔" کمال نے کہا تھا۔اگر وہ نہ بھی کہتا تو اب تعبیر سمجھ گئی تھی کہ اس کے لیے یہاں سے بھاگ جانا ایک خواب کے سوا کچھ نہیں...... ایسا خواب جس کی تعبیر ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔

اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمال دکان سے باہر آیا تھا۔باہر موجود تینوں ٹیکسی ڈرائیور اپنی اپنی ٹیکسیوں سے باہر نکل آئے تھے اور تعبیر کو دیکھنے لگے تھے۔کمال نے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسے اندر پٹخا تھا اور خود اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔

صبح ہو جانے کے باوجود تعبیر کی آنکھوں میں رات اتر آئی تھی۔یہ ایسی بھیانک رات تھی جو مدتوں چلنے والی تھی۔شاید اس کی آخری سانس تک...... وہ ساری محنت جو اس نے اس جنگل سے بھاگ جانے کے لیے کی تھی اس کی تھکن اس پر اب سوار ہوئی تھی۔اس کے پیروں کے چھالے اب درد کرنے لگے تھے۔نوک دار جھاڑیوں کی چبھن کا احساس اسے اب ہوا تھا۔

ٹیکسی کمال کے فارم ہاؤس کے باہر رکی تھی۔بالوں سے پکڑے پکڑے ہی کمال اسے کھینچ کر اندر فارم ہاؤس میں لایا تھا۔اور اسے قالین پر پٹخ دیا تھا۔تعبیر نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔مزاحمت کرنے کے لیے ہمت چاہیے جواب اس کے اندر سالوں نہیں پیدا ہونے والی تھی۔

"حاجرہ...... رقیہ......" کمال نے گرجدار آواز میں دونوں ملازماؤں کو آواز دی تھی۔اگلے ہی پل وہ دونوں کسی جن کی طرح وہاں حاضر ہوئی تھیں۔

"اسے الٹا کرکے اس کے ہاتھ اور پاؤں اس طرح سے پکڑو کہ یہ ہلنے نہ پائے۔" کمال نے حکم دیا

تھا۔ سن کر تعبیر کی اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"کمال! آپ کیا کرنے والے ہیں۔" وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ کانپنے لگی تھی۔

"جو حرکت تم نے کی ہے اس کا سبق سکھانا ضروری ہے۔" کمال نے کہہ کر ملازماؤں کو اشارہ دیا تھا۔ انہوں نے ویسا ہی کیا تھا جیسا کمال نے انہیں کرنے کو کہا تھا۔ تعبیر زور آزمائی کرنے لگی تھی۔

"ایسا مت کریں کمال...... پلیز...... خدا کا واسطہ ہے۔"

وہ چلا رہی تھی۔ ہٹی کٹی ملازماؤں نے اسے سختی سے تھام لیا تھا۔ ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے اور دوسری نے اس کے دونوں پاؤں...... وہ ہل جل کرنے سے قاصر تھی۔ کمال نے اپنی دراز کھول کر اندر سے اپنی ایک چمڑے کی بیلٹ نکالی تھی۔ تعبیر آنکھیں پھاڑے سب دیکھ رہی تھی۔ اگلے ہی پل بیلٹ کی ضرب تعبیر کو اپنی کمر پر محسوس ہوئی تھی۔ شدید ترین درد سے اس نے اتنی بلند چیخ ماری تھی کہ فارم ہاؤس کے درو دیوار دہل کر رہ گئے تھے۔ لیکن کمال پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوا تھا۔ لمحے بھر کا وقفہ ڈالے بنا اس نے پھر سے بیلٹ کا وار کیا تھا۔

"کمال...... خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔" درد میں کراہتے ہوئے وہ رونے لگی تھی۔ لیکن کمال غصے سے پاگل ہو چکا تھا۔

"جب تک میں نہ کہوں۔ اسے چھوڑنا نہیں ہے۔" اس نے ملازمہ سے کہا تھا۔ اور پھر کمال تھا۔ اس کی بیلٹ اور تعبیر کی چیخیں، جو پورے فارم ہاؤس میں گونجتی رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دیں کمال...... مجھے معاف کر دیں......" روتے ہوئے تعبیر نے معافی مانگ لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انا پرست کمال پر معافی کے الفاظ ہی کچھ اثر ڈال سکتے ہیں۔ کمال کے ہاتھ رک گئے تھے۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ دوبارہ ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔"

"دوبارہ ایسی حرکت کی تو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔" کمال نے غراتے ہوئے کہا تھا اور پھر غصے سے بیلٹ اس کے وجود پر پھینکی تھی۔

"دھیان رکھنا اس کا...... کل تک نہ تو یہ پانی پینے پائے اور نہ ہی کچھ کھا سکے۔" اس نے ملازماؤں کو ہدایت دی تھی۔ اور خود وہاں سے باہر چلا گیا تھا۔ ملازمہ نے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے چلی گئی تھیں۔ تعبیر پیٹ کے بل قالین پر ہی لیٹی رہی تھی۔ وہ جو کب سے رو رہی تھی۔ ایک بار پھر سے رونا شروع ہو گئی تھی۔ شام کی اوس میں آنسوؤں کی تراوٹ تھی۔ ایسے جیسے آسمان رو رہا ہو۔ زمین میں ارتعاش تھا۔ جیسے دھرتی سینہ کوبی کر رہی ہو۔ اور نرم گداز قالین کی بنت میں تعبیر کی آنکھوں سے نکلتے آنسو جذب ہو رہے تھے۔

☆☆☆

چاند پچھلے کافی دنوں سے پریشان تھی۔ کہنے کو تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن محسوس کرنے کو بہت کچھ تھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ کومل تھی۔ جس نے ساری لڑکیوں کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ لڑکیاں سارا سارا دن کومل کے کمرے میں گھس کر میک اپ کرتی رہتی تھیں۔ اس کے کپڑے دیکھتی رہتی تھیں۔ نجانے کس کس طرح کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ بستامی نے وی سی آر لا دیا تھا۔ جس پر روز ایک نئی فلم دیکھنا لڑکیوں کا معمول بن گیا تھا۔ چاند کو سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کس بات پر اعتراض کرے۔ لڑکیوں کو کومل سے کس حوالے سے میل جول بڑھانے سے منع کرے۔ اگر کوئی لڑکی منہ بھر کر یہ کہہ دیتی کہ وہ خود ہی تو کومل کو بیاہ کر اس گھر میں لائی ہیں تو کیا جواب تھا اس کے پاس دینے کے لیے...... اس ساری صورت حال پر تہمینہ، شکیلہ اور زہرہ پھوپھو بھی تشویش کا شکار تھیں لیکن وہ بھی چاند کی طرح کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

پھر ایک دن تو چاند حیران رہ گئی تھی۔ جب اس نے لڑکیوں کو کومل کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' وہ غصہ ہونے سے زیادہ حیران تھی۔
''کیا ہوا ہے چاند...... بس کھیل ہی تو کھیل رہے ہیں۔ تم تو ایسے حیران ہو رہی ہو جیسے ہم سب کوئی جواء کھیل رہی ہوں۔'' کومل نے کہا تھا اور سب لڑکیاں کومل کی بات پر ہنسنے لگی تھیں۔ چاند شرمندہ ہو گئی تھی۔ لڑکیاں اب ڈھکے چھپے انداز میں کہنے لگی تھیں کہ انہیں کچھ آزادی چاہیے۔ اس ساری صورت حال نے چاند کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب جلد سے جلد لڑکیوں کی شادیاں ہو جائے۔
آج کل گھر میں کسی پارٹی کی تیاری ہو رہی تھیں۔ لڑکیوں نے کہا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو حویلی مدعو کرنا چاہتی ہیں۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری صورت حال عجیب تر ہوتی چلی گئی تھی۔ لڑکیاں نیا لباس بنوا رہی تھیں اور اس کام کے لیے کومل کے ساتھ ایبٹ آباد کے بازار جانا کا ارادہ رکھتی تھیں۔ اس سے پہلے آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ لڑکیوں نے اپنا لباس اپنی ماں کی پسند سے لیا تھا یا چاند نے جو بنا دیا وہ پہن لیا تھا۔ لیکن اس بار سب کا بیان مشترکہ تھا۔
''آپ کی چوائس بہت اولڈ ہو چکی ہے چاند امی...... ہم کچھ نیا لینا چاہتی ہیں۔ پھر ویسے بھی اڈے کے کام والے سوٹ پہن پہن کر تھک چکی ہیں۔ کومل آنٹی نے کہا ہے کہ وہ ایبٹ آباد سے ایسے جوڑے لے کر دیں گی کہ حویلیاں والوں نے آج تک ویسے نہیں دیکھے ہوں گے۔'' لڑکیوں نے سادہ سے انداز میں اپنا موقف دیا تھا۔ بات کچھ خاص نہیں تھی۔ لیکن چاند کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ایسے جیسے اس سے اس کی کوئی خاص چیز کوئی چھین رہا ہو۔ ایسی تربیت تو نہیں ہوئی تھی لڑکیوں کی کہ وہ کسی کو جلانے کے لیے بناؤ سنگار کریں۔
لڑکیاں کومل کے ساتھ ایبٹ آباد کا پر پنڈی کے بڑے بازار چلی گئی تھیں۔ انہوں نے کومل کی پسند سے خریداری کی تھی اور کومل کے ماسٹر درزی سے ہی سوٹ سلوائے تھے۔ ماسٹر جی حویلی آ کر لڑکیوں ناپ لے گئے تھے۔ اور کومل نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ناپ کو نوٹ کر لیں۔ اب لڑکیوں کے کپڑے انہی کے پاس سے سلا کریں گے۔
پارٹی سے ایک دو روز پہلے چاند نے پوچھا تھا کہ کھانا کیا بنوانا ہے۔ جس پر لڑکیوں نے کچھ ایسی چیزوں کے نام لیے تھے جو چاند کے لیے نئی تھیں۔
''یہ سب بنائے گا کون......؟ کچن کے ملازم تو شاید نہ بنا سکے۔''
''میرے گھر سے باورچی آئے گا۔ وہ بنا دے گا۔'' کومل نے کہا تھا۔ چاند اس کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔
''تم گھر کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کر رہی ہو کومل......''
''میں گھر کے معاملات کو درست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں یہاں کی باسی فضا کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''
''لیکن اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔''
''تمہاری بات کون کر رہا ہے چاند...... تم تو شاید پیدا ہی بڑھاپا لے کر ہوئی تھی۔ میں لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں۔ دیکھ نہیں رہی کہ وہ میرے ساتھ کس قدر خوش رہتی ہیں۔ تم ہر وقت لڑکیوں کے اعصاب پر سوار رہنا بند کر دو چاند...... تم انہیں اپنے جیسے بنانا چاہ رہی ہو۔ انہیں وہ کرنے دو جو وہ کرنا چاہتی ہیں۔''
''میں نے انہیں کچھ کرنے سے روکا نہیں ہے۔''
''تم ان کی عمر کی نہیں ہو۔ ان کے مشاغل الگ ہیں۔ تم چاہتی ہو کہ وہ بڑے بوڑھوں کی طرح زندگی گزاریں۔''
''ایسا ہرگز ایسا ہے۔''

"پھران کے معاملات میں تم مداخلت کرنا بند کردو۔"

چاند چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ وہ کومل سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جانتی تھی کہ پانی اب پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ کومل کی باتوں میں کہیں نہ کہیں لڑکیاں ہی بول رہی تھیں۔ چاند کا اُلجھنا بیکار تھا۔

☆☆☆

۱۹۷۵ء

سردیاں پوری طرح سے رخصت ہو چکی تھیں اور بہار اپنے جوبن پر تھی۔ درختوں پودوں کے پرانے پتے جھڑ چکے تھے اور اب ان کے اوپر خوش نما رنگ پتے، تازہ بھور اور پھولوں کی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ٹھنڈیانی چونکہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلوں کی شروعات کہلاتا ہے۔ اس لیے وہاں سردیاں بس دن میں ہی ختم ہوتی ہیں۔ بے شمار درختوں کی وجہ سے راتیں سردیوں کی راتوں کی طرح ہی ٹھنڈی محسوس ہوتی ہیں۔

بہار کے ابھی جوبن کے دنوں میں صندل کے گھر ایک پیاری سی بیٹی نے جنم لیا تھا۔ علاقے کے دایہ کے ہاتھوں بچی کی پیدائش ہوئی تھی اور سب کچھ بنا کسی پیچیدگی کے آرام دہ طریقے سے ہو گیا تھا۔ جبکہ زچگی سے پہلے تک صندل بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ اپنے گرد میر زاد کے علاوہ چاند امی کا ساتھ بھی چاہتی تھی۔ لیکن چاند امی کا وہاں موجود ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ صندل کو پہلی بار اتنے عرصے کے بعد چاند امی کی کمی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ بچی کی پیدائش کے قریب کے دنوں میں وہ میر زاد سے چھپ کر بے آواز روتی رہی تھی۔ ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایسے وقت میں صبر کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے صبر سے کام لیتے ہوئے اس وقت کو برداشت کیا تھا۔ علاقے کی دایہ اور اس کی بہو نے اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایک عورت کے لیے یہ سب کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے جب اس کا کوئی اپنا اس کے پاس نہ ہو۔

میر زاد کمرے سے باہر صحن میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جب دایہ اس کے پاس آئی تھی۔

"مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔" دایہ نے اسے بتایا تھا اور بے پناہ خوشی اس کے چہرے پر جھلکنے لگی تھی۔

"صندل کیسی ہے۔؟"

"وہ ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تم اس سے مل سکتے ہو۔"

دایہ کہہ کر پھر سے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور یہ تھوڑا سا وقت میر زاد کے لیے بہت طویل ثابت ہوا تھا۔ دایہ اور اس کی بہو اپنے پیسے لے کر چلی گئیں تو وہ کمرے میں گیا تھا۔ صندل بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور میر زاد کو دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے پہلے صندل کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا تھا اور پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یہ تو بالکل تم جیسی ہے۔" میر زاد نے کہا تھا۔ صندل مسکرائی تھی۔

"اتنی جلدی کیسے کہہ سکتے ہو تم...... ابھی تو بچی بہت شکلیں بدلے گی۔"

"پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ بالکل تمہارے جیسی ہو۔ میں اپنی زندگی میں دو صندل چاہتا ہوں۔" میر زاد نے پیار سے کہا تھا۔ دو آنسو صندل کی آنکھوں سے جاری ہو گئے تھے۔

"تم رو کیوں رہی ہو۔"

"یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

میر زاد نے پیار سے اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم خوشی میں بھی آنسو بہاؤ...... " اس نے توقف کیا تھا۔ پھر کچھ یاد آنے پر کہا تھا۔ "ہم

اس کا کیا نام رکھیں گے۔؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اس کا نام چاندامی رکھیں۔ اگر تم اجازت دے دو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے......" میرزاد نے کہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اٹھا تھا۔"میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ دائی نے کہا تھا کہ تمہیں یخنی پلا دوں۔"

"کیا تم بنا لو گے۔"

"اتنا بھی پھوہڑ نہیں ہوں میں......" کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

صندل بے تاثر چہرہ لیے چھت کو دیکھنے لگی تھی۔ نجانے کیوں اسے اپنی پیدائش کا وقت یاد آ گیا تھا۔ اسے تب ہوش تو نہیں تھی لیکن وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کی پیدائش کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ گھر کا کوئی فرد بھی خوش نہیں ہوا ہوگا۔ شاید وہ لوگ بیٹا چاہتے ہوں گے۔ تب ہی تو بیٹی کو انہوں نے ایک غیر ضروری چیز سمجھ کر کسی کی دہلیز پر چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ اپنے لخت جگر کے تو پرانے کپڑے بھی انسان کا باہر پھینکنے کو دل نہیں کرتا ہے۔

"تمہارے نصیب مجھ جیسے نہیں ہوں گے میری بچی...... تمہارے اردگرد ہمیشہ پیار کرنے والے لوگ موجود رہیں گے۔" اپنی بچی کو پیار سے دیکھتے ہوئے صندل نے خود کلامی کی تھی۔

آنے والے چند دن تو صندل کمزوری کی وجہ سے بیڈ پر سے اُٹھ نہیں سکی تھی۔ اس دوران میرزاد ہی اس کے سارے کام کرتا رہا تھا۔ ملازمہ ہونے کے باوجود گھر کو اسے سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ چند دن بند رہا تھا۔ اگرچہ وہاں کا سب کام ملازم ہی سنبھالتے تھے لیکن پھر بھی میرزاد چاہتا تھا کہ وہ یہ سارا وقت صندل کو اور اپنی بچی کو دے۔ بچی کی صورت میں دونوں کو جیسے ایک نیا کھلونا مل گیا تھا۔ دونوں ہر وقت اس کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بچی ابھی سے ان کے ساتھ بات کرنے لگے۔ ان کے سوالوں کے جواب دینے لگے۔ صندل کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے پہلی فرصت میں چاندامی کو خط لکھا تھا۔

"پیاری چاندامی!

اُمید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ یہ خط آپ کے لیے سب سے زیادہ اہم ہونے والا ہے۔ کیونکہ اس میں آپ کو آپ کے نانی بن جانے کی خوشخبری موجود ہے۔ اور جیسا کہ آپ دعا کر رہی تھیں کہ میرے گھر پیاری سی بیٹی جنم لے۔ جو ہو بہو میرے جیسی ہو تو میں آپ کو بتا دوں کہ خدا نے آپ کی دعاؤں کو قبول کر لیا ہے۔ پچھلے ہفتے جولائی کے شروع میں ہمارے گھر ایک پیاری سی بچی نے جنم لیا ہے۔ یوں ہمارے گھر اس سال دو بہاریں اُتری ہیں۔ اور آپ کو بتا دوں کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں...... کسی طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ میرزاد کے ساتھ اور آپ کی دعاؤں کی وجہ سارا مرحلہ خیر و خیریت سے ہو گیا۔ اور میں نے اس دوران آپ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا۔

میں اور میرزاد بچی کے لیے خود سے کوئی نام تجویز کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے چاہتے ہیں کہ آپ ہماری بیٹی کے لیے کوئی اچھا سا نام تجویز کریں۔ دوسرا میں چاہتی ہوں کہ میری بچی کا نام اس کی نانی کے توسط سے رکھا جائے۔ جس کی وجہ سے وہ سب کو بتا سکے کہ اس کا پیارا سا نام اس کی نانی نے رکھا ہے۔ آپ خط میں کوئی پیارا سا نام لکھ کر ضرور بھیجیے گا۔

اور میرزاد بتا رہا تھا کہ اب جگہ جگہ فون کی سہولت بہت عام ہو چکی ہے۔ ٹھنڈیانی میں بھی تاریں بچھانے کا کام کیا جا رہا ہے۔ جلد ہی ہم بھی اپنے گھر میں فون لگوا لیں گے۔ پھر آپ سے فون پر بات ہو جایا کرے گی۔ آپ ارشادی بابا کے پاس جا کر مجھے فون کر سکیں گی۔ بہت دن ہو گئے ہماری بات چیت نہیں ہو سکی۔ کان آپ کی آواز سننے کو ترس چکے ہیں۔

میں اور میرزاد کراچی جانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ میرزاد عرصے سے اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ہم بچے کی ولادت کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی چلہ کے دن مکمل ہو جائیں گے ہم کراچی چلے جائیں گے۔ دعا کیجیے گا کہ زویا آپی مان جائیں اور میرزاد کو معاف کر دیں۔ میران کو بہت یاد کرتا ہے اور ان کو یاد کرتے ہوئے اُداس رہتا ہے۔ میری تو خط کے ذریعے آپ سے بات ہو جاتی ہے۔ لیکن میران کو یادوں میں سوچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ زویا آپی مان جائیں گی تو وہ بہتر محسوس کرے گا۔

آپ کے جوابی خط کا انتظار رہے گا۔ جلد سے جلد نام تجویز کر کے بھیجے گا۔

آپ کی پیاری بیٹی صندل۔

صندل نے پیار سے خط کو فولڈ کیا تھا اور پھر ملازم کو دے دیا تھا کہ وہ اسے ارشادی بابا کو پوسٹ کر دے۔

وہ دن اپنے اندر ہر طرح کا اطمینان لے کر دھرتی پر اتر رہے تھے۔ ایسے جیسے کہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ ہو۔ میرزاد کے ساتھ مل کر وہ کراچی جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ میرزاد کراچی جانے کے حوالے سے کافی پرجوش تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے ہی ٹرین کی ٹکٹ لے آیا تھا۔ صندل دل ہی دل میں اس کے لیے بہت سی دعائیں کر رہی تھی کہ کراچی جا کر میرزاد کو مایوسی نہ ہو۔ کراچی روانگی سے دو دن پہلے صندل کو چاند امی کا خط ملا تھا۔

"جان سے بھی زیادہ عزیز بیٹی!

میں نے تمہارے اس خط کا بہت بے صبری سے انتظار کیا ہے۔ میں روز حاجی بوا سے کہتی تھی کہ وہ ارشادی بابا کے پاس جائیں اور ان سے پوچھیں کہ صندل کا کوئی خط آیا یا نہیں...... مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ کیونکہ میرے حساب سے یہ دن بچے کی ولادت کے دن تھے۔ تم نے خط نہیں لکھا تو مجھے فکر ہونے لگی۔ اور اب یہ جان کر کہ تم خیر خیریت سے ہو میں مطمئن ہو چکی ہوں۔

میں نانی بن چکی ہوں۔ اس خبر کو سن لینے کے بعد میں جیسے پھر سے جوان ہو چکی ہوں۔ اور تمہارے گھر ایک بچی نے جنم لیا ہے اس بات کی خوشی سب سے بڑھ کر ہے۔ کاش میں اس وقت تمہارے پاس ہوتی۔ لیکن اب جلد ہی ملاقات ہو جائے گی۔ کیسے ہو گی وہ میں تمہیں اگلے خط میں بتاؤں گی۔ تم اس حویلی میں واپس آ جاؤ گی۔ بہت جلد ان شاءاللہ......

بچی کو لے کر میرے ذہن میں باریشہ نام ہے۔ میں جب دہلی میں تھی تو وہاں میری سہیلی ہوا کرتی تھی۔ اس کا نام باریشہ تھا۔ تم نے بچی کے نام کے بارے میں کہا تو نجانے کیوں مجھے میری وہی سہیلی یاد آ گئی۔ باریشہ کا مطلب خالص ہوتا ہے۔ دعا کرتی ہوں کہ یہ بچی تمہاری زندگی میں خالص خوشیاں لے کر آئے گی۔ اُمید کرتی ہوں کہ تم دونوں کو یہ نام پسند آئے گا۔

میرزاد کے حوالے سے دعا کروں گی کہ اس کے مسئلے جلد حل ہو جائیں۔ زویا اسے معاف کر دے اور تم سب کو قبول کر لے۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ اب ساری پریشانیاں ختم ہونے والی ہیں۔ ساری مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ ہم سب پھر سے ملیں گے اور خوب باتیں کریں گے۔ تم لوگ کراچی سے ہو کر آ جاؤ تو پھر مجھے خط لکھنا۔ میں تمہارے خط کا انتظار کروں گی۔

تمہاری چاند امی۔"

صندل نے خط کو پڑھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ ایسے جیسے خود چاند امی کے سینے سے لگی ہوئی ہو۔ وہ خط میں سے چاند امی کے وجود کی خوشبو کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ایسا کرتے ہوئے دو آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے جاری ہو چکے تھے۔ جسے اس نے جلدی سے صاف کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میرزاد ان

آنسوؤں کو دیکھے۔

الماری کھول کر اس نے اندر سے ایک لکڑی کا باکس نکالا تھا۔ جو سارا کا سارا چاندامی کے خطوط سے ہی بھرا ہوا تھا۔ اس نئے خط کو بھی اس نے اس باکس میں رکھ دیا تھا۔ پھر چھوٹا سا تالا لگا کر الماری میں واپس رکھ دیا تھا۔ چاندامی کے یہ خطوط اس کے لیے ہر طرح کے خزانے سے زیادہ اہم تھے۔

☆☆☆

بستامی کے توسط سے شکیلہ پھوپھو کی بڑی بیٹی سارا کا رشتہ آیا تھا۔ چاند نے اس بار ساری ذمہ داری خود لی تھی۔ اس نے بستامی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی تسلی کرے گی پھر رشتے کو منظوری دے گی۔ وہ سارا کو نہ تو تعبیر کی طرح دور بیاہنا چاہتی تھی۔ اور نہ افشیں کی طرح کسی بوڑھے کے ساتھ باندھنا چاہتی تھی۔ بستامی نے کہہ دیا تھا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں۔ چاند ہر طرح سے اپنی تسلی کر سکتی ہے۔

جو کوائف بستامی نے دیے تھے اس پر تو چاند مطمئن تھی اور شکیلہ پھوپھو بھی...... لڑکا بھی پڑھا لکھا اور خوب صورت تھا۔ خوش حال گھرانہ تھا۔ اس لیے جمعے کے مبارک دن ان کو گھر پر بلا لیا گیا تھا۔

مہمانوں کی نشست کے لیے بہترین انتظام کیا گیا تھا اور کھانے پینے کے لیے بھی...... لڑکے والوں کی طرف سے چار افراد آئے تھے۔ دو خواتین اور دو مرد...... ان کا آپس میں کیا تعلق تھا یہ دو بار پوچھنے پر بھی چاند کو سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر سارا کو ان کے آگے کر دیا گیا۔ شکیلہ پھوپھو تو پہلے سے ہی سارا کے معاملے میں بہت فکر مند تھیں۔ چاند نہیں چاہتی تھی کہ وہ بے معنی مین میکھ نکال کر اس رشتے کو ہاتھ سے جانے دے۔

سارا انہیں دیکھتے ہی پسند آ گئی تھی اور وہ اسی وقت سارا کے ہاتھ پر پیسے رکھ دینا چاہتے تھے لیکن چاند نے منع کر دیا تھا۔ وہ ابھی مزید لڑکے والوں کے بارے میں چھان بین کرنا چاہتی تھی۔

سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا، لیکن پھر ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ مہمانوں کے جانے سے تھوڑی دیر پہلے کومل وہاں آ گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کے چاند مہمانوں سے کومل کا تعارف کرواتی، مہمان خود ہی اُٹھ کر کومل سے ملنے لگے تھے اور اس کا حال احوال دریافت کرنے لگے تھے۔ مہمانوں کا رویہ کومل کے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ اسے اچھے سے جانتے ہوں۔ اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب چاند کے چھٹی حس نے الارم بجایا تھا۔ اور یہ وہ لمحہ بھی تھا جب بستامی کا سارا کے لیے بچھایا جال الجھنے لگا تھا۔

''آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے اب...... کیا ان کی آنکھوں کو شفا ملی۔'' ملنے ملانے کے بعد بیٹھتے ہوئے کومل نے مہمان خاتون سے پوچھا تھا۔

''جی...... اب بہتر ہے۔ روشن بیگم نے جس خانقاہ کا بتایا تھا وہاں جانا فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔'' مہمان خاتون نے جواب دیا تھا۔ چاند نے دونوں کو اچنبھے سے دیکھا تھا۔ روشن بیگم کے نام پر شک میں مبتلا چاند کو یقین ہو گیا تھا کہ کومل ان لوگوں کو پہلے سے بہت اچھے سے جانتی ہے اور وہ لوگ نہ صرف کومل کو جانتے ہیں بلکہ روشن بیگم سے بھی شناسا ہیں۔

''آپ روشن بیگم کو کیسے جانتی ہیں۔؟'' چاند نے پوچھا تھا۔

خاتون نے کومل کی طرف دیکھا تھا۔ کومل گڑبڑا گئی تھی۔ خاتون سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔

''کیسے جانتی ہیں آپ روشن بیگم کو......؟'' چاند نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔

''بستامی سے ان کا ذکر سنا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کی مشکل انہیں بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا تھا۔'' خاتون نے وضاحت دی تھی۔ جس پر چاند کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لمحے ہی لمحے میں ان کا ذہن نجانے کہاں سے کہاں چلا گیا تھا۔ افشیں کی بڑی عمر کے مرد سے شادی، پارلر پر صندل کا رشتہ آنا، پھر وہاں تعبیر

کی شادی کا ہو جانا...... اور اب سارا کے لیے رشتہ...... ایک ایسا گھرانہ جو روشن بیگم سے رابطے میں تھا۔ یہ سب ہو کیا رہا تھا حویلی میں...... اسے دال میں کچھ کالا لگا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ بستامی بے جوڑ اور بے توقیر رشتے لا کر گھر کی لڑکیوں کی شادیاں کرتے ہوئے لڑکے والوں سے نذرانے وصول کر رہا تھا۔ یہ ایسی بات تھی جنہوں نے اس کا ذہن چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بستامی کے اصل کرتوت جان جاتی تو شاید بیٹھے بیٹھے ہی بے ہوش ہو جاتی...... وہ جسے نذرانے خیال کیے ہوئے تھی وہ تو لڑکیوں کی قیمت تھی اور سارا بھی اب ایسی ہی قیمت کے بدلے فروخت ہونے جا رہی تھی۔

غصے سے چاند فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"معذرت چاہتی ہوں۔ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" اس نے ایک لمحہ بھی سوچے بنا کہہ دیا تھا۔ لڑکے والے اس کی شکل دیکھنے لگے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟" کومل نے مداخلت کی تھی۔

"تمہارا گھر کی لڑکیوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے کومل...... یہ فیصلہ کرنے کو گھر کے بڑے ابھی زندہ ہیں۔ تم اپنے کمرے میں جا سکتی ہو......" چاند نے کومل سے کہا تھا اور پھر لڑکے والوں سے مخاطب ہوئی تھی۔ "آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ ہم روشن بیگم کے جاننے والوں سے رشتے داری نہیں کر سکتے۔" چاند کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ وہ حویلی میں مزید کوئی بے جوڑ رشتہ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

اس شام حویلی میں ایک طوفان آیا تھا۔ بستامی اتنے غصے سے چاند پر بولا تھا کہ سب اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔

"تم کون ہوتی ہو چاند، حویلیاں کی لڑکیوں کی زندگی کا فیصلہ کرنے والی......" وہ دھاڑا تھا۔

"میں بھی اسی گھر کا ایک فرد ہوں بستامی...... شاید تم بھول رہے ہو۔"

"تم سے تو اپنی زندگی کا فیصلہ بہتر نہیں ہو سکا۔ کہاں تم حویلی کی لڑکیوں کی زندگیوں کے فیصلے بہتر کرو گی۔"

"جو بھی ہے۔ سارا کی شادی ایسی جگہ نہیں ہوگی جو روشن بیگم کے مداح ہوں۔"

"تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خاندانی لوگ ہیں۔"

"خاندانی لوگ ایسی جگہوں پر نہیں جایا کرتے۔"

"پھر تم میرے بارے میں کیا کہو گی۔ اپنے بھائی کے بارے میں...... کیا میں خاندانی نہیں ہوں۔" بستامی نے پوچھا تھا۔ چاند سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ "بولو جواب دو......"

"تمہارے معاملے میں میں بے بس تھی۔ ورنہ یقیناً تمہیں سدھارنے کی کوشش کرتی......"

"جیسے دین بابا تمہارے معاملے میں بے بس تھے......" اس نے طنز کیا تھا۔ "تم شاید بھول رہی ہو کہ بابا کی موت کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہارے رجحان سے عین شادی والے دن انکار نے بابا کی جان لے لی تھی۔"

چاند گڑبڑا گئی تھی اور زمین کو گھورنے لگی تھی۔

"جیسے تم صندل کے معاملے میں بے بس تھیں۔ ایک ناجائز خون جس نے حویلی کی شان کو مٹی میں ملا دیا اور گھر سے بھاگ گئی۔"

"کون کس چیز کا ذمہ دار ہے اس بات کا فیصلہ وقت کرے گا۔ فی الحال جو بات ہو رہی ہے تم اس پر رہو۔ سارا کے لیے جو رشتہ لائے تھے میں اسے انکار کر چکی ہوں۔ اور تم مزید کوئی رشتہ گھر کی کسی لڑکی کے لیے نہیں لاؤ گے۔ ان کی مائیں ابھی زندہ ہیں اور میں بھی...... تم فکر مت کرو۔"

"یہ حویلی میری باپ کی ہے۔ یہاں کے فیصلے میری مرضی سے ہوں گے۔"

''تمہیں اس بات پر ناز ہے نا کہ پھوپھو اور ان کی بیٹیوں نے تمہارا کھایا ہے۔ تمہارے گھر میں رہی ہیں۔ تو ٹھیک ہے۔ ابھی حساب کر لیتے ہیں۔ تم بتا دو کہ تمہارا کیا خرچا آیا ہے۔ میں سارا حساب کتاب بے باک کروں گی۔ اور آج سے پھوپھو اور ان کی ساری بیٹیوں کا خرچا میرے ذمے ہوگا۔ ان کا سارا خرچ میں اٹھاؤں گی۔ رہی حویلی کی بات...... تو اس کے درمیان میں دیواریں کر لو۔ تم الگ رہو اور ہم سب الگ...... یقیناً اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ حویلی میں میرا بھی حصہ ہے۔ لیکن سارا کی شادی وہاں نہیں ہوگی جہاں تم کہہ رہے ہو۔ بلکہ اب حویلی کی کسی لڑکی کی شادی وہاں نہیں ہوگی جہاں تم کہو گے۔ تم اپنا خاندان بناؤ اور جہاں دل کرے اپنی اولاد کی شادیاں کرنا...... میں تم سے نہیں پوچھوں گی۔''

چاند نے دوٹوک کہتے ہوئے ساری بات ختم کی تھی۔ تینوں پھوپھو نے فخر سے چاند کو دیکھا تھا۔ یہ تھا ان کے بھائی کا خون...... دین کا خون...... جو ان کے حق کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

''کل مزدور بلا کر حویلی کے درمیان میں دیوار اٹھا دینا...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

اگست کی تیز دھوپ نے زمین پر اپنے پنجے گاڑھے ہوئے تھے۔ دور دور تک پھیلے کھیت دھوپ میں نہائے ہوئے سورج کی روشنی کو مزید بڑھاوا دے رہے تھے۔ صندل ایک عرصے کے بعد اتنی شدید گرمی دیکھ رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ ٹرین کے سفر نے ویسے بھی دونوں کو تھکا دیا تھا۔ باریشہ تو صندل کی گود میں سوتی رہی تھی۔ لیکن حویلیاں سے کراچی تک کے طویل سفر میں صندل اور میر زاد کو لمحے بھر کے لیے بھی نیند نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ شاید ایک نامحسوس بے چینی تھی یا شاید اضطراب...... جو بھی تھا دونوں کے لیے وہ طویل سفر بہت زیادہ تھکن کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔

صندل نے میر زاد کو دیکھا تھا۔ جو بہن سے ملنے کے خیال سے خوش تو تھا، لیکن شاید ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے جن میں پریشانی نمایاں تھی۔ نجانے زویا کس طرح کا ری ایکشن دے۔ ہوسکتا ہے زوہیب بھائی اسے معاف ہی نہ کریں۔ گھر میں ہی داخل نہ ہونے دیں۔ ان کو میر زاد اپنی بہن سے زیادہ تو عزیز نہیں ہوسکتا نا......

''کیا سوچ رہے ہو میر......'' صندل نے پیار سے میر زاد سے پوچھا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔'' میر زاد نے کہا تھا۔ صندل نے پیار سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

''پریشان مت ہو۔ وہ غصہ ہوں گی۔ تم پر بولیں گی۔ برا بھلا کہیں گی۔ لیکن پھر تمہیں گلے سے بھی لگا لیں گی۔''

''مجھے ان کے غصے کی یا برا بھلا کہنے کی پروا نہیں ہے۔''

''تو پھر......''

''ڈر ہے کہ وہ مجھے نفرت سے دھتکار نہ دیں۔ میرے لیے اپنے گھر کا بند دروازہ ہی نہ کھولیں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔''

''تمہاری والدہ بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔ زویا آپی نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے۔ اور ایک ماں اپنی اولاد سے کیسے اتنی دیر ناراض رہ سکتی ہے۔ دیکھنا وہ تو تم پر غصہ ہوں گی کہ تم اتنے عرصے کے بعد کیوں آئے ہو۔''

"دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔"

"فکرمت کرو۔ سب اچھا ہوگا۔" صندل نے اسے تسلی دی تھی۔ یہ تسلی کھوکھلی ہرگز نہیں تھی۔ اندر ہی اندر صندل کو سوفیصد یقین تھا کہ زویا اپنے بھائی کو دیکھتے ہی گلے سے لگا لے گی۔

بالآخر کھیت در کھیت کا سلسلہ تھم گیا تھا۔ اور آبادی نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ ٹرین شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اور اس کی رفتار بھی سست ہو چکی تھی۔ اسٹیشن تک پہنچنے میں اس نے مزید بہت سا وقت لیا تھا۔

دونوں نے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی لی تھی۔ اور میرزاد کے گھر جانے کے لیے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ سارا سفر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا تھا اور صندل کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رہا تھا۔ پھر بھی شاید میرزاد کی گھبراہٹ کم نہیں ہوئی تھی۔ صندل کے مخاطب کرنے پر وہ پریشانی میں مسکراتے ہوئے صندل کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ ورنہ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر ہی دیکھتا رہا تھا۔

پھر ٹیکسی ایک بڑے سے گھر کے سامنے رکی تھی۔ یہ زوہیب کا گھر تھا۔ میرزاد کا خیال تھا کہ زویا اپنے سسرال میں ہی ہوگی۔ آبائی گھر تو یقیناً بند ہی ہوگا۔ باریشہ کو گود میں اٹھائے ہوئے صندل ٹیکسی سے باہر نکلی تھی۔ ڈرائیور کو پیسے دے کر میرزاد بھی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"ڈور بیل بجاؤ میر......" صندل نے کہا تھا۔ میرزاد نے ہمت کرتے ہوئے ڈور بیل بجادی تھی۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر آنا اسے بہت پریشان کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی باہر آیا تھا۔ میرزاد اس آدمی کو نہیں جانتا تھا۔

"جی...... کس سے ملنا ہے۔؟"

"زویا آپی سے...... زوہیب بھائی سے......"

"وہ لوگ تو اب ادھر نہیں رہتے۔"

"تو کہاں رہتے ہیں۔؟"

"وہ سب تو لندن شفٹ ہو چکے ہیں......" آدمی نے کہا تھا اور کراچی کی زمین میرزاد کے پیروں کے نیچے کانپنے لگی تھی۔ "یہ گھر ان سے ہم نے خرید لیا ہے۔ کیا آپ میرزاد ہیں۔؟" آدمی نے پوچھا تھا۔

"جی......" میرزاد کے بجائے صندل نے جواب دیا تھا۔ کیونکہ میرزاد تو لندن شفٹ ہو جانے والی بات سن کر بت ہی بن چکا تھا۔

"ایک منٹ ٹھہریں۔" آدمی اندر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔ غالباً آپ کی بہن نے دیا تھا کہ جب بھی آپ آئیں تو یہ آپ کو دے دوں۔"

میرزاد نے آدمی سے خط لے کر کھولا تھا۔ اور اسے پڑھا تھا۔ مختصر خط میں دل کو چیر دینے والی عبارت درج تھی۔

"تم جانتے ہو میر کہ میری طبیعت میں انا پرستی اور کینہ پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لوگوں کی باتیں بھول جانا میرے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے انہیں معاف کرنا بھی میرے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ تمہیں بھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس خط کو ہماری آخری بات چیت سمجھنا۔ اور دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔"

اور اگر میرزاد مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو یقیناً بے ہوش ہو کر زمین پر گر چکا ہوتا۔

☆☆☆

خالی کمرے میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے رحبانی خالی نظروں سے سامنے کی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں مینا کماری کی تصویر والا قالین ٹنگا ہوا تھا۔ مینا کماری کے عکس میں اسے چاند نظر آ رہی تھی۔ چاند بھی تو مینا کماری سے ملتی جلتی تھی۔ اسی کی طرح زیادہ تر سفید لباس پہنتی تھی۔ بالوں کو ایک ہی طرز پر بنائی تھی۔ چوڑی

دار پاجامہ پہنتی تھی جن کے نیچے کبھی کبھی پازیبیں پہن لیتی تھی تو ان کی جھنکار سے رحبانی کے دل کے تار چھڑ جایا کرتے تھے۔ اور چاند کو یاد کرتے ہوئے رحبانی نے سر جھٹکا تھا۔ نفرت سے یا شاید ملال سے ......

اپنے بھاری لباس کے ساتھ ایمن کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ مجرا کر کے سیدھا ادھر ہی آ رہی تھی۔ اس نے رحبانی کو دیکھا تھا۔ جو اس کی وہاں آمد سے بھی نہیں چونکا تھا۔ ایمن قالین پر بیٹھ کر اپنے گھنگھرو کھولنے لگی تھی۔ اور مسلسل رحبانی کو گھورتی جا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گم ہو۔؟" اس نے پیار سے پوچھا تھا۔ رحبانی چونکا تھا۔ اس نے ایمن کو اب دیکھا تھا۔

"تم کمرے میں کب آئیں؟"

"تھوڑی دیر ہی ہوئی...... نہ تو میری خوشبو تمہیں مہکا سکی اور نہ میرے گھنگھرو تمہیں جھنجوڑ سکے۔"

رحبانی خاموش رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ بتاؤ......" وہ وزنی دوپٹے کو خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں...... کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں......" رحبانی نے کہا تھا۔ ایمن نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"تم آج تک مجھ پر آشکار نہیں ہو سکے رحبانی...... جب جب لگتا ہے کہ میں تمہیں زیادہ جانتی ہوں۔ دھوکا کھاتی ہوں۔"

"کیا جاننا ہے تمہیں...... کیا اب بھی جاننے کو کچھ رہ گیا ہے۔"

"میں تمہارے ماں باپ، حسب نسب یا پہلی محبت چاند کے بارے میں نہیں پوچھ رہی رحبانی...... وہ سب تو میں جانتی ہوں۔"

"تو...... پھر......" رحبانی نے پوچھا تھا۔ کومل نے اپنی شہادت کی انگلی رحبانی کے سینے پر رکھ دی تھی۔

"اس کا حال بتاؤ...... دل کا...... کون ہے یہاں پر؟"

"تم ہو اور کون ہو گا۔" رحبانی نے کہا تھا۔ اور کہتے ہوئے اس کا انداز کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ کہنے والا بھی جانتا تھا کہ یہ جھوٹ بولا جا رہا ہے اور سننے والا بھی جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بتایا جا رہا ہے۔

"نہیں...... میں یہاں نہیں ہوں رحبانی...... یہاں چاند ہے۔ اور اگر چاند بھی نہیں ہے تو یہ جگہ خالی ہے۔"

"تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو ایمن......" رحبانی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ایمن پیچھے ہوئی تھی۔

"تم مکمل طور پر میرے نہیں ہو رحبانی...... تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہو۔"

رحبانی چپ رہا تھا۔ وہ کیا بولتا۔

"مجھے دنوں تمہارا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بستامی کے ہاتھ تمہیں پیغام بھجوانے پڑتے ہیں۔ ملازموں کو کہنا پڑتا ہے کہ تمہیں ڈھونڈ کر میرا حال بتائیں۔ تمہیں بلانے کے لیے بہانے گڑھنے پڑتے ہیں۔"

"پھر آ بھی تو جاتا ہوں میں......"

"چاند کا غم بھلانے کے لیے...... مجھے تو بارہا ایسا لگا ہے کہ تم میرے ساتھ ساتھ خود کے ساتھ بھی دھوکا کر رہے ہو۔ جب میرے پاس ہوتے ہو تو نجانے کس کو سوچتے ہو۔ کون ہوتی ہے تمہارے ذہن میں...... کون کیا۔ چاند ہی ہوتی ہو گی۔" ایمن کہتے ہوئے کچھ روہانسی سی ہو گئی تھی۔ اور رحبانی گھبرا گیا تھا۔ ایمن اس کے ذہن کی کارستانی کے بارے میں جان گئی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" اس نے کھوکھلے سے انداز میں موقف دیا تھا۔

"کئی بار میرا دل کرتا ہے کہ چاند کو زہر دے دوں۔ پھر سوچتی ہوں کہ اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ تب تو تم اسے زیادہ یاد کیا کرو گے۔"

''اچھا ناراض مت ہو۔ بتاؤ تم کیسے راضی ہوگی۔'' رحبانی نے پیار سے پوچھا تھا۔ وہ موضوع بھی بدلنا چاہتا تھا۔ چاند کا ذکر اس کے دل کو مجروح کر دیا کرتا تھا۔ ''بولو...... کوئی فرمائش ہی کردو۔''

''مجھے ٹھنڈیانی لے جاؤ......''

''وہاں کا خیال کیسے آیا تمہارے ذہن میں......''

''وہاں اونٹوں اور گھوڑوں کا میلہ سجا ہوا ہے۔ رخشندہ بتا رہی تھی۔ میں بھی وہاں جانا چاہتی ہوں تمہارے ساتھ...... چند دن سکون سے گزارنا چاہتی ہوں۔ بتا رہی تھی کہ وہاں ایک ریسٹورنٹ بھی ہے۔ جہاں بہت اچھا ستار بجایا جاتا ہے۔ بہت پیارا ماحول ہوتا ہے۔ رخشندہ کہہ رہی تھی کہ ہم جتنے دن وہاں رہے اسی ریسٹورنٹ میں جاتے رہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

ایمن نے پیار سے کہا تھا۔ اور رحبانی اس کی جھلک دیکھنے لگا تھا۔ لمحے بھر کے لیے اسے ایمن بھی ایک نیا رحبانی لگی تھی۔ جو اس کی محبت کی آگ میں جل رہی تھی۔ جیسے وہ چاند کی محبت کی آگ میں جھلس چکا تھا۔

''کیا لے چلو گے مجھے ٹھنڈیانی......''

''ہاں...... تیاری کرو۔ اسی ہفتے چلتے ہیں۔'' رحبانی نے فوراً سے رضامندی دے دی تھی۔

☆☆☆

کافی دنوں سے گھر کی چاروں لڑکیوں کا باغ میں جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ انہوں نے چاند سے اس بات کی اجازت لے لی تھی۔ چاند نے نا صرف خوشی سے اجازت دے دی تھی بلکہ ان کے لیے خاص کھانے بھی بنا کر ان کے ساتھ کیے تھے۔ حاجی بوا کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس لیے انہوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ زہرہ پھوپھو تو تعبیر کی موت کے بعد سنبھل ہی نہیں پا رہی تھی۔ کومل کے ساتھ چاند لڑکیوں کو بھیجنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے پھر تہمینہ پھوپھو کو ساتھ جانا پڑا تھا۔

لڑکیاں صبح ہی صبح تیار شیار ہو کر تانگوں میں بیٹھ کر گھر سے نکل گئی تھیں۔ ان کی واپسی شام کو ہونا تھی۔ دوپہر میں کاریگروں کو کام کی ہدایات دے کر چاند اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔ ابھی وہ لیٹی ہی تھی کہ نیچے سے کوئی شور سنائی دیا تھا۔ یہ شور بڑا عجیب تھا۔ چاند نے دالان سے نکل کر نیچے صحن میں جھانکا تھا اور پھر جلدی سے نیچے اتر آئی تھی۔

تہمینہ، روشانے، زارا اور کرن...... چاروں بری طرح سے بوکھلائی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے۔؟ اتنی جلدی کیوں واپس آگئی ہو تم سب......؟''

''وہ...... سارا نہیں مل رہی ہے۔'' روشانے نے بتایا تھا۔

''کیا مطلب نہیں مل رہی ہے۔ وہ تو تمہارے ساتھ گئی تھی۔''

''جی ساتھ ہی گئی تھی۔ لیکن پھر اچانک سے غائب ہوگی۔ اور اب مل نہیں رہی ہے۔''

''میرے اللہ......'' حاجی بوا نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ شکیلہ پھوپھو نے خود کو بے ہوش ہونے سے بچانے کے لیے ستون کو تھام لیا تھا۔

''ہم نے اسے باغ میں ہر جگہ دیکھا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔''

''جلدی جاؤ...... کوئی رحبانی کو بلا کر لائے۔'' حاجی بوا نے دہائی دی تھی۔ ایک لڑکی جلدی سے جا کر رحبانی کو بلا لائی تھی۔

''کیا ہوا ہے۔''

''قیامت آگئی ہے ہمارے گھر پر......'' حاجی بوا سینہ کوبی کرنے لگی تھیں۔

''ہوا کیا ہے۔''

''سارا کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ باغ سے کہیں غائب ہو چکی ہے۔ جلدی جاؤ...... دیکھو کہاں چلی گئی ہے میری سارا......''

''ٹھیک ہے۔ ابھی جاتا ہوں۔'' رحبانی دو تین مرد ملازموں کے ساتھ فوراً ہاں سے باہر گیا تھا۔

''اللہ میری بچی کو اپنی حفاظت میں رکھنا......'' شکیلہ پھوپھو رونے لگی تھی۔ باقی سب انہیں تسلی دینے لگی تھیں۔ چاند بت بنی کھڑی تھی۔ نجانے کیوں اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ سارا اب کبھی نہیں ملے گی۔ وہ لوگ ساری زندگی سارا کی شکل نہیں دیکھ سکیں گے۔

شام ہونے کے قریب تھی۔ جب رحبانی ملازموں کے ساتھ حویلی واپس لوٹا تھا۔

''کیا ہوا رحبانی...... سارا کہاں ہے۔'' چاند نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔

''اس کا کچھ پتا نہیں چلا......'' رحبانی نے مایوسی سے کہا تھا۔ شکیلہ پھوپھو بے ہوش ہو کر گری تھیں۔ سب انہیں تھامنے لگے تھے۔

''کیوں پتا نہیں چلا...... کہاں چلی گئی سارا......'' چاند نے پوچھا تھا۔ اور رحبانی بھلا اس بات کا کیا جواب دیتا۔ شام گہری ہونے تک سب کو یقین ہو چکا تھا کہ سارا اغواء ہو چکی ہے۔ اور اب نجانے وہ کس حال میں تب ملتی ہے۔ ملتی بھی ہے یا نہیں...... اس یقین نے بنا ملک الموت کے ہی سب کی روحوں کو ان کے جسموں سے کھینچ لیا تھا۔ ماسوائے بستامی اور کومل کے......

بستامی اور کومل دونوں اپنے کمرے میں موجود تھے۔ بستامی تاش کے پتوں سے ''تکون'' تاش گھر'' بنا رہا تھا۔ اور کومل اس کے سامنے بیٹھی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

بستامی کافی دیر تک اپنے مشغلے میں مگن رہا تھا۔

''لو...... بن گیا روشن بیگم یہ بڑا تاش گھر......'' بستامی نے آخری دو پتے چوٹی پر رکھتے ہوئے جوش سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔ کومل مسکرائی تھی۔

''ہاں واقعی...... تم تو روشن بیگم سے بھی بڑھ کر ماہر ہو چکے ہو بستامی...... تمہارے آج کے کارنامے سے مجھے تمہاری صلاحیتوں کو اعتراف کرنا پڑے گا۔''

جواباً بستامی کے چہرے پر فخریہ تاثرات پھیلے تھے۔ اور جن میں وہ بے حد برا لگا تھا۔

''کیا سارا اب تک ملتان تک پہنچ چکی ہوگی؟''

''بالکل...... اور کل صبح تک وہ ڈھاکا پہنچ جائے گی۔'' بستامی نے بتایا تھا۔ اور پھر دونوں ایک دوجے کو دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اعتذار

قارئین بہنیں جیسا کہ آپ سب کے علم میں ہے کہ ام طیفور کچھ ماہ پہلے شوہر کی دائمی جدائی کے صدمے سے گزری ہیں جس کے باعث وہ ناول ''گنوا کر دل وجاں'' کی اقساط لکھ نہیں پائیں۔ ان شاء اللہ جولائی کے مہینے میں ناول ''گنواں کر دل وجاں'' کی قسط شامل ہوگی۔ ام طیفور یہ سلسلہ وہیں سے جوڑیں گی جہاں سے ٹوٹا تھا۔

فرح انیس

الٹا سیدھا



نواب احمد کی شادی نور جہاں سے ہونا ایسا ہی تھا جیسے پاک امریکہ کے تعلقات بہتر ہو جانا۔ نسیم بیگم نور جہاں کی شادی کبھی کسی صورت نواب احمد سے نہیں ہونے دیتیں۔ نسیم جن کا صرف نام ہی مردانہ نہیں تھا بلکہ وہ کافی حد تک مردانہ اوصاف کی مالک تھیں۔ لمبی چوڑی بھاری بھرکم آواز، چہرے پر کرختگی جو نرم مزاجی ایک عورت میں ہوتی ہے وہ ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اکثر گلی کے بچے ان کو نسیم انکل کہہ کر بھاگ جاتے تھے جس کے نتیجے میں وہ بچوں کو اور ان کے خاندان کو ان شاہانہ القابات سے نوازتیں کہ اگر ان بچوں کے آبا و اجداد سن لیتے تو وہ ان بچوں کو نسیم بیگم کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔

نسیم بیگم اشرف صاحب کی اہلیہ تھیں، جن کی تین بیٹیاں تھیں سب سے چھوٹی نور جہاں جب پیدا ہوئی تو نسیم بیگم کی بڑی بہن طلعت نے اپنے

بیٹے ابراہیم کے لیے نور جہاں کو مانگ لیا تھا، جس پر نسیم بیگم نے ہسپتال میں ہی اپنی بہن سے وعدہ کیا کہ نور جہاں اُن کے بیٹے ابراہیم کی دلہن بنے گی۔

نور جہاں جیسا حسین پورے خاندان میں کوئی نہیں تھا۔ اشرف بیوی کے اس فیصلے سے بالکل خوش نہیں تھے مگر انہوں نے سوچا کہ ابھی بیگم کو بہن کی محبت کا بخار چڑھا ہے بعد میں خود ہی اتر جائے گا۔

اشرف اور عابدہ دو ہی بہن بھائی ہیں، عابدہ اپنے شوہر منیر احمد کے ساتھ نچلی منزل میں رہتی ہیں جبکہ اوپری منزل پر اشرف اور نسیم رہتے تھے۔ عابدہ بیگم کو اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا تھا جس کا نام انہوں نے نواب احمد رکھا۔ نواب احمد صرف نام کے ہی نواب تھے اکلوتے ہونے کی وجہ سے بے چارے پورا دن گھر کے کاموں میں گھن چکر بنے رہتے تھے۔

نور جہاں کو اپنے پھپھو زاد نواب احمد سے شدید قسم کی محبت تھی دوسری جانب نواب احمد کا بھی یہی حال تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آگ دونوں جانب لگی تھی تو کچھ غلط نہ تھا۔

عابدہ کو بھی نور جہاں اچھی لگتی تھی انہوں نے اپنے بیٹے نواب احمد کے لیے نسیم سے نور جہاں کا ہاتھ مانگا۔ نسیم جن کو پہلے ہی اپنی اکلوتی نند عابدہ کچھ خاص پسند نہیں تھیں۔ ان کے رشتہ مانگنے پر وہ ایسے آپے سے باہر ہوئیں جیسے انڈیا کے کرکٹرز پاکستان سے میچ ہارنے پر جنونی ہو جاتے ہیں۔ اب تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ نند کو بے بھاؤ کی سنائی کہ نند کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بھاگیں، بعد میں جب اشرف کو بیوی کی اس حرکت کا پتا لگا تو انہوں نے جا کر بڑی بہن سے خوب معافی تلافی کی مگر بہن نے بھی اس شرط پر معاف کیا کہ بھائی کے علاوہ وہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گی اور جو دروازہ دونوں گھروں میں آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا انہوں نے وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

قصور نسیم بیگم کا بھی نہیں تھا۔ نسیم جب بیاہ کر آئی تھیں عابدہ نے کم نسیم کا جینا حرام نہیں کیا تھا، ہر وقت بھاوج سے لڑائی جھگڑا رہتا۔ نسیم نے اتنی دعائیں اپنے لیے بھی نہیں کی تھیں جتنی دعائیں نند کی شادی کے لیے کی تھی۔ عابدہ کی رخصتی والے دن نسیم کی خوشی دیدنی تھی نند کو رخصت کرنے کے بعد انہوں نے شکر کے نفل ادا کیے تھے مگر شادی کے بعد بھی عابدہ کی فطرت نہیں تبدیل ہوئی، جب بھی میکے آتیں کوئی نہ کوئی ایسی بات کر جاتیں جس سے ساس کا دنوں نسیم بیگم سے منہ بنا رہتا تھا۔ ساس کی وفات کے بعد اوپری منزل پر نسیم اپنے شوہر بچوں کے ساتھ شفٹ ہو گئیں اور عابدہ نیچے شفٹ ہو گئیں جس پر نسیم اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

نسیم دوسری بیٹی شازیہ کی شادی میں مصروف تھیں اور انہوں نے بہت اصرار کر کے ہاجرہ بیگم اور تعبیر یزدان کو بلایا تھا۔

"تم لوگوں نے چلنا ہے یزدان، کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" ہاجرہ بیگم کراچی سے فون پر یزدان کو تاکید کرتے ہوئے بولیں۔ "تم آفس سے تین چار دن کی چھٹی لے لو۔"

ہاجرہ بیگم کی بات پر نا چار یزدان کو حامی بھرنا پڑی۔ نسیم بیگم ہاجرہ بیگم کی خالہ زاد ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کی پکی سہیلی بھی تھیں۔

گھومنے پھرنے کی دلدادہ تعبیر نے جب سنا تو اس نے پیکنگ شروع کر دی تھی۔

"یہ تم اتنے کپڑے کس خوشی میں رکھ رہی ہو" وہ اُسے ڈھیروں کپڑے بیگ میں رکھتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"میں نے سوچا کیا پتا ہم لاہور سے آگے کہیں ہنی مون پر نکل جائیں۔"

تعبیر کی بات پر یزدان چکرا کر رہ گیا۔

"اللہ کو مانو تعبیر، ایک بچی کی ماں بن گئی ہو، شادی کو تین سال ہو رہے ہیں، تمہارا ہنی مون ابھی تک ختم نہیں ہوا۔"

"آپ تو چاہتے ہیں میں وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاؤں۔ یہ مرد کے اوپر ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبت بھری باتوں سے عورت کو کتنا خوش رکھتا ہے اگر مرد ہی ایسے باتیں کرے گا عورت تو وقت سے پہلے بوڑھی

ہو جائے گی۔" تعبیر پیکنگ چھوڑ کر چہرے پر زبردستی کی رنجیدگی طاری کرتے ہوئے یزدان کو دیکھنے لگی۔

"ارے میری جان! ساری زندگی ہنی مون منانا، جہاں بولو گی چلیں گے، ابھی تو لاہور نسیم خالہ کے گھر چلو۔"

ٹھیک ہے پھر کب چلیں گے!" اس کی بات پر وہ خوشی سے دوبارہ پیکنگ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں ہاں اگلے سال چلیں گے۔"

اس کی بات پر وہ خوش ہوگئی۔" یزدان نے بھی شکر کا سانس لیا وہ بھی اب اپنی بیگم کی اتنی عادت سمجھ چکا تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہیرو بن کر بیگم سے ڈائیلاگ بولنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆☆☆

نسیم خالہ اور اُن کی بیٹیوں نے بہت گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا تھا۔ تعبیر کو اُن کا پرانے طرز پر بنا ہوا گھر بہت اچھا لگا تھا۔

نسیم بیگم کی بڑی بیٹی نگہت شادی شدہ تھی پھر شازیہ تھی جس کی شادی میں شرکت کے لیے وہ لوگ آئے تھے اور سب سے چھوٹی نور جہاں تھی۔

نسیم بیگم اور اشرف واجبی صورت کے تھے۔ اُن کی دونوں بیٹیاں بھی ماں باپ جیسی تھیں جبکہ نور جہاں بالکل مختلف تھی۔ گلابی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، خوب صورت نین نقش کی مالک تھی۔ "میں نور جہاں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ یہ کس پر چلی گئی ہے۔ لیکن جب میں عابدہ آنٹی سے ملی تو مجھے سمجھ میں آیا کہ نور جہاں تو اُن پر ہے بالکل اُن کے جیسی خوب صورت ہے۔"

تعبیر کے صاف گوئی سے بولنے پر پر نسیم بیگم زبردستی کا مسکرا کے رہ گئیں۔ ہاجرہ بہو کو گھور کر دیکھنے لگیں جبکہ پاس بیٹھا یزدان ہٹپٹا کر رہ گیا۔

"بیٹی! یہ بات تو آپ نے سولہ آنے درست بولی ہے" اشرف صاحب تعبیر کے منہ سے بہن کی تعریف سننے پر مزید چوڑے ہو کر بیٹھ گئے۔

شوہر کی بات پر نسیم سر جھٹک کر ہاجرہ سے دوبارہ باتوں میں لگ گئیں۔

☆☆☆

"میں آپ کو بول چکی ہوں شادی میں آپ کی بہن شرکت نہیں کریں گی۔" رات جب وہ تینوں اپنے کمرے میں تھے تو نسیم بیگم کے زور زور سے بولنے کی آواز اُن تینوں تک آرہی تھی۔ تعبیر جو کسی کام سے کمرے سے باہر نکل رہی تھی، نسیم کی چنگھاڑتی ہوئی آواز پر واپس اپنی جگہ پر دبک کر بیٹھ گئی۔

"میری بہن شادی میں آئے گی۔ اگر وہ نہیں آئی تم دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔" اشرف صاحب بھی بلند آواز میں بیوی کو دھمکی دیتے ہوئے بولے۔

"یا اللہ خیر! بیگ صاحب کی ایسی ہی لڑائی ہوئی تھی جو انہوں نے اپنی بیگم کو شادی کے بیس سال بعد طلاق دے دی تھی۔"

"یا اللہ ایسا! بھی کیا غصہ جو بیس سال بعد بیوی کو طلاق دے دی تھی۔" ہاجرہ بہو کی بات سن کر دہل گئیں اب اُن کو بھی اپنی سہیلی نسیم کی فکر ہونے لگی تھی۔

دونوں میاں بیوی کے درمیان کافی بحث ہو رہی تھی دونوں ہی چیخ رہے تھے۔ تعبیر کا کہنا تھا کہ یزدان کو جا کر بیچ بچاؤ کرانا چاہیے جبکہ یزدان کو اچانک وہاں جا کر مداخلت کرنا معیوب لگ رہا تھا۔

"ہائے یزدان! کہیں اشرف انکل نسیم خالہ کا گلا گھونٹ کر نہ مار دیں، آپ کو نہیں پتا کبیر صاحب نے اپنی بیگم ماجدہ کا گلا گھونٹ کر مار دیا تھا" تعبیر یزدان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوف زدہ سی بولی۔

"کون لوگ ہیں یہ بیگ اور کبیر صاحب جو ایسے ظالم وحشی درندے ہیں ان کو سزا بھی ہوئی یا نہیں"؟ ہاجرہ سب بھول کر بیگ اور کبیر کا انجام پوچھنے بیٹھ گئیں۔

"بے فکر رہیں۔ رائٹر ضرور ان دونوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گی۔ ابھی تو ناول کی کافی اقساط رہتی ہیں"۔ تعبیر کے تسلی آمیز انداز پر ہاجرہ اور یزدان نے سر پیٹ لیا۔

کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی ہاجرہ اور تعبیر کو فکر ہونے لگی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے نسیم آنٹی نے کچھ کھا کر خودکشی کر لی۔

ایسا ہی ہوتا ہے جب عورت شوہر کی باتوں سے دل برداشتہ ہوتی ہے تو اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے۔"

"اُف! کتنا اول فول بولتی ہو!" یزدان اس کی بات پر گھورنے لگا۔

اب تو ہاجرہ بیگم کے چشم تصور میں عجیب و غریب مناظر آنے لگے تھے جس پر وہ جھرجھری لے کر رہ گئیں۔ ہاجرہ اور تعبیر دونوں ہی آہستگی سے اُن کے کمرے کی جانب بڑھ گئے مگر وہاں کا منظر دیکھ کر تو اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نسیم بیگم زوردار خراٹے لیتے ہوئے بے خبر سو رہی تھیں اور اشرف صاحب جانے کہاں تھے۔

"چلو جی، میں تو پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھی"۔ تعبیر کے کہنے پر ہاجرہ بیگم بہو کو گھورنے لگیں جس پر وہ کھسیانی سی ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆

تعبیر کو ایک چیز پر بڑی حیرت ہوئی تھی شازیہ اور نگہت دونوں بہنیں سے نور جہاں کی بہنیں نہیں لگتی تھیں ۔جب سے نگہت سسرال سے آئی تھی وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف نظر آتی تھیں جبکہ نور جہاں بہت الگ تھلگ سی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں زیادہ نور جہاں سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ تعبیر کو نور جہاں بہت اچھی لگی تھی اور اس کی اس سے کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

رات کے کسی پہر تعبیر کی آنکھ پیاس کی شدت سے کھلی تو کمرے میں پانی ختم ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باورچی خانے کی جانب بڑھی تو باورچی خانے کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے تعبیر باہر دیکھنے لگی۔ اسے چھت کی جانب جاتی سیڑھیوں کی طرف کسی کا سایہ نظر آیا تھا جس پر وہ یک دم خوف زدہ سی ہو گئی پھر کچھ سوچ کر باورچی خانے سے باہر اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ گرمیوں کے دن تھے چھت پر جا کر اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا اس سے پہلے وہ چھت سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے قدم جیسے جم سے گئے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن ہاجرہ دوپہر میں سو رہی تھیں نسیم اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے شازیہ کی قمیص کی سلائی کر رہی تھیں کہ وہ موقع غنیمت جان کر تعبیر کے پاس آ گئی۔

آنٹی! نور جہاں کی شادی کا کب ارادہ ہے؟" تعبیر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے اُن سے پوچھنے لگی۔

"بس دیکھو، دعا کرو جلدی سے میری بہن طلعت کے بیٹے ابراہیم کی اچھی سی نوکری لگ جائے۔"

آنٹی! ابراہیم کی نوکری سے نور جہاں کی شادی کا کیا تعلق ہے۔" تعبیر انجان بن کر اُن کو دیکھنے لگی۔

ارے بدھو، نور جہاں ابراہیم کی ہونے والی دلہن ہے۔"

"آنٹی! مگر میں نے تو سنا ہے اشرف انکل تو اپنے بھتیجے سے نور جہاں کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ارے چھوڑ و تمہارے انکل تو چاہیں گے کہ اُن کی بہن کے ہاں ہو، ساری زندگی اس عورت نے میرا خون پیا ہے جب جب میکے آتی تھی آگ لگا کر جاتی تھی کہنے کو ایک نند مگر پانچ کے برابر تھی۔ یہ تو اپنا سیاپا ڈال کر چلی جاتی تھی مگر دنوں ساس کا مجھ سے منہ بنا رہتا تھا پھر میرے اور میاں کے جھگڑے الگ ہوتے تھے۔ اب بتاؤ۔ میرا دل چاہے گا ایسی عورت کو اپنی بیٹی دینے کا جس نے اس طرح سے مجھے ستایا ہو۔"

"آنٹی! مگر وہ تو سب ماضی تھا اب تو وہ ایسی نہیں رہیں۔ بہت بدل گئی ہیں۔ دوسرا یہ کہ نور جہاں اُن کے بیٹے کی پسند ہے اور کوئی ماں اپنے بیٹے کا گھر بھی خراب نہیں کرے گی۔"

"بس میں وہاں نور جہاں کی شادی نہیں کروں گے، میرا بھانجا بے شک نواب احمد جتنا اچھا نہیں ہے، نواب احمد بہت اچھا بچہ ہے۔ اگر وہ عابدہ کا بیٹا نہیں ہوتا تو میں ضرور نواب احمد سے اپنی بیٹی کی شادی کرتی۔" تعبیر سمجھ گئی تھی نسیم بیگم بھی اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹنے والیں۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے گھر میں سب محسوس کر رہے تھے کہ نور جہاں بیٹھے بیٹھے کہیں کھو سی جاتی ہے یا پھر خلاؤں میں تکتی رہتی ہے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد اچانک نور جہاں چکرا کر گر گئی جس پر نسیم بیگم اور اشرف صاحب بوکھلا کر رہ گئے۔ اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے

اردگرد موجود لوگوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کوئی کچھ بولتا کہ اس کے منہ سے مردانہ آواز سن کر نسیم بیگم کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ عابدہ اور طلعت ابھی وہیں موجود تھیں کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نورجہاں کو کیا ہو گیا ہے۔

"مجھے لگتا ہے نورجہاں پر جن کا سایہ ہو گیا ہے۔" تعبیر کی بات پر سامنے بیٹھیں طلعت کی حالت غیر ہونے لگی۔

"آنٹی! میں ایک بابا کو جانتا ہوں اگر آپ بولیں تو میں ان کو بلالوں نے۔" یزدان نے اپنی خدمات پیش کیں۔

پوری رات اُن کے گھر میں ایک خوف کی کیفیت رہی نورجہاں مستقل رات بھر مردانہ آواز میں چیختی رہی فجر تک جا کر یہ سلسلہ تھما۔

دوپہر ہی یزدان ایک بابا کو لے کر پہنچ گیا۔ بابا کے مطابق نورجہاں پر کوئی جن عاشق ہو گیا ہے۔ اور جس سے بھی نورجہاں کی شادی ہوگی اس کی جان کو خطرہ ہوگا۔ یہ بات جب طلعت کو پتا چلی وہ جو ابھی تک بھانجی کے واری صدقے جاتے نہیں تھکتی تھیں انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی صورت ابراہیم کی شادی نورجہاں سے نہیں کریں گی۔ ابراہیم کو بھی اپنی جان بہت عزیز تھی وہ بھی ابھی بھری جوانی میں مرنا نہیں چاہتا تھا اس نے بھی صاف ماں کو انکار کر دیا۔

نسیم کو بہن کے اس انکار سے بہت دھچکا لگا تھا ان کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ اب کون اُن کی بیٹی سے شادی کرے گا کہ اچانک عابدہ بیگم ایک بار پھر نورجہاں کا ہاتھ مانگنے آگئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ لوگ نورجہاں کا علاج کروائیں گے۔ اشرف صاحب کی نظر میں بہن کا مقام بلند ہو گیا تھا۔ نسیم بیگم کو بھی جو نند سے گلے شکوے تھے سب ختم ہو گئے تھے نسیم بیگم آبدیدہ ہو کر نند کے گلے لگ گئی تھیں۔۔

عابدہ بیگم کے اصرار پر شازیہ کی رخصتی والے دن ہی نورجہاں کی بھی رخصتی ہو گئی تھی۔ نورجہاں اور نواب احمد کے چہرے خوشی سے چمکتے دیکھ کر تعبیر کے اندر ڈھیروں طمانیت اتر آئی تھی۔

☆☆☆

"پہلی بار میری بیگم نے ایسا کام کیا ہے کہ داد دینی پڑے گی۔" یزدان ٹرین میں بیٹھا کھڑکی سے باہر تکتی تعبیر کو دیکھ کر شرارت سے بولا جس پر وہ اس کو گھورنے لگی۔

"اب میری بہو اتنی بھی بے وقوف نہیں ہے ناول پڑھ پڑھ کر آخر کو اس نے بھی ایک کہانی بنا ہی لی۔"

ہاجرہ بیگم کے کہنے پر تعبیر کو بھی ہنسی آگئی۔ کچھ سوچ کے مسکرا دی۔ جس رات وہ چھت پر گئی تھی تو ایک لمحے کو وہ چھت پر دو سائے دیکھ کر ڈر گئی مگر سامنے نواب احمد اور نورجہاں کو دیکھ کر وہ ساری کہانی سمجھ گئی تھی۔ نورجہاں کی بھیگی نگاہیں اور نواب احمد کے چہرے کی بے بسی تعبیر کو یہ سوچنے پر مجبور کر گئی کہ وہ دونوں یوں کب تک چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے، ایک نہ ایک دن تو ابراہیم سے نورجہاں کی شادی ہو جانی ہے۔ وہاں کھڑی تعبیر کے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا اور یوں اس پلان میں اس کو یزدان ہاجرہ بیگم اور عابدہ کو شامل کرنا پڑا تھا۔ نسیم بیگم جو کافی ضعیف الاعتقاد تھیں جلد ہی ان کی باتوں پر یقین کر لیا۔ وہ نورجہاں کی حالت دیکھ کر کافی گھبرائی تھیں۔ ان دونوں کی شادی جو عام حالات میں ناممکن نظر آرہی تھی نورجہاں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بھی نواب احمد کی دلہن بنے گی۔ نواب احمد اور نورجہاں دونوں ہی تعبیر کے بے حد ممنون تھے جس کی وجہ سے ان دونوں کا ملن ہوا تھا۔

"تعبیر! میری مانو تو تم بھی اب ایک ناول لکھ لو۔" ہاجرہ بیگم بہو کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"معاف کر دیں ابھی ناول پڑھ پڑھ کر یہ حال ہے۔ لکھے گی تو میرا کیا ہوگا۔" یزدان کے بے ساختہ ہاتھ جوڑنے پر تعبیر ہاجرہ بیگم زور سے ہنس دیں۔

تیزی سے چلتی ٹرین کی کھڑکی سے باہر کے نظاروں کو دیکھتی تعبیر سوچ رہی تھی کہ بعض اوقات کچھ اچھا کرنے کے لیے کچھ الٹا سیدھا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

☆☆

شمائلہ ذالعباد

میرے مہرباں

ناولٹ

"اسید یار! پھر سے سوچ لے بیس ہزار یورو ہیں بیس ہزار پاکستانی روپیہ نہیں۔ اوپر سے پورے سال کی ٹکا ٹکا کر کے جوڑی کمائی وہ ایڈوانس مانگ رہی ہے۔ ہر مہینے پہلے اس کی قسط ادا کرنی ہوگی اس کے بعد چند سو یورو تیری جیب میں بچیں گے کہ نہیں بچیں گے۔ ویسے میں یہ ساری بکواس کیوں کر رہا ہوں تجھے خود بھی تو معلوم ہے۔"

فرنو دے نے غصے سے سر پر پہنی اونی ٹوپی اتار کر نیچے پھینکی۔ برف سے اٹی سرد ہوا نے اس کے نیم گنجے مسلسل ٹوپی لینے سے گرم ہوئے سر کو چھوا تو فوراً ہی اٹھا کر دوبارہ پہن لی۔ "کس مراقبے میں پڑے ہو کچھ منہ سے بکو۔"

نُودے! میں پاکستان کسی قیمت پر واپس نہیں جا رہا، تجھے ایک بار کہہ دیا کہ اب جینا مرنا اسی ایمسٹرڈیم میں ہے تو بس پھر یہیں ہے۔ جہاں چار سال چچا یورپ کی کمائی کھاتے رہے، اب تین سال یہ نینا مہتا کھالے گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ ساتھ نیشنلٹی بھی تو دلائے گی چچا نے تو بی بی کے مرنے تک کا نہ بتایا۔

"یعنی تو پکا ہے۔"

"ہاں میں پکا ہوں۔"

"پاکستان کسی سے مشورہ کر لیتے۔"

"کس سے کروں چچا! سے یا بابا، بی بی کی قبر پر جا کر؟"

"تو بڑا تلخ ہو رہا ہے حالانکہ ویاہ کرانے لگے لڑکے تو خوشی کے مارے منہ سے شہد ٹپکانے لگتے ہیں۔"

"کون سا پکی شادی ہے جو شہد ٹپکاتا پھروں۔"

"یار! میں نے اڑتی اڑتی سنی ہے کہ نئی حکومت پالیسیاں بدل دے گی۔ دو سال مزید انتظار کر کے دیکھ لیتا، کیا پتا پیسے بچ جاتے یونہی پکا ہو جاتا۔"

"انیس بھائی کا ڈچ وکیل یہ شادی رجسٹرڈ کرا رہا ہے اسی کے مشورے سے کرنے لگا ہوں۔ وہ ڈچ ہے اسے ہم سے زیادہ ان گوروں کی اسکیمیں اور پالیسیاں سمجھ میں آتی ہیں۔ ویسے بھی نودے، میں اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا ہوں، انہوں نے مدت پوری ہونے پر بھی کوئی نہ کوئی کٹا کھول ہی لینا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی سائیڈ سیف رکھ کر ان گوروں سے کھیلا جائے۔ شادی رجسٹرڈ کرانا ہی بہترین آپشن ہے کم سے کم چار سال بعد شہریت پکی مل جائے گی، اعتراض تو نہیں لگائیں گے۔"

"ہاں باتیں تو ساری ٹھیک ہیں۔ ڈچ کے ساتھ شادی سے نیشنلٹی والی سائیڈ تو سیف ہو جائے گی پر مجھے ڈر لگ رہا ہے گوری فراڈ نہ کر جائے۔ مہتا کے ساتھ کر گئی ہے، انڈین گجراتی مہتا کی بات کر رہا ہوں۔"

"انیس بھائی اور وکیل کی پکی گارنٹی، ہے اللہ خیر کرے گا۔"

"لڑکی سے خود ملے ہو؟"

"نہیں شام کو سینٹر میں ہی ملنا ہے۔"

"شام، اور کون سی شام؟ دو تو بج رہے ہیں چار بجے سورج غروب ہو جائے گا۔"

"سات بجے نکاح ہے۔"

"ابے گھونچو! سات بجے نکاح ہے تو ادھر ورکشاپ میں انڈوں پر بیٹھا ہوا ہے کیا، چل نکل تیاری کریں۔"

اس ۔کہ تھکے تھکے انداز کی پروانہ کرتے ہوئے فرنو دانصاری پہلے اسے باربر شاپ لے کر گیا، ہیئر کٹ کے بعد زبردستی چہرے کا مساج کروایا۔ اسید لاکھ شور ڈالتا رہا پر فرنو د اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

انگوری رنگ کی کئی بار پہنی شرٹ اور سیاہ پینٹ پر پچھلے دنوں لیا گیا نیا سیاہ کوٹ پہنے جب وہ باہر آیا تو



فرنود ہاتھ میں سرخ پھول لیے کوٹ پر سجانے کو بے تاب کھڑا تھا۔

"تائی نہیں پہنی؟"

"کاغذی شادی ہے، زیادہ ڈرامے نہ کر۔"

"ابے بھلے کاغذی ہی سہی شادی تو ہے۔ میں تو بھنگڑا بھی ڈالوں گا میرے یار کی کاغذی شادی ہے۔ سوہنا گبرو جوان بن کے چلتے ہیں، ایسا نہ ہو گوری تیری شکل دیکھ کر جواب دے دے۔"

دونوں دوست گاڑی میں بیٹھے تو فرنود کو اس کے خالی ہاتھ دیکھ کر یاد آ گیا۔

"گفٹ کہاں ہے؟"

"کون سا گفٹ؟"

"انگوٹھی، پھول اور کوئی اور چیز منہ دکھائی کی رسم کے لیے۔"

"نودے! میرا سر نہ کھا۔ نیشنلٹی کے لیے حکومت کو دھوکا دینے والی شادی کر رہا ہوں، گجرات میں سہرا باندھ کر نہیں جا رہا جو منہ دکھائی کے گفٹ لیتا پھروں۔"

"جب پاکستان میں کوئی رہا نہیں، نہ واپس جانے کا ارادہ ہے تو اس شادی کو سنجیدہ لے لو، کیا پتا اللہ نے اس کے ساتھ ہی جوڑ لکھا ہو۔ اس لیے اس کے دل میں اترنے کی کوشش بھی کرنا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ نیشنلٹی دلوانے میں وہ کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی مطلب دھوکا دہی کے چانسز کم ہو جائیں گے۔ دوسرا کیا پتا اکٹھے رہنے سے دل بھی مل جائیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال میں اور جیسمین ہیں۔"

"جیسمین بھابھی پاکستانی نژاد ہے۔ اس ڈچ خاتون کا اور بھابھی کا موازنہ ہی نہیں بنتا۔"

"پھر بھی میری بات ذہن میں رکھنا بہت سنبھل کر چلنا، اسے ناراض کر کے خواہ مخواہ کیس خراب نہ کرا لینا۔ مہتا کی طرف دیکھ کر نصیحت پکڑے رکھنا۔ معلوم ہے نا کس قدر خر دماغ ہیں یہ ڈچ گورے گوریاں نا۔"

"بس کر یار، میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ یہ تلقین شاہی سلسلہ ختم کر دے۔"

اس کے بعد فرنود خود پر جبر کر کے نصیحت منہ میں دبائے اسے پھولوں کی دکان میں لے کر گھس گیا۔ گلدستہ لینے کے بعد اسید اس کی کار کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر قریبی جیولری شاپ میں لے گیا، ناچار اسید کو منہ دکھائی کا گفٹ بھی لینا پڑا۔

☆☆☆

اسید تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ گوری والی پارٹی بھی کنٹریکٹ میرج کی وجہ سے دو تین لوگوں یعنی دلہن اور اس کے وکیل تک محدود ہوگی۔ پر ادھر تو وہ باقاعدہ عیسائی دلہن بنی، منہ پر جالی گرائے، ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لیے فوجی دستے جتنے عوام کے جھرمٹ میں چلی آ رہی تھی۔

"اسید! یہی تیری دلہن ہے؟"

"انیس بھائی کا وکیل ساتھ ہے تو یہی ہوگی۔"

"شاباش جگر شاباش! اس بے نیازی پر قربان جاؤں، بائی داوے ایگریمنٹ کیسے اور کب طے ہوا تھا؟" فرنود نے بھرپور طنز کیا۔

"یار مجھے تو کل انیس بھائی کی کال آئی تھی کہ پکا ہونے کے لیے لڑکی مل گئی ہے جلدی آ۔ وہاں گیا تو وہ وکیل کے پاس لے گئے، وہیں فون پر بات چیت ہوئی۔ لڑکی کو پانچ ہزار یورو فوری ایڈوانس چاہیے تھے، انیس بھائی اڑے رہے کہ پہلے میرج رجسٹرڈ ہوگی پھر پیسے۔ دوسری صورت میں ایک یورو نہیں دینا۔ لڑکی کو ایمرجنسی تھی اس نے کہا کل ہی شادی رکھ لو، آگے جو کچھ پیش آئے گا تیرے سامنے ہی ہوگا۔"

"اچھا اچھا۔ اب لڑکی کہا تو دانت توڑ دوں گا، نینا کہو۔ جتنی جلدی اس رشتے کے عادی ہو جاؤ گے اتنی جلدی لوگ قائل ہو جائیں گے کہ اصلی شادی ہے ورنہ جیل سے چھڑانے میں نہیں آنے والا، نہ جہاز کی دُم میں سوار کرانے آؤں گا۔"

ان کی بات چیت میں انیس اپنی فیملی کے

ساتھ پہنچ گیا۔

"فرنود! تُو آ رہا تھا تو ساتھ ہی جیسمین اور عاشر کو لے آتا۔ نینا کی طرف سے اتنے لوگ دیکھ کر مجھے تو اچھا نہیں لگ رہا، دو تین فیملیز تو اسید کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں۔"

"انیس بھائی! اس نے کہا اکیلے آؤ، میں تو اڑتا ہوا پہنچا ہوں حالانکہ شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔"

اسید ان کی گفتگو یوں سن رہا تھا جیسے کسی اور کے بارے میں باتیں ہو رہی ہوں۔ کبھی کبھی اچٹتی نگاہ سامنے لگی کرسیوں پر بیٹھی برائیڈل پارٹی پر پڑ جاتی تو نیلے پیلے اسکرٹ والی گوریاں دلہن کو خدا جانے کیا کہنے لگتیں۔

"تمہاری والدہ کا پتا چلا بے حد دکھ ہوا۔" انیس کے والد اس کا ہاتھ پکڑے افسوس کرتے رہے۔ وہ اندر کی گھٹن اندر دبائے پتھر بنا سنتا رہا۔

"دیکھو بیٹا! تم لوگ اپنی مرضی کے مالک ہو۔ تمہاری جنریشن مذہب کے معاملات میں ہم سے بہت الگ سوچتی ہے پر میں بات کیے بنا رہ نہیں سکتا برا لگے تو معاف کرنا۔"

"آپ کہیے انکل، مجھے برا نہیں لگے گا۔"

"یہ جو امام صاحب سے نکاح پڑھوانے اور بعد میں رجسٹرڈ کروانے کا آئیڈیا تھا۔ یہ میرا ہی تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں ایجاب وقبول کے مرحلے میں کاذب قبول مت کرنا، میرا وجدان اسے گناہ مانتا ہے۔ جھوٹ قبول کرنا یا چھوڑنے کے نام پر قبول کرنا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔"

انیس کے والد بول رہے تھے وہ پھولوں کا گلدستہ پکڑے خاموشی سے سن رہا تھا کہ مذہبی تو وہ بھی بس عید کے عید ہوتا تھا۔

"میں کہنا چاہتا ہوں صرف یہ سوچو کہ تم نکاح کر رہے ہو، اور آگے اس بچی کی مرضی۔ نیشنلٹی کے بعد طلاق دے دے یا نہ دے، تمہاری نیت صاف ہونی چاہیے۔"

"انکل! اتنی مشکل راہ پر نہ ڈالیں۔ آپ جانتے ہیں میں نیشنلٹی کے بعد کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کا خواہ ہوں۔ بی بی جان زندہ ہوتیں تو میم بہو پر قطعاً راضی نہیں ہو سکتی تھیں نہ ہی میں ان پر اعتبار کرتا ہوں کلچر کے فرق کی وجہ سے۔"

"کلچر کی وجہ سے اعتبار تو میں بھی نہیں کرتا، دو دن پہلے ہی ہمارے ساتھ والے فلیٹ میں دو گوریاں شادی رجسٹرڈ کروا کے آئی ہیں خدا کی پناہ، استغفار۔ عورت کی عورت سے شادی اور مرد، مرد سے شادی رجسٹرڈ کرا سکتا ہے! خدا کے غضب کو آواز دینے والی بات ہے نا!"

"جی بالکل انکل، ایسا ہی ہے۔"

"یہ لوگ جیسے مرضی کرتے رہیں تم میری بات ذہن میں رکھنا، اکٹھے رہو گے کہ نیشنلٹی کے لیے ضروری شرط ہے تب ہی گناہ سے بچنے کے لیے شرعی نکاح پڑھوانے کا مشورہ میں نے انیس کو دیا تھا، اس کا احترام کرنے کا کہنا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

"چیپی پیپر میرج کرنے لگا ہوں۔ میرے لیے تو ایف ایم ریڈیو نصیحت ہی کھول لیا گیا ہے۔"

دلہن پر بھاری گرم شال انیس کی والدہ نے ڈالی یوں چند سونیرو حق مہر کے عوض نکاح ہو گیا۔

انیس کو تو احترام کی وجہ سے اسید کچھ کہہ نہ سکا لیکن جیسے ہی فرنود گلے لگا اس کی زبان کی کھجلی سوا نیزے پر پہنچ گئی۔

"مبارکیں یوں دے رہی ہیں جیسے جنت الفردوس تک پہنچنے والا سنگم ہوا ہے۔ میری منتظر ستر حوروں کو ان کی سردار مل گئی ہے۔"

"خیر مبارک کہہ، بکواس نہ کر۔" فرنود نے بھی کان میں جوابی سرگوشی کر ڈالی۔

رجسٹرڈ کرانے کے لیے جب قافلہ روانہ ہوا تو اسید کو نینا کے ساتھ بیٹھنے کا کہہ دیا گیا۔ اگلہ مرحلہ سر ہونے تک اسید کی رگوں میں خون کی جگہ ڈر دوڑتا رہا۔ چور نظروں سے ہال میں موجود لوگوں کو دیکھ کر اسے مزید وحشت ہوتی رہی۔ انگوٹھیاں پہنا کر جب وہ فارغ ہوئے تو مبارک باد کے ساتھ انہیں جانے

کی اجازت دے دی گئی۔ اسید بے یقین سا وہیں جما کھڑا تھا جب فرنود نے بازو ہلایا۔

"چلنا نہیں ہے کیا؟"

"شادی ہو گئی...... میرا مطلب جانے کی اجازت مل گئی!"

"ہاں۔"

"شکر ہے مالک، میں تو ڈر ڈر کے مرنے والا ہو چکا تھا کہ کہیں یہ گنجا اس خلقت کے سامنے دلہن کو چومنے کا نہ کہہ دے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔"

اسید نے ٹھیٹھ پنجابی میں اطمینان کا اظہار کیا تو فرنود جناتی قہقہہ روک ہی نہ سکا۔

"اچھا تو اس لیے پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔ لوگ شرم سے سرخ پڑتے ہیں تو پیلا پڑ گیا۔"

فرنود نے اپنی ہی بات پر پھر بے ڈھنگا قہقہہ لگایا تو دلہن کے ساتھ آئی عوام بلاوجہ ہی ڈنٹونک والے دانت دکھانے لگی۔ مجبوراً فرنود انصاری کو منہ بند کرنا پڑا۔

☆☆☆

"یار! یہ گوروں کا دستہ ہوٹل میں قیام کا پنگا کیوں ڈال گیا۔"

اسید حد درجہ بیزار ہو گیا کہ نیتا کے کولیگز اور فرینڈز شادی کے بعد ان دونوں کے گلے لگ لگ کر مبارکیں اور ہوٹل میں آج کی رات قیام کا واؤچر دے کر رخصت ہوئے تھے۔ یہ سب نے مشترکہ تحفہ دیا تھا۔

"اس لیے پنگا ڈالا گیا کہ ان کے نزدیک یہ شادی اصلی ہے۔ تم بھی محتاط رہنا کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہیے کہ نیشنلٹی کے لیے جعلی شادی کھڑکائی ہے۔ اب تم لوگ میاں بیوی ہو، دوسروں کو اچھے محبت کرنے والے جوڑے کا ہی تاثر جانا چاہیے ورنہ اگلا مرحلہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ تین سال بعد اپلائی کرو گے تو سرکار اپنے سورسز سے بھی تصدیق کرائے گی۔ سختی اتنی ہو چکی ہے، ذرا سے مشکوک فعل پر نہا دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں یہ لوگ پھر شہریت کے بجائے تشریف پر لات مار کر پاکستان پھینک دیں گے، ڈائریکٹ فلائٹ۔ سمجھے؟"

اسید نے ہونٹ بھینچ کر سر ہلا دیا۔

اب فرنود، انیس اس کا وکیل اور وہ دونوں ہی بچے تھے۔ شادی والے غیر قانونی معاہدے پر بڑے انصاف سے عمل کیا جا رہا تھا۔ انیس نے اسید کو اشارہ کیا تو اس نے جیب سے پانچ ہزار یورو نکال کر وکیل کی طرف بڑھا دیے۔ وکیل نے تصدیق کے بعد دلہن کو دے دیے۔ اپنی فیس لی پھر انیس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا اور رخصت ہو گیا۔ فرنود نے دونوں کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو اسید فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔

"ادھر کدھر؟"

"پیچھے وہ بیٹھے گی نا۔"

"بیٹا! تمہاری بیوی ہے اس کے ساتھ ہی بیٹھنا ہے۔ گدھوں کے سردار، تم میں اداکاری کے گٹس ہی نہیں ہیں۔ کون سا نیا دلہا سینٹر سے بیوی کو چار فٹ دور بٹھا کر نکلتا ہے؟ وہ دیکھو کمر میں ہاتھ ڈالے جا رہا ہے نا نیا شادی شدہ جوڑا، اس سے کچھ سیکھو۔"

"کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں......"

"بیٹا غیر قانونی تارکین وطن سے ڈچ نیشنل بننا ہے۔ دھنیا پودینہ نہیں اگانا کہ چٹکی بجاتے سب سیٹ۔"

"ہوٹل میں وہ دونوں نئے جوڑے کی طرح بازو دبوچے داخل ہوئے، تمام حاضرین نے مبارک دی۔ ہوٹل والوں نے انہیں ان کے کمرے تک گائیڈ کیا۔ کمرا ٹھیک ٹھاک حجلۂ عروسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ست رنگی روشنیاں اور پھولوں کے گلدستے دل آویز مہک لٹا رہے تھے۔

"کمرے کی سجاوٹ ہماری طرف سے تحفہ ہے۔" منیجر نے شستہ ڈچ میں انہیں مطلع کیا۔

اسید سے پہلے نیتا نے شکریہ ادا کر دیا۔ لیکن اسے لگا اتنا کافی نہیں ہے سو سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا سرخم کر کے اس نے بھی باچھیں پھیلا کر خوش باش

دلہے کے تاثر والا شکریہ ادا کیا۔

کمرے میں پہنچتے ہی نینا نے دروازہ لاک کیا سر پر ٹکا جالی کا تاج نوچ کر پھینکا۔ اونچی ہیل نوچ کر اتاری سفید لمبا گاؤن اتارا، سفید ٹاپ اور سفید اسکرٹ میں بیڈ پر بیٹھ کر کال ملالی۔

بیڈ کے سامنے بڑی سنگل کرسی پر بیٹھے اسید نے بھی اس کی دیکھا دیکھی کوٹ میں اٹکا پھول نوچا پھر کوٹ اتارا جوتے اتارے اور اتار کر دوبارہ پیروں میں پھنسالیے۔ اب وہ خاموش تھا لیکن وہ کال کر رہی تھی اسید کی جانے بلا کس کو اتنی ایمرجنسی میں پانچ ہزار یورو کے پاس ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔ ڈچ تو اسید کو سمجھ بھی اونی پونی آتی تھی انگلش قدرے بہتر تھی پر نیدر لینڈز والے باقی یورپ کی طرح اپنی زبان کو ترجیح دیتے تھے برطانوی زبان کو نہیں۔

تم سو جاؤ مجھے کچھ ایمرجنسی کالز کرنی ہیں۔ اس ڈسٹربنس کے لیے معذرت، میں تمہارے آرام کا خیال رکھوں گی۔ اب جو کال ہو گی ٹوائلٹ (بیت الخلا) میں جا کر کروں گی۔

"نہیں میں اوکے ہوں، تم یہیں پر کر سکتی ہو۔"

اسید کا اس کے ساتھ بیڈ پر سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ صوفے پر رات گزارنے کا سوچ چکا تھا مسئلہ صرف کمبل تھا جو بیڈ کے لیے ہی تھا۔ اس کا حل اس نے نکالنا تھا کہ نینا واش روم سے گالوں پر بہتے آنسو صاف کرتے نکلی اور تیزی سے جوتے پہننے شروع کر دیے۔ ساتھ ساتھ وہ فینسی جوتوں اور لباس کو کوس رہی تھی اسید یہی سمجھ سکا۔

"میں اپنی گرینی کے پاس جا رہی ہوں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

اسے خود معلوم نہیں تھا یہ فیصلہ اس سے کیونکر سرزد ہوا۔ جھجکتے ہوئے اس کے کندھے پر بازو رکھے وہ لابی سے گزر آیا تا کہ اسٹاف و حاضرین مشکوک نہ ہوں۔ باہر موسم شدید سرد ہو چکا تھا اپنے بازو کے نیچے اس نے سرد ہوا سے اس کے کندھوں کی تھرتھراہٹ واضح محسوس کی تو بالی وڈ ہیرو کی طرح اپنا کوٹ اتار کر پیش کر دیا۔ جسے پہننے سے وہ بار بار انکار کر رہی تھی۔

"شدید سردی ہے تم پہنے رکھو، ہم اس موسم کے عادی ہیں تم یہاں نئے ہو تمہیں عادت نہیں ہو گی۔ اوبر میں بیٹھتے ہی سب سیٹ ہو جائے گا۔"

"اس کی وضاحت کے باوجود اسید نے کوٹ اسے تھما دیا ورنہ تو شادی والے ریشمی ٹاپ اسکرٹ میں اس کی قلفی جم جاتی۔ موسم کے لحاظ سے نامناسب جوتوں کپڑوں میں وہ ایمسٹرڈیم کی پرانی گلیوں میں پہنچے۔ پرانے ایمسٹرڈیم کے روایتی گھروں کا مسئلہ یہ ہے کہ سیڑھیاں بہت تنگ اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ اس سے آگے تھی۔ چوتھی سیڑھی پر اس کی اونچی ہیل تنگ اور چھوٹے سائز کی سیڑھی کی وجہ سے لڑکھڑائی تو اس نے بے اختیار پیچھے سے کمر پر ہاتھ رکھ کر سہارا دیا۔

وہ شکریہ کہہ کر اسی تیزی سے اوپر چڑھتی گئی اختتام جس کمرے میں ہوا وہاں دوائیوں کی بو اس قدر رچی بسی تھی کہ فضا بھی دوا زدہ محسوس ہوئی۔

"گرینی! اب سیٹ ہو جائے گا آپ دیکھنا میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

وہ ضعیف عورت کے ہاتھ پکڑے چوم رہی تھی۔ اسید جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ چند منٹ بعد ایمبولینس میں گرینی کے ساتھ وہ بھی ایک پرائیویٹ ہسپتال میں موجود تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے نینا نے اسی کے دیے پانچ ہزار یورو ہسپتال میں ادا کر دیے۔ ضعیف العمر گرینی ہسپتال داخل کر لی گئی۔

"تمہیں میرے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس سخت سردی میں گرم بستر سب سے اچھا ٹھکانہ ہے۔"

"میں اس لیے ساتھ آ گیا کہ ہوٹل والے مشکوک نہ ہوں۔"

"اوکے۔ لیکن میں تمہارے کسی ایسے فعل سے متاثر ہو کر معاہدے سے کم رقم لے لوں گی کا سوچنا بھی مت۔ وہ ہیل سے پیر نکال کر انگلیاں دبا رہی

تھی۔"

"نہیں نہیں۔" میری ایسی کوئی سوچ بھی نہیں ہے، تمہیں آرام دہ جوتے پہننے چاہیے تھے۔"

"مجبوری تھی اس لیے ایک چیرٹی ہاؤس سے شادی کا لباس اور جوتے لینا پڑے تا کہ شادی کی تصویریں بن سکیں تمہارے لیے آسانی رہے گی۔"

"شکریہ......"

"ابھی شکریہ نہیں کہو۔ ہوسکتا ہے تمہیں ہوٹل جا کر گاؤن واپس لانا پڑے میں نے چیرٹی ہاؤس میں واپس جمع کرانا ہے، کسی اور کے کام آجائے گا۔"

"میں لے آؤں گا، نو پرابلم۔"

"تو ٹھیک ہے تم اپنے اپارٹمنٹ چلے جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، میں ہسپتال سے فارغ ہو کر آؤں گی۔"

اس نے کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ جا سکتا ہے۔ اس نے پینٹ کی جیب میں سے سال خوردہ والٹ نکال کر حق مہر کے چند سو یورو بھی اس کی طرف بڑھا دیے۔

"قسط میں تو مہینہ باقی ہے۔ اس کی شربتی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

ہم مسلم مرد شادی کے وقت بیوی کو اپنی حیثیت کے مطابق رقم دینے کے مذہبی طور پر پابند ہیں۔ میری فی الحال اتنی ہی حیثیت ہے تو......" اسید نے دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"میں کون سا مسلم ہوں۔"

"ہمیں اہل کتاب میں شادی کی اجازت ہے۔"

"اوکے۔ لیکن ہماری شادی تو بارٹر سسٹم کے مطابق ہوئی ہے۔ تم مجھے رقم دو گے میں بدلے میں تمہیں ڈچ شہریت دلواؤں گی، تحفے تحائف دینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" اس نے رقم اس کے کوٹ کی جیب میں منتقل کر دی۔

"مسز اسید، میری مجبوری تھی اس لیے میں اپنے ملک کا قانون توڑا، میں اس مجرمانہ فعل پر شرمندہ ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی بکاؤ مال ہوں۔ لالچی عورت ہمارے معاشرے میں بھی پسندیدہ نہیں رہی۔ مجھے مزید رقم کی ضرورت ہے لیکن یہ جو گفٹ کا کہہ رہے ہو یہ نہیں چاہیے کل اس کے بدلے تم بیڈ شیئر کی بات کر سکتے ہو۔ وہ کسی قیمت پر نہیں کروں گی۔ اس لیے بہتر ہے مجھے امپریس کرنے کی کوشش نہ کرنا اپنی توقعات زیرو کر لو۔"

وہ بنا اس کی طرف دیکھے وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

شادی کو تیرہواں دن تھا لینڈ لیڈی کئی بار اس سے نینا کے بارے میں پوچھ چکی تھی۔ اسے خود کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔

"ہاں جگر! کل کا ڈنر ہماری طرف ہے نینا کو ابھی بتا دو۔" فرنود ہمیشہ کی طرح بغیر دعا سلام کے بولا۔

"ڈنر تو ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں کہیں اور جا رہے ہو، نینا سے میری بات کراؤ۔"

"وہ تو نہیں ہے۔"

"ابھی آفس سے نہیں آئی؟"

"وہ یہاں نہیں ہوتی۔"

"تو کہاں ہوتی ہے؟"

"پتا نہیں۔"

"اسید! میں فون میں سے تیرا سر پھاڑ دوں گا صحیح طرح معاملہ بتاؤ۔"

"اس دن کے بعد سے اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا، میں نے بھی نہیں کیا۔"

"سالے، کمینے وہ پانچ ہزار ہڑپ کر بھاگ گئی ہوئی تو؟ ملنگ آدمی تو کس طرح سکون سے بیٹھا ہوا ہے، انیس بھائی سے رابطہ کرنا تھا بلکہ ٹھہرو میں آتا ہوں۔ تیری ڈولی لے کر انس بھائی کی طرف چلتے ہیں۔ آخر ان کا وکیل ساتھ تھا اتنی آسانی سے میں تیرے پیسے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔"

"تجھے آنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ فراڈ نہیں کرے گی۔"

"اشکے ...... تیرے کانفیڈنس کا فٹے منہ، ایک گھنٹہ ساتھ نہیں گزارا، دعویٰ یوں کر رہے ہو جیسے ساتھ بچے کھیلتے رہے ہو۔"

فرنو دتقریر کرتا وہ ہمیشہ کی طرح چپ چاپ سنتا رہا۔

اگلے دن ویک اینڈ کی وجہ سے اس نے ڈبل شفٹ کرلی، رات دس بجے جب وہ سردی سے ٹھٹھرتا رہائش گاہ پہنچا تو لینڈ لیڈی مسز جوڈتھ نے آواز دے لی۔

"مسٹر اسید، تمہاری بیوی یہاں موجود ہے۔"

وہ گنجلک احساسات میں گھرا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا، سامنے ہی نینا کافی کا کپ پکڑے بیٹھی تھی۔ سیاہ لانگ کوٹ، براؤن گرم اونی ٹوپی اور پیروں میں سیاہ ہی لونگ شوز۔ موسم کی مناسبت سے وہ مکمل پیک تھی پھر بھی اسید کو اس کا چہرہ اس دن کی نسبت کمزور لگا۔

"اپنی وائف سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟"

"ہاں، نہیں، میرا مطلب ہے، بہت ہوئی۔"

"لگ تو نہیں رہا۔" مسز جوڈتھ نے بات چیت جاری رکھی۔ ڈچ لوگوں کی لگی لپٹی نہ رکھنے کی اور سب کچھ منہ پر کہہ دینے کی عادت جو اسید کو بہت بری لگتی تھی۔

"میرا آدمی ایشیائی ہے، مجھے کوئی مسئلہ نہیں میں اس کی فطرت کو سمجھتی ہوں وہ سرعام اظہار کا قائل نہیں ہے۔"

وہ دونوں عورتوں کے درمیان چور سا بنا کھڑا تھا بلآخر اس نے نینا کا سوٹ کیس پکڑ لیا۔ تنگ زینوں پر احتیاط سے سوٹ کیس چڑھاتے اس نے اسے بھی احتیاط کا کہا۔ دیوار گیر الماری پہلے ہی تقریباً خالی تھی کہ اس کے جوتے کپڑے بے حد محدود تھے۔ نینا کو اپنی چیزیں رکھنے کی کھلی جگہ میسر آگئی۔ ڈبل بیڈ کا حل اس نے کارپٹ پر بڑا بھاری بھرکم تکیہ درمیان میں رکھ کر نکال لیا۔ سردی روکنے والا کمبل البتہ ایک ہی تھا اس کا بھی جیسے تیسے جگاڑ لگا لیا گیا۔ تکیے کی دیوار کے پار اپنے حصے کے کمبل میں وہ گٹھڑی بنی سو بھی چکی تھی۔ اسید آنکھیں بند کیے کمرے میں کسی عورت کی موجودگی کے احساس سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لاکھ پہرے لگانے کے باوجود دھیان بھٹک بھٹک کر اسی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ہار مان کر شربتی آنکھوں والی میم کے بارے میں ذہن آزاد چھوڑ دیا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہاں تک سوچیں جاتی ہیں۔

سیانے واقعی سیانے ہوتے ہیں جبھی تو سیانے کہلاتے ہیں۔ انکل کو ہی دیکھوں تو ان کی دور اندیشی کمال ہے۔

خاک کمال ہے میری سوچوں کا دھارا بدل دیا ہے اصلی نکاح کا پنگا ڈال کر، اب یہ گوری کاغذی کے بجائے اصلی بیوی محسوس ہوتی ہے اس کے لیے پروٹیکو اپروچ دماغ میں گھس گئی ہے۔ اسید نے خود پر غصے ہوتے ہوئے کروٹ بدلی۔

اماں کے بعد یہ پہلی عورت ہے جس کے ساتھ میں ایک ہی کمرے میں سو رہا ہوں، ایسے میں خود کو اس کی ذمہ داری میں جکڑا محسوس کرنا زیادہ عجیب تو بالکل نہیں ہے۔ جونہی میرا بجٹ سیٹ ہوتا ہے فرنود اور انیس بھائی سے کہہ کر جلد ہی اصلی شادی کرلوں گا۔ خود کی فیملی ہوگی تو بی بی کی یاد بھی مدھم پڑ جائے گی۔ پر اصلی شادی کے لیے اس کو بھی بتانا پڑے گا شاید۔ تین سال طویل مدت ہوتی ہے، اس کے مطابق تو یہ کاغذی شادی ہے اس لیے وہ کسی سے بھی تعلق بنا سکتی ہے۔ اس سوچ کے آنے کی دیر تھی کہ اسے لگا جیسے بستر میں کانٹے اگ آئے ہیں۔ راجپوتی خون اچھل اچھل کر کنپٹیوں پر دستک دینے لگا ہے۔

"او چاچا! مجھے اصلی نکاح کا کہہ کر کیہڑی مصیبت چہ پا دیتا ای۔ (انکل اصلی نکاح کا کہہ کر مجھے عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے۔)

ہے بھلے گوری پر اصول پرست ہے ورنہ حق مہر

والے پیسے آرام سے رکھ لیتی اس لیے مجھے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ نیشنلٹی ملنے کے بعد طلاق تک شاید کسی سے ریلیشن شپ نہ بنائے۔

ساری رات اس کی آنکھیں بند اور دماغ جاگ کر مختلف جہتیں، دلیلیں اس کے سامنے لاتا رہا۔

وہ سب کچھ بجے سو رہی تھی جب وہ بغیر ناشتا کیے تین گھنٹے کی شفٹ لگانے نکل آیا۔ واپسی پر برستی بارش میں ویک اینڈ شفٹ سے ملے ایکسٹرا پیسوں سے وہ اس کا کمبل خرید لایا۔ تین گھنٹوں میں ایک کمرے کے اس اپارٹمنٹ کا نینا نے نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ ترتیب بدلنے سے کمرا کشادہ اور روشن لگنے لگا تھا۔ اس نے اسید کے دیکھتے دیکھتے واش روم کے دروازے پر چٹ چپکائی جس پر کون سے دن کس نے صفائی کرنی ہے لکھا تھا۔ ایسے ہی کچن، سیڑھیوں اور بیڈ روم کے بھی دن مقرر کیے بیٹھی تھی۔ اسید نے نیا کمبل اس کی طرف کے بیڈ پر رکھ دیا۔

"یہ لو کمبل کی رقم۔"

"نہیں۔ میں پیسے نہیں لے سکتا۔"

"مسٹر! تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے بتاؤ؟"

"وہ، وہ شادی رجسٹرڈ کرانے کی وجہ سے تمہارے کمفرٹ کا خیال رکھنا، تم پر خرچ کرنا مجھے اپنی ذمہ داری لگ رہی ہے۔"

"مائی فٹ! مسٹر ہمارے ہاں شادی بھی ہوئی ہو تو بھی بیوی شوہر سے ڈیمانڈز نہیں کرتی، نہ الٹی سیدھی فرمائشیں۔ ہر ہر شے میں دونوں مل کر حصہ ڈالتے ہیں، جس کی جو ذاتی خواہش ہوتی ہے وہ خود اپنی تنخواہ سے پوری کرتا ہے۔ اگر کوئی عورت فرمائشیں کرنے والی ہو، ذاتی شوق بھی شوہر سے پوری کرنے کا کہے تو ہم اسے لالچی کہتے ہیں۔ اس عورت کو "اچھا" نہیں سمجھا جاتا اور میں قطعاً بھی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں سمجھے تم......" اس نے اپنی جینز میں الٹے سیدھے ہاتھ مار کر چند سو یورو اسید کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ اپارٹمنٹ رینٹ...... گروسری اور بلز میں میرا کنٹری بیوشن کم ہے لیکن اگلے مہینے جتنا بیلنس ہوگا وہ کلیئر کر دوں گی۔ ہماری بزنس ڈیل ہوئی ہے میں تمہیں نیشنلٹی دلانے کی پابند ہوں سو اپارٹمنٹ تو شیئر کرنا پڑے گا لیکن خرچا ففٹی ففٹی ہوگا۔"

"ہمارے ہاں معاش مرد کی ذمہ داری ہے عورت صرف گھر اور بچے دیکھتی ہے۔"

اس کے آتش فشاں لہجے کے جواب میں اسید نے نارمل انداز میں وضاحت دی تو وہ فوراً ہی کول ڈاؤن ہو گئی۔

ایمسٹرڈیم کے بادل زور و شور سے برس رہے تھے، پانی بوچھاڑوں کی صورت شیشے کی کھڑکی پر بہہ رہا تھا۔ سردی بے تحاشا بڑھنے والی تھی کہ آس پاس کے باقی ممالک میں برف باری شروع ہو چکی تھی۔ اندر ہیٹنگ سسٹم پوری آب و تاب سے درجہ حرارت قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ ایسے میں وہ کشن گود میں رکھ کر کمرے کی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"سنا ہے ایشیائی مرد بہت ایروگینٹ ہوتے ہیں، عورت پر رعب ڈالنے کے لیے معاش کی ذمہ داری خود لیتے ہیں۔ اکیلے کام اس لیے کرتے ہیں کہ دوسروں کا استحصال کرنے کا جواز مل جائے۔"

"دوسروں سے کیا مراد ہے؟" اسید کے پاس بیڈ پر بیٹھنے کے علاوہ کوئی سٹنگ آپشن نہیں تھا۔

"وہ سب جو نہیں کماتے وہی مراد ہے۔ ویسے مشکل نہیں ہوتی صرف ایک کمانے والا ہو تو؟"

اسید کو بابا اور بی بی یاد آ گئے۔ وہ ساری مشکلات اور مالی مسائل بھی جن کو حل کرنے کے لیے اس نے ڈنکی لگائی تھی۔ غیر قانونی طور پر جان جوکھم میں ڈال کر یورپ گھسا تھا۔ لیکن اپنی مخصوص پاکستانی اور راجپوتی فطرت کے تحت کسی کے سامنے سب ظاہر کرنا اسے پسند نہیں تھا، اس لیے جھوٹ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ہمارے ہاں کا لائف اسٹائل ایسا نہیں ہے اس لیے آرام سے گزارہ ہو جاتا ہے جن کا نہیں ہوتا

وہ دوسرے ممالک آ جاتے ہیں۔ یہاں سے فارن کرنسی بھیجتے ہیں تو عورت کی زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔"

"تمہارے ہاں فرمائشیں یا مطالبے کرنے والی بیویاں یا گرل فرینڈز اچھی کہلاتی ہیں یا ہمارے کلچر کی طرح انہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" نینا کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"ہمارے مذہب میں گرل فرینڈ نہیں ہوتی۔ بیوی ہوتی ہے۔ سب سے اچھا مرد وہی ہوتا ہے جو بیوی کے کمفرٹ (آرام) کا خیال رکھے اس کی فرمائشیں پوری کرے ہار سنگھار، گھر کے خرچ سب مرد نے چلانا ہے۔ ہمارے ہاں معاش میں حصہ نہ ڈالنے والی عورت کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، میرا مطلب ہے جو چار دیواری میں رہتی ہے اسے۔"

"بہت عجیب۔ ہے بھئی۔ یہاں تو سب ایشیائی مرد عورتیں کام کرتے ہیں۔ مطلب ہمارا کلچر ایڈاپٹ کر چکے ہیں، خیر تمہیں تو پھر بیوی کے لیے بہت ساری رقم بھیجنا پڑتی ہوگی؟"

"نہیں۔"

"اوہ سوری، میں پرسنل ہوگئی۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے تم کرو باتیں۔"

اس نے دل میں سوچا، ان پانچ سالوں میں پہلی بار کسی گورے سے کام کے علاوہ کوئی بات چیت ہو رہی ہے تو اچھا لگ رہا ہے۔

"تو پانچ سال سے اپنی بیوی سے نہیں ملے ہو؟" شربتی آنکھیں خود ساختہ سوچ پر حیران سی حیران تھیں۔

"میری شادی نہیں ہوئی، تم سے پہلی کی ہے۔"

تم اسے شادی سمجھتے ہو؟"

اسید نے تھوک نگلنے پر اکتفا کیا ورنہ جواب دینے کا بہت دل تھا۔

"نہ تم مجھے جانتے ہو نہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی سینٹر میں ہے۔ تم کہہ رہے ہو پہلی شادی مجھ سے کی ہے۔" وہ محظوظ ہو کر ہنس رہی تھی۔

"ہمارے ہاں آج بھی ایسی شادیاں ہوتی ہیں دو انجان لوگ شادی پر ہی ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ جیسے ہمارے ساتھ ہوا۔ میرا مطلب ہے تھرڈ پارٹی نے سب کیا۔" اسید نے حتی الامکان محتاط الفاظ استعمال کیے کہ وہ اپنا مذاق نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ اسے خود پر شدید غصہ بھی آیا کہ کیوں انیس کے والد کو اتنا سنجیدہ لیا ہے۔

"تھرڈ پارٹی نے بزنس ڈیل کرائی ہے۔" نینا نے ابرو اچکایا۔

"سارے اخراجات ففٹی ففٹی۔ ڈن؟"

"کچن میں صرف حلال آئٹم آئیں گے تو ڈن۔"

"مجھے خود الکحل سمیت تمام ڈرگز سے نفرت ہے اس لیے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

اسید نے نوٹس کیا اس کا چہرہ اور باڈی لینگویج یکدم ہی کسی کرب میں آ گئے تھے۔

☆☆☆

ان کی ڈیل بہت اچھی طرح چل رہی تھی۔ گزرے تین مہینوں میں نینا نے گوریوں کے بارے میں اسید کے بیشتر خیالات دھو ڈالے تھے۔ وہ جو اول روز سے یورپی عورت کو بدکردار، بے وفا اور خود غرض سمجھتا آ رہا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ سنی سنائی باتیں تھیں۔ وہ اب ذاتی تجربے سے گزر رہا تھا جو سنی سنائی کے بالکل الٹ تھا۔ پہلے پہل جو دل و دماغ میں بے چینی ابھرتی تھی کہ وہ ایک صنف نازک کے ساتھ کمرا شیئر کر رہا ہے، وہ بے چینی میٹھی نیند سو چکی تھی، وہ صنف سے بالاتر ہو چکے تھے۔

"اگر تمہیں وہ اتنی اچھی لگنے لگی ہے تو بات کرلو، اس رشتے کو حقیقی روپ دے لو۔" فرنود نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"مجھے نہیں لگتا اس کے ذہن میں کوئی ایسا

خیال دور دور تک بھی ہے۔"

"تو پھر تم کیوں مجنوں بن رہے ہو۔ لائف سیٹ ہو رہی ہے تو پاکستان کمیونٹی سینٹر چلو کسی دن، تمہاری شادی کی بات چلا لیتے ہیں، پکی پاکستانی لڑکی مل جائے گی۔"

"جب تک نینا ہے تب تک تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اوئے گھامڑ، یہ کیا رومیو جولیٹ لو اسٹوری شروع کر رکھی ہے عملی آدمی بن عملی سمجھا!"

اسید نے سر ہلا کر جان چھڑائی۔

"گجرات سے چچا کا فون آیا؟"

"ان کا کیوں آئے گا! پیسے کے لیے آتا تھا۔ وہ میں نے بتا دیا کہ بی بی جان چلی گئیں اب کسی کو نیڈی پیسہ نہیں بھیجنے والا تو تعلق ختم۔"

"یار! کس قدر عفریت بن چکے ہیں ہمارے پیچھے والے صرف پیسوں سے غرض ہے۔ جس رشتے کو ہم نے چلانا ہے اسے باہر بیٹھے تحفے یا پیسے ارسال کرتے رہو۔ میں نے یہ حقیقت بہت جلد سمجھ لی تھی اسی لیے جیسمین سے کاغذی شادی کو حقیقی شادی میں بدل لیا۔ تب سے بہن بھائی ناراض ہیں۔ چلو رہیں ناراض، ہم نے کیا کرنا منا کر۔" فرنود نے اندر کا دکھ چھپا کر لہجہ لاپروا بنایا۔

"مجھے ڈراپ کر دو۔"

"گھر جانے کی بڑی جلدی ہے ہائیں......" فرنود نے جاتے جاتے بھی اسے چھیڑا۔

"یار! پانچ سال چھڑوں کے ساتھ رہتا رہا ہوں۔ گندہ تنگ کمرا، گندہ باتھ روم اور دس دس لوگ ایک چھوٹے تنگ کمرے میں مقیم بغیر صاف کیے باتھ روم استعمال کرنے والے ہوتے تھے۔ اب گھر کا سکھ ملا ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا رہتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو۔ رہائش سے لے کر بل تک آدھے نینا دے رہی ہے تو گھر جانے کو تو خود ہی دل کرے گا بلاشبہ خوش قسمتی ہے۔ سچ کہوں مجھے پہلے بہت ڈر تھا کیونکہ گورے بھی فراڈ ہی کرتے ہیں۔ اب سکون میں ہوں کہ کسی اچھی نسل گوری سے واسطہ پڑا ہے۔"

"میں خود اس کی عزت کرنے لگا ہوں۔ وہ بہت باہمت اور اصول پسند لڑکی ہے۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے سروائیو کر گئی ورنہ باقی فیملی ممبرز کی طرح یہ بھی مرنے کا انتظار کر رہی ہوتی۔"

"اچھا اچھا تھوڑا کم متاثر ہو۔ تو نے تو یار، اس کے گلے سنا سنا کے مجھے پکا دیا ہے۔"

فرنود کی بات پر اسید نے اس کے کندھے پر دھپ مارا تو فرنود ہنستے ہوئے اس کے گلے لگ گیا۔

"یار جانی! تیرے ہر فیصلے میں ہمیشہ تیرے ساتھ کھڑا ہوں بس ایک کال کرنا اور میں حاضر۔ تمہارے حصے کی خوشیاں بھی رب نے رکھی ہوئی ہیں مجھے لگتا ہے اب جلد مل جائیں گی۔"

گلے مل کر رخصت کر کے وہ اوپر آیا نینا جاب سے واپس آ چکی تھی۔

"تم نے آج پھر میرے حصے کا سارا کام کر لیا ہے اور اتنا مزیدار کھانا بھی تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔ یعنی احسان کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔"

"ہم نہ باز آئیں گے محبت سے، جان جائے گی اور کیا ہوگا۔"

وہ ہولے سے گنگنایا۔ آج کل اسید کی نائٹ شفٹ تھی۔ چار پانچ گھنٹے کی نیند لینے کے بعد وہ فریش ہو جاتا تو بنا نینا کی باری کی پروا کیے سب کام کر لیتا۔

"تم بہت اچھے ہو اسید، جیری ری ہیب سینٹر سے مکمل صحت یاب ہو کر آ جائے تو میں ایگریمنٹ سے کم رقم لے کر تمہاری نیشنلٹی کے لیے اپلائی کر دوں گی۔"

"اتنی مہربانی...... میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"کرسمس کی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ اب میں تمہیں ایمسٹرڈیم کی تاریخی نہریں، میوزیم اور تاریخی مقام دکھاؤں گی۔ فری ٹورسٹ گائیڈ...... کیا یاد کرو

گے۔"

اسید نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے معمول کی طرح انگریزی میں شکریہ ادا کیا۔

"آج سے تم ڈچ بولو گے صرف اور صرف ڈچ، نو انگلش۔ ڈچ نہیں آئے گی تو یہاں کا شہری بننے کا کیا فائدہ؟ جلد از جلد ڈچ سیکھ لو، پیپر میں مینشن کرو گے تو اس کا بھی مارجن ملے گا۔"

"ڈچ میں سمجھ لیتا ہوں لیکن بولنا بہت مشکل لگتا ہے۔"

"میرے ساتھ بولو گے، میں ہوں نا تمہاری لینگویج ٹیچر، بولنے سے ہی آئے گی زبان کوئی بھی ہو وہ بولنے سے آتی ہے۔"

"اگلے دن اپنے وعدے کے مطابق نینا اسے کنال کروز لے گئی حسب سابق اپنا اپنا خرچا کرتے ہوئے وہ بے حد انجوائے کرتے رہے۔ شام کو نینا اولڈ ایج ہوم گرینی کے پاس گئی تو وہ بھی ساتھ ہی اندر چلا گیا۔ ریسپشن پر نینا نے اس کے لیے "میرا شوہر" کے الفاظ استعمال کیے تو اسید کے دل نے بیٹ مس کی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا گرینی کے کمرے میں پہنچ گیا کمرے میں ناگوار بو تھی۔

"گرینی! آپ نے پھر ڈرگز لی ہیں؟"

"ضعیف بڑھیا انکار کرتی رہی۔ نینا کبھی اس کے ہاتھ سونگھتی، کبھی گردن تو کبھی کپڑے۔"

"گرینی سچ سچ بتاؤ، کس نے لا کر دی۔"

"میں نے کوئی نشہ نہیں کیا۔ میں نے چھوڑ دیا۔ ڈاک (ڈاکٹر) نے کہا چھوڑ دو، چھوڑ دیا۔"

"گرینی! پلیز جھوٹ نہ بولیں، مجھے بس یہ بتائیں کس نے لا کر دیا، سینٹری مین نے؟"

گرینی نے نہ ماننا تھا نہ وہ مانیں بالآخر نینا بلک بلک کر رونے لگی۔

"گرینی! آپ جانتی ہیں جیری اور آپ کے لیے میں نے اپنے آپ کو گروی رکھ دیا۔ اس کو (اسید کی طرف اشارہ) بیچا ہے میں نے اپنا آپ، شادی کی عمر میں، تمہارے اور جیری کے لیے میں نے کاغذی شادی کر رکھی ہے۔ اس سے لے کر ساری کی ساری رقم تم پر اور جیری پر لگا رہی ہوں خود ڈبل شفٹ کرتی ہوں تاکہ باقی کے اخراجات پورے کر سکوں۔ کیا آپ اور جیری مجھے اتنا ذہنی سکون نہیں دے سکتیں کہ ڈرگز چھوڑ دیں۔"

بوڑھی عورت بے نیازی سے اس نازک دل لڑکی کی تقریر سنتی رہی۔ اسید کا دل پگھلتا رہا۔ اسے کہیں نہ کہیں وہ اپنا ورژن لگی۔ اسی کی طرح فیملی کی ذمہ داریوں میں جکڑی ہوئی جس کے پاس اپنے لیے وقت نہیں تھا۔ جو بھی کر رہی تھی فیملی کے لیے کر رہی تھی۔ یہی سب تو وہ بھی کرتا رہا تھا۔ ملا اسے بھی کچھ نہیں تھا اور خالی ہاتھ تو نینا بھی کھڑی تھی۔ وہ دونوں ایک جیسے ٹوٹے ہوئے شکستہ لوگ تھے جو ٹوٹنے کے بعد خود ہی جڑ جاتے تھے اور معمول کے کام کرنے لگتے تھے۔

اس رات اسید نے سوچا کہ کچھ پرسنل وہ بھی پوچھ ہی ڈالے۔ اس کا وجدان کہہ رہا تھا نینا جتنا ہرٹ ہوئی ہے۔ وہ اسے سارا کچھ بتا ڈالے گی۔ اور پھر وہی ہوا اس کے ہاتھ کی بنی کافی پیتے ہوئے اس نے اسید کو سوال کا موقع ہی نہ دیا اور خود ہی شروع ہو گئی۔ ان تین مہینوں میں کئی بار اسید کو لگا کہ جیسے وہ اس کا چہرہ پڑھ لیتی ہو۔ آج بھی بات اسید کے دل میں تھی وہ خود ہی شروع ہو گئی۔

☆☆☆

گرینڈ پا کے اسکاٹش تھے، گرینی پکی ڈچ تو بات شادی تک پہنچ ہی نہ سکی، ڈیڈی چند ماہ کے تھے جب گرینڈ پا واپس اپنے وطن لوٹ گئے۔ اس حادثے کے بعد گرینی نے خود کو شراب میں ڈبو لیا۔ ڈیڈی ایسے ہی دھکے کھاتے بڑے ہوتے گئے۔ کئی بار گرینی خود ری ہیب سینٹر جوائن کرتی رہیں اور بعد میں ڈیڈی انہیں چھوڑ کر آتے رہے۔ ہر بار سینٹر سے واپسی کے چند ماہ بعد گرینی پھر سے وہی معمول اپنا لیتیں۔ مجھے یاد ہے کافی سالوں بعد اس سال ایمسٹر ڈیم میں برف پڑی تھی ممی اور ڈیڈی بہت خوش تھے۔

انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ممی بہت پیاری لگ رہی تھیں ہم سب چرچ جارہے تھے۔ میں اور مجھ سے چھوٹی بہن جیری اور گرینی ہم الگ کار میں تھے۔ ممی ڈیڈی اپنی کار میں تھے کہ برف باری کے سبب حادثہ ہوگیا۔ اس شام مرنے والے دس لوگوں میں میرے ممی ڈیڈی بھی شامل تھے۔ گرینی نے اس صدمے سے نکلنے کے لیے ایک بار پھر شراب نوشی کا ہی سہارا لیا۔ جب مجھے اور جیری کو گرینی کی ضرورت تھی وہ نشے میں دھت بے ہوش پڑی ہوتی تھیں۔ چھوٹی عمر سے ہی میں نے جیری کو اور انہیں سنبھالنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ہائی اسکول تک آتے آتے میں تین جگہ جاب کرچکی تھی۔ میں بھلے کتنی ہی کیئر کرتی لیکن جیری کو والدین کی ضرورت تھی جو میں نہیں بن سکی۔ فکر معاش، پڑھائی، گھر کے کام اور کم عمری و ناتجربہ کاری کی وجہ سے جیری کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ میں سمجھ نہیں سکی۔ جیری کا زیادہ وقت گرینی کے ساتھ گزرتا تھا اسی سبب جیری بھی شراب نوشی کی طرف مائل ہوتی گئی۔ گرینی نے اسے منع نہیں کیا بلکہ اپنی خاطر اسے بھی اسی دلدل میں گھسیٹ لیا۔ جب تک میں سمجھ پاتی حالات بہت بگڑ چکے تھے، میں خود ہائی اسکول کی اسٹوڈنٹ تھی پہلی بار جیری کو بے ہوش دیکھ کر میں خود بھی گر گئی تھی۔''

وہ یوں رو رہی تھی جیسے آج پھر جیری کو گرے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ اسید دکھی دل کے ساتھ خاموشی سے اسے سنتا رہا کہ اس وقت اسے سننا ہی سب سے اہم کام تھا۔

''ری ہیبیلیٹیشن میں تین بار جیری کو داخل کرا چکی ہوں۔ گرینی کو تو اتنی بار سینٹر میں بھیجا ہے کہ اب مجھے گنتی یاد نہیں، یہاں کا میڈیکل سسٹم مہنگا ہے اسی وجہ سے مجھے تم سے پیپر میرج کرنا پڑی۔ تم سے ملنے والی رقم کا زیادہ حصہ گرینی پر لگتا ہے لیکن اب مجھے لگ رہا ہے ضائع ہو رہا ہے۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ مجھے خود پر غصہ آتا ہے میں گرینی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتی ہوں اور کئی بار ایسا ہوا کہ مہینہ مہینہ میں گرینی سے نہیں ملی اور پھر میں خود ہی دوبارہ جوتے کھانے کے لیے پہنچ جاتی ہوں۔ کیا فائدہ میرے پیسے لگانے کا جب وہ پھر سے اسی دلدل میں گھس جاتی ہیں۔ اسی لیے مجھے ہر قسم کی شراب اور ڈرگز سے نفرت ہے۔''

''جیری کیسی ہے، اس کے بارے میں سینٹر والے کیا کہتے ہیں؟''

''جیری ابھی ینگ ہے وہ چاہے تو سینٹر سے واپسی پر اپنی زندگی کو نیا رخ دے سکتی ہے لیکن پتا نہیں کیوں بس مہینے دو مہینے بعد ہی وہ واپس اپنی دنیا میں لوٹ جاتی ہے۔ میرے پاس ممی ڈیڈی کی قبر پر جا کر رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا۔ پچھلی بار جب وہ لوٹی تو میں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے ہر طرح سے اس کا خیال رکھا تاکہ وہ یہ معمول ہمیشہ کے لیے قائم رکھ سکے لیکن وہ مجھ سے چوری پھر سے اسی دلدل میں گھس گئی۔''

''کاش میں بھی اتنی پتھر دل ہوتی کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی زندگی شروع کرلیتی۔ لیکن نہیں میری قسمت میں یہ بھی نہیں لکھا۔''

وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گئی تو اسید نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹھنڈی کافی کا مگ واپس کچن میں رکھ دیا۔ اونچی پونی ٹیل اور دھلے دلائے چہرے کے ساتھ جب وہ باہر آئی تو پہلے کی طرح مضبوط بنتا تھی۔

''سنو ہیرو! تمہاری زندگی کا ایک سرا میرے پاس ہے، اس کا انتقام میں بہت اچھا کروں گی۔ جتنی تو تمہیں دلوا ہی دوں گی، کیا یاد کرو گے۔''

''ایک بات پوچھوں برا تو نہیں مناؤ گی۔''

''مجھے معلوم ہے کیا پوچھو گے۔'' وہ مسکرائی۔

''فی الحال میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے اور تم سے میری بھی پہلی شادی ہے بھلے کاغذی ہی سہی اور کچھ؟''

''مطلب اس سے پہلے تھا؟''

''کیا؟''

"بوائے فرینڈ۔"

"ہاں تھا تو لیکن وہ بھی کمینہ نکلا اس کے دیے دھوکے نے ہر قسم کی جذباتی ریلیشن شپ سے توبہ کرا دی اور میں نے سنگل رہنے کا فیصلہ لیا تھا۔"

"اس نے کیا کیا تھا؟" اسید نے دل پر جبر کر کے یہ بھی پوچھ لیا۔

"ہائی اسکول میں اس سے تعلق بنا تھا۔ مجھے تب گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا، مجھے لگا یہ اچھا جذباتی سہارا ثابت ہوگا لیکن محض چار مہینے بعد میرے ہی گھر میں میری تنخواہ چوری کر کے، میری ہی بیسٹ فرینڈ کو لے کر وہ ایمسٹرڈیم بھاگ آیا۔ اس کے اس فعل کی وجہ سے کئی دن میرے گھر میں فاقے چلے۔ اسے معلوم تھا میرے پاس یہی رقم تھی جو سیلری سے آتی تھی لیکن پھر بھی......! خیر وہ تجربہ اچھا رہا، زندگی میں بڑے کام آیا۔"

وہ اب اس کے ہاتھ کے بنے چیز سینڈوچ کھا رہی تھی۔

"میری کہانی سنو گی۔"

"زندگی کہانی تو نہیں ہوتی۔"

"زندگی کہانی ہی ہوتی ہے نینا بی بی۔"

"یہ بی بی کیا ہے؟"

"بی بی ایک ٹرم ہے جو ہم پاکستانی ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

"لیکن بی بی تو تمہاری ماں ہے نا؟"

"اسید بے اختیار ہنسا، ہاں بی بی میری ماں بھی ہے۔"

"بس انہی کے بارے میں بتا دو میں نے محسوس کیا ہے تم اپنی ماں سے بہت پیار کرتے ہو تو بہتر ہے۔ بس انہی کے بارے میں بتا دو تاکہ بات جلدی ختم ہو جائے اور پھر میں سو سکوں۔ رونے سے میرے سر میں درد ہے۔"

"اتنا احسان کر کے سننے کی ضرورت نہیں ہے میں نہیں سناتا، بہتر ہے تم سو ہی جاؤ۔"

"نہیں نہیں تم نے خود آفر کی ہے اب میں اتنی بھی کٹھور نہیں ہوں کہ تمہارے کہنے پر بھی نہ سنوں۔"

"بابا اور بی بی جان کی میں اکلوتی اولاد ہوں ویسے مجھ سے پہلے بابا نے میرے چچا کو اپنے اولاد ہی کی طرح پالا، اتنے لاڈ اٹھائے کہ چچا کو کسی کام کے قابل نہ چھوڑا۔ بی بی جب بھی سمجھانے کی کوشش کرتیں تو بابا ان سے لڑ پڑتے۔ صاف کہہ دیتے اپنا بیٹا اٹھاؤ اور اپنے والدین کے یہاں چلی جاؤ۔ تھوڑی سی زمین تھی بابا کھیتی باڑی کرتے تھے۔ گزارا اچھا چل رہا تھا کہ چچا کی شادی کر دی اور پھر دو خاندان بن گئے۔ چچا اور تو کوئی کام کرتے نہ تھے البتہ پانچ سالوں میں بچے ان کے چار ضرور ہو گئے تھے۔ ہر سال نیا بچہ، نئی مالی مشکلات، آمدنی کم۔"

"جب تک بابا زندہ رہے جیسے تیسے کر کے دونوں گھروں کو چلاتے رہے۔ میں کالج میں تھا کہ کھیتوں میں سانپ کے ڈسنے سے بابا کی وفات ہو گئی۔ ان کے بعد چچا نے کھیتی باڑی کرنے کے بجائے زمین بیچ کر کھانی شروع کر دی کیونکہ محنت تو وہ کر نہیں سکتے تھے۔ بی بی اور چچا کی اس بات پر لڑائی رہنے لگی۔ بی بی چاہتی تھیں میرے باپ کے حصے کی زمین نہ بکنے جائے وہ مجھے ملے۔ لیکن چچا نے ان کی ایک نہ سنی۔ جس دن ہمارا آخری ایکڑ بکا بی بی کو اس رات شدید بخار ہوا۔ میں ساری رات ان کے پاس بیٹھا رہا تب انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اللہ تمہیں اتنا رزق دے کہ جو زمین بکی ہے وہ واپس خرید سکو۔ میں نے تب دل میں سوچ لیا ماں کو بیچی ہوئی زمین واپس خرید کر دوں گا۔ یاں کی زندگی سے یہ صدمہ ختم کر دوں گا۔ اتنی سمجھ تو تھی کہ پاکستان میں رہ کر اتنی بڑی رقم اکٹھی نہیں ہو سکتی اس لیے اپنے علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرح یورپ کا رخ کر لیا۔"

"وہ بھی غیر قانونی۔" نینا مسکرائی۔

"ہاں غیر قانونی، ان سالوں میں زندگی اتنی مشکل تھی کہ بہت بار اپنے فیصلے پہ پچھتایا۔ لیکن تمہاری طرح خود ہی خود کو حوصلہ دے کر کھڑا ہو جاتا

تھا کہ بی بی کی یہ خواہش تو پوری کرنی ہے، زمین تو اپنی واپس لینی ہی ہے۔ چار سال یورپ کے مختلف ممالک میں گندی ترین جگہوں پر رہ کر گھٹ گھٹ کر چھپ چھپ کر مزدوری کی۔ بہت بار گوروں نے ہماری محنت کے پیسے دبا لیے۔ ایک بار تو ایک ہوٹل کے کچرا خانے سے بریڈ اٹھا کر کھانا پڑے تھے۔ اسی مشکل دور میں فرنود کا فون نمبر مل گیا۔ اس نے کہا جہاں اتنے مشکل سفر کر کے اتنے بارڈر پار کیے ہیں نیدر لینڈ بھی آ جاؤ۔ یہاں حالات اچھے تھے، پاکستان میں گھر تو پہلے ہی تعمیر ہو چکا تھا، چچا کا خرچا اب میرے بھیجے گئے پیسوں سے چلنے لگا تھا۔ میں زمین واپس خریدنے کے لیے رات دن مزدوری کر کے پیسے جمع کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد کوئی جگاڑ لگا کر واپس جا سکوں۔ بی بی کو میری شادی کی بھی جلدی تھی پر ساتھ ہی انہیں امید بھی لگ چکی تھی کہ میں زمین واپس خرید لوں گا۔ اسی ایک حسرت کے پیچھے وہ میرا ابجر کاٹتے دنیا سے چلی گئیں حتیٰ میں ایسا بدنصیب کہ مجھے کئی دن پتا ہی نہ چلا بی بی چلی گئیں۔"

"تمہارے انکل نے تمہیں بتایا نہیں؟"

"نہیں بلکہ ان کی بیماری کا بہانہ کر کے مجھ سے پیسے منگواتے رہے۔"

"سو سیڈ، تو اس لیے تم نے ہمیشہ کے لیے یورپ سیٹل ہونے کا سوچا ہے۔"

"ہاں، پاکستان واپس جانے کا دل نہیں کرتا کوئی بہن بھائی ہوتا تو شاید واپسی کا سوچتا۔ لیکن اب میرا ابھی دل کرتا ہے کہ غیر قانونی کے بجائے قانونی طور پر یہاں کا شہری بنوں اور نارمل زندگی کا آغاز کروں۔ تم سے شادی اسی خواہش کا نتیجہ ہے میں بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں کہ کب تین سال پورے ہوں اور تمہارے ذریعے میں کب نیشنلٹی کے لیے اپلائی کروں۔"

"میں نے کہا نا نیشنلٹی تو میں تمہیں دلوا کر ہی رہوں گی، یہ میرا وعدہ رہا۔ ویسے میں سوچ رہی ہوں کاش میں بھی اکلوتی ہوتی تو کتنی آسانی سے ماضی سے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔ اب گرینی اور جیری کو میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ شدید دل گرفتہ ہو گئی۔

اسید نے اپنے اذیتوں اور مصیبتوں کی کہانی اس کے آرام کی خاطر بے حد مختصر کر ڈالی۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ یہ بھی محبت کا انداز تھا۔ سمجھ تو اسے بھی نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس کا کیسے بے اختیاری میں خیال رکھ جاتا ہے۔

☆☆☆

جگمگ کرتی چاندی کی جیولری میں چھوٹے چھوٹے نیلم جڑے تھے۔ اس نے نیلم جڑا چاند سا گول پینڈنٹ ہاتھ پر رکھ کر دیکھا تصور میں نینا کی لمبی صراحی جیسی گردن در آئی۔ چاکلیٹ، جنجر ایل (gingerale) اور کرسمس کی مناسبت سے چند مزید آئٹم شامل کروا کے اس نے گفٹ باکس بنوالیا۔ سپر اسٹور سے باہر نکلتے ہی اسے یوں لگا جیسے برف باری ہونے والی ہے اور پھر ایمسٹرڈیم میں چار سال بعد کرسمس ویک میں پہلی برف باری شروع ہو گئی۔ سارا شہر رنگ برنگی روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا اب ان روشنیوں میں برف کے ننھے منے گالے بھی گرنے لگے تھے۔ بی بی جان کے بعد یہ پہلا دن تھا اسید کو اپنے جسم و جاں میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوئی۔

"کہاں ہے تو؟" فرنود کی کال تھی۔

"مارٹ سے نکل رہا ہوں۔" اسید نے کان میں لگی بلیوٹوتھ سے جواب دیا۔

"ادھر ہی رک ہم پک کر لیں گے۔ جیسمین اور عاشر بھی ساتھ ہے۔"

"میری سائیکل؟"

"لاک کر دو کل پبلک ٹرانسپورٹ سے آ جانا۔"

عاشر کو خود سے لپٹائے تنگ زینہ چڑھ کر جب وہ چاروں اوپر پہنچے تو نینا ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"میرا شہزادہ کیا کھائے گا؟"

"اسید اس کے لیے کوئی تکلف نہ کرنا پلیز،

جیسمین نے دخل اندازی کی۔"
"یہ عاشر اور اس کے چاچو کا معاملہ ہے اس لیے کوئی نہ بولے۔ کیوں عاشر۔؟"
"لیس چچا۔"
"یار کب چوچا کہنا چھوڑو گے بولو چا!!!!!۔"
"چا!!!!!۔"
"چُوووووو، چاچو۔"
"چوچا۔"
فرنو"دا اور جیسمین دل کھول کر ہنسے۔ تجھے کیا لگتا ہے ہم نے کوشش نہیں کی، کی تھی پر وہ ایک ایک لفظ ٹھیک بولتا ہے جیسے ہی مکمل لفظ بولے چوچا پر آجاتا ہے۔ انکل بالکل پرفیکٹ بولتا ہے۔"
"دفع کرو انکل کو، اس سے چوچا ہی بہتر ہے۔"
چائے کا دوسرا کپ چل رہا تھا جب نینا اندر آئی۔ سب سے خوش دلی سے مل کر اس نے سب سے پہلے ہیٹنگ سسٹم کے مندرجات کی طرف اشارہ کیا۔"
"اسید یہ درجہ حرارت تم نے بڑھایا ہے نا۔ ایکسٹرا بل بھی تم دو گے۔"
"ابھی بڑھایا ہے وہ بھی عاشر کی وجہ سے۔"
نینا کی جیسے پہلی بار عاشر پر نظر پڑی تھی اس نے نرم مسکراہٹ اچھالی پر عاشر مشکل بچہ تھا۔
"نینا! تمہارے لیے سعودیہ سے ہم کچھ گفٹ لائے ہیں۔" جیسمین نے لانگ کوٹ اور میڈ ان پاکستان گرم سوٹ و پشمینہ شال اس کی طرف بڑھائی۔
"تمہارے لیے جائے نماز اور باقی تبرکات ہیں۔ فرنو داور جیسمین دو دن پہلے ہی عمرہ کر کے واپس آئے تھے۔"
"یہ تو بہت قیمتی اور بہت زیادہ تحائف ہیں میں آپ کو جانتی بھی نہیں تو کسی اجنبی کے لیے آپ اتنا کچھ کیسے لاسکتی ہیں؟" نینا نے جیسمین کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا۔

فرنو داور اسید نے بیچارگی بھرے انداز میں ایک دوجے کو دیکھا کیونکہ نینا ڈچ تھی تو جیسمین بھی ڈچ تھی ٹکر کا مقابلہ تھا ڈچ لوگوں کی فطرت میں لگی لپٹی رکھنا تو ہے ہی نہیں۔
"تم اجنبی ہو اس لیے یہ سمجھو یہ سب تمہارے لیے نہیں بلکہ اسید بھائی کی بیوی کے لیے ہے۔ فی الحال تم اس کی زندگی میں ہو تو تمہیں دینا پڑ رہے ہیں۔ جیسے ہی کسی پاکستانی سے پکی شادی ہوئی ہمارا پیار اس طرف شفٹ ہو جائے گا۔ اسید بھائی نے بتایا ہے تم ان کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے رہتی ہو تو تمہارا شکریہ تو بنتا تھا۔ اس لیے اسید بھائی کے ملک کی خاص ثقافت والے تحفے لائے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر رکھ لو کیونکہ ان ڈائریکٹلی ان کا احسان تم پر نہیں اسید بھائی پر ہے۔ یہ پاکستانی کلچر ہے۔"
"بہت اچھا کلچر ہے بھئی کہ شوہر کی وجہ سے بیوی کو کوئی بھی انجان قیمتی تحفے دے سکتا ہے۔"
"نینا پلیز! یہ رکھ لو۔"
اسید کی درخواست پر اس نے شکریہ کے ساتھ شاپر اپنی طرف کھسکا لیے۔ پھر اس کی نظر اسید کے تحائف پر پڑی تھی اس نے نرم و ملائم جائے نماز کھول کر اس پر ہاتھ پھیرا۔
"بہت پیارا رگ ہے۔"
"ہم اسے جائے نماز کہتے ہیں رگ نہیں۔"
"تم کون سا نماز پڑھتے ہو جو یہ تحفہ رکھ لیا ہے۔"
اس کے جملے نے اسید کو اندر سے ہلایا تھا۔ کسی عالم کی خطیب کے خطبے سے اسے اس درجہ کی ضرب نہ پڑی تھی جتنی اپنی غیر مسلم بیوی کے جملے سے لگی تھی۔ اسے نہیں معلوم باقی کا وقت وہ کیسے گفتگو میں شامل رہا لیکن دل میں فوری طور پر رب کے حضور جھک جانے کی شدید خواہش اٹھ چکی تھی۔
"کرسمس پر کہیں نہیں جا رہی ہو تو ہماری طرف ڈنر کر لیں۔ جیسمین نے جاتے ہوئے خلوص سے دعوت دی۔"

وہ چائے کے برتن دھو رہی تھی جب اسید نے اپنے موبائل پر نماز و قبلہ کے لیے ایپ انسٹال کیا۔ ایپ کی مدد سے قبلہ رخ دریافت کر کے اس نے طویل عرصے بعد مغرب کے لیے اہتمام سے وضو کیا اور نیت باندھ لی۔ وہ بیڈ پر شلوار قمیص اور شال پھیلائے وقتاً فوقتاً اسے بھی دیکھ لیتی اور اپنے سوٹ کو بھی۔ پانچ سال بعد وہ شام کی نماز پڑھ رہا تھا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اس نے دل ٹٹولا کہ نماز کہیں نینا کے دکھاوے کے لیے تو نہیں تھی۔ اسے اس خیال نے نچوڑ ڈالا۔ پوری ایمانداری سے اپنا اندر ٹٹولا تو جواب نفی میں تھا۔ اطمینان و سرور کی لہر نے جسم و جاں میں تراوٹ ڈال دی۔ اس کیفیت کو محسوس کرنے کے لیے وہ کتنی دیر جائے نماز پر خاموش بیٹھا رہا۔ نینا کے سامنے ڈانواں ڈول ہونے والا اعتماد پھر سے شخصیت کا حصہ محسوس ہونے لگا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اب کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسید نے کرسمس گفٹ باکس اس کے سامنے رکھا۔

''تم تو مسلم ہو ابھی نماز پڑھی ہے پھر کرسمس گفٹ کیوں؟''

''تم تو مسلم نہیں ہو!...... یہ تمہارے لیے ہے۔''

''تمہارے بارے میں اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر کے اپنی فیملی بنانا چاہتے ہو تو میں مشکوک ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی اب تک میں نے تمہیں بہت مہذب اور میری مقرر کردہ حدود کا خیال رکھتے پایا ہے تو مسٹر ہیرو، اپنی محنت کی کمائی کا ضیاع کیوں؟ مجھے گفٹ دینا اور اپنے لوگوں سے دلانا...... پیسے کو مجھ پر ضائع کرنا ہی ہے۔ بہتر ہے جیسمین کے لائے تحفے اور اپنا یہ بوکس اٹھا کر اپنی کبرڈ میں رکھ لو، تمہاری حقیقی بیوی کے کام آئے گا۔''

''اس کے لیے ایسی سستی چیزیں تھوڑی نہ لاؤں گا۔ یہ تمہارے لیے ہے اس لیے تم ان کو لازمی رکھو۔''

''تمہارا اصلی شادی کرنے کا ارادہ کب تک ہے؟''

''میرے بس میں ہو تو ابھی کر لوں خیر جب تک تم ہو تب تک میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

''تم مسلم تو ایک ہی وقت میں چار شادیاں کر سکتے ہو نا۔ تو کیا مسلم بیویاں آپس میں جیلس نہیں ہوتیں؟'' اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

''میں عورت نہیں ہوں اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ تم بتا سکتی ہو کہ اگر تمہارے ہوتے میں اپنی پاکستانی بیوی بھی یہاں رکھ لوں تو تمہیں کیسا لگے گا اچھا یا برا؟''

''تم میرے بہت اچھے دوست ہو آف کورس مجھے تمہارے لیے بہت اچھا لگے گا۔''

میں اس کی زندگی میں شاید آخری آپشن بھی نہیں ہوں یہ کیٹر اصرف ہم پاکستانیوں میں ہے جس کے ساتھ چار دن گزار لیں تو حق ہی بڑھا لیتے ہیں۔

☆☆☆

''او مائی گاڈ رائش (رکیش) تم۔ کرسمس مبارک۔''

''ولیم، سائی، ڈیوڈ اور جانے کون کون تھا جن کے وہ گلے لگتی گال سے گال ملاتی پیار سے مبارکیں دیتی اور لیتی پھر رہی تھی۔ اسید نے اس گھڑی کو کوسا جب اس کی آفر مان کر کرسمس کی شاپنگ کے لیے اس کے ساتھ سٹی مارٹ آیا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے کوئی انڈین پھر اس سے لپٹ گیا۔ نینا نے نرمی سے اسے پیچھے ہٹایا لیکن وہ لپٹا ہی رہا۔ اسید کی برداشت بس اتنی ہی تھی۔ اس نے پیچھے سے ہڈ پکڑ کر کھینچا اور منہ پر گھونسا مار ڈالا۔ اس کے بعد تو مارٹ میں تھیا تھیا والا رقص شروع ہو گیا۔ آنکھ کے نیچے گال پر نیل بنوائے وہ سٹی سے پلر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جبکہ نینا سکیورٹی سمیت انڈین سے بھی معذرت کرتی پھر رہی تھی۔ سکیورٹی آفیسر چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

''تمہارا شوہر شارٹ ٹیمپرڈ انسان ہے۔ میں

اسے ہر حال میں پولیس اسٹیشن بھیجوں گی۔"

"وہ شارٹ ٹیمپرڈ نہیں ہے بس غلط فہمی ہو گئی۔"

"وہ بدمزاج، غصیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ جیلس بھی ہے۔" ایک انڈین نے اپنے انڈین بھائی کی مدد کے لیے چلا کر نینا اور سیکیورٹی آفیسر کو مزید معلومات پہنچائی۔ شور شرابا اس قدر بڑھ گیا کہ کتنے ہی سارے ڈچ تمام ہجرت کر کے آنے والوں کو برا کہنے لگے۔

"ان بے کار اور گندے لوگوں کو ملک سے نکال دینا چاہیے ایک تو ہماری جابز پر قبضہ کرتے ہیں دوسرا ہمارے تہواروں پر لڑائیاں ڈال لیتے ہیں۔"

اسید ان سب کو ڈچ زبان میں تڑاتڑ لڑتے دیکھ رہا تھا وہ اکیلی ڈچ اس کا دفاع کر رہی تھی۔ اپنے لیے اس کا اتنا مضبوط اسٹینڈ لیے دیکھنا اسید کو یک گونا سکون دے گیا، رنگ و پے میں مزید بے نیازی در آئی۔

"آفیسر پلیز! گرفتار کریں اس غصیلے شخص کو۔"

وہ تیزی سے اس کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑی ہوگئی۔

"نہیں آفیسر پلیز، معاف کر دو میری اور میرے شوہر کی پہلی کرسمس ہے، یہ جیل میں ہوگا تو میں اکیلی کیسے کرسمس مناؤں گی۔" وہ پیار کرنے والی بیوی کا رول شاندار طریقے سے نباہ رہی تھی۔

"اوہ پور چائلڈ، آفیسر میں بطور سینئر سٹیزن اور استاد درخواست کرتی ہوں بچوں کو معافی تلافی کے بعد گھر جانے دیا جائے۔" نوے بانوے سالہ اماں جی کی بدولت سیکیورٹی آفیسر اپنے سامنے معافی تلافی پر راضی ہوئی۔

اسید نے فوراً ہی اپنے سامنے بازو پھیلائے کھڑی نینا کی کمر میں اپنے دونوں بازو ڈال کر ہاتھ سامنے اس کے پیٹ پر باندھے اور ہونٹ اس کے سر پر رکھ دیے۔

"ایم سوری سویٹ ہارٹ، مجھے تمہارے فرینڈ کو ہٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اپنی بیوی سے نہیں، مجھ سے سوری کرو۔ مجھے ہٹ کیا ہے۔" وہ انڈین اردو میں چلایا۔

"اگلی بار مجھے میری بیوی کے آس پاس نظر آئے تو دانت توڑ دوں گا سوری کے مارے۔"

اسید نے نینا کو چھوڑ کر مسکراتے ہوئے اردو میں یوں جواب دے کر یوں تاثر دیا جیسے سوری کر رہا ہو۔ کرسمس کا موقع تھا، رش بے انتہا تھا، اسی کا فائدہ اٹھا کر وہ ڈچ میں زوردار مشترکہ سوری پھینک کر انڈین کے چلانے کی پروا کیے بنا تیزی سے وہاں سے نکل آیا۔ اسے بھروسا تھا نینا کم سے کم اسے جیل نہیں جانے دے گی۔

☆☆☆

وہ عشرہ پڑھ چکا تھا جب نینا شاپنگ سے واپس آئی۔

"وہ سارا تماشا تم نے کیوں لگایا۔"

"کیونکہ میں ایک غصیلہ اور جیلس شوہر ہوں، اس انڈین نے بتایا تو تھا تمہیں، سنا نہیں تھا کیا؟"

"شٹ اپ، صحیح جواب دو۔"

"کیونکہ وہ تمہیں چوم رہا تھا تمہارے منع کرنے کے باوجود پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔"

پہلی بار پورے تحمل اعتماد سے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کر رہا تھا۔

"وہ میرا پرانا بے تکلف دوست اور کولیگ ہے کرسمس کے موقع پر اسے شرارت کرنے کا حق حاصل ہے۔"

"بالکل اسی طرح مجھے تمہیں پروٹیکٹ کرنے کا حق حاصل ہے۔"

"یہ بات ہے تو اپنی پروٹیکشن کے لیے مجھے پولیس بلا لینی چاہیے کیونکہ تم نے مجھے گلے لگایا، میرے پیچھے ہٹانے کے باوجود پیچھے نہیں ہٹے حتی کہ بوسہ بھی دیا۔ وجہ سے زیادہ جرم تو تمہارے کھاتے میں نکل رہا ہے، اسے میں اپنی مرضی سے کرسمس وش کرنے کے لیے گلے ملی تھی۔"

وہ سرخ چہرے کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پھنکاری۔

"میں نے پیار کرنے والے شوہر کا کردار نبھانے کے لیے ناٹک کیا تھا۔"

اس کے جھوٹ پر ضمیر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لعنت بھیجی۔ "در فٹے منہ تیرا ارانا اسید صاب۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔"

"وہ اپنی کرسمس کی ساری شاپنگ اٹھا کر اور بر لے کر کرسمس منانے کسی دوست کی طرف نکل گئی۔

ساری رات باہر ہلا گلا ہوتا رہا کہ اگلے دن کرسمس تھی۔ وہ اس سب سے بے نیاز سوتا رہا سوتا رہا۔ بیچ میں کھانے اور نماز کے لیے اٹھتا اور اس کے بعد پھر سے سو جاتا۔ کئی بار دل میں آیا کہ اسے کال کر کے دیکھے لیکن اس کے موڈ کے ڈر سے اس نے کال نہیں کی۔ حالانکہ دل و دماغ پر اس کی ناراضی سوار تھی۔

چینل سرچنگ کرتے نینا کی طرف سے اسے یکے بعد دیگرے کئی تصاویر موصول ہوئیں۔ اس نے فوراً ہی فون ہاتھ میں لے کر وٹس ایپ کھولا تھا۔

منی اسکرٹ میں مختلف مردوں عورتوں کے ساتھ گلے لگتے چومتے اور ناچتے وقت کی تصویریں تھیں۔ آخری فوٹو میں وہ سانتا کلاز کے ساتھ شمپین شیئر کر رہی تھی۔ اسید کا دل کیا موبائل دیوار پر دے مارے لیکن نیا خریدنے پر پیسے لگتے تھے اس لیے بیڈ کے درمیان پارٹیشن کے لیے پڑے بھاری بھرکم اور سخت تکیے پر گھونسے مارنے پر اکتفا کیا۔ ابھی وہ گھونسوں سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسکرین پر اس کا نام جگمگانے لگا۔

"ہیلو..... لڑکھڑاتا لہجہ بتا رہا تھا وہ کتنی پی چکی تھی۔"

"اسید! تم نے دیکھا کتنے لوگ پارٹی میں ہیں یہ بھی میرے ساتھ وجے کمار والی حرکتیں کر رہے ہیں جلدی سے آ کر ان کو بھی مارو۔ اوہ نو، یہ بوڑھا شیرف بھی زبردستی گلے لگ رہے۔ ذرا جلدی آ کر پروٹیکٹ کرو مائی پور ہزبینڈ، آؤ گے؟" وہ لڑکھڑائی

ہنسی ہنس رہی تھی۔

"نینا میں آ گیا تو ان کا پتا نہیں تمہیں ضرور جان سے مار ڈالوں گا۔" اس نے اردو میں دانت پیس کر بمشکل اس نکالی۔

"کیا کہہ رہے ہو انگلش میں بولو۔"

"جہنم میں جاؤ تم، پاگل عورت۔"

فون پرے پھینک کر چت لیٹ کر اس نے لمبے سانس لیے تاکہ مزاج قابو میں آئے۔ کتنی ہی دیر وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ فون کی بیل پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

"ہاں نودے۔"

"کیا کر رہا ہے۔"

"لیٹا ہوا ہوں۔"

"گورے پاگل ہوئے پڑے ہیں تم لیٹے ہوئے ہو۔"

"میں بھی پاگل ہی ہوا پڑا ہوں۔"

"واہ! میری جان، مبارک ہو۔ میں آ رہا ہوں پھر خوب گزرے گی مل بیٹھیں گے جو پاگل دو۔"

فرنود اس کے لیے گھر کا بنا کھانا بھی لایا تھا، بے دلی سے کھانے کے دو چار لقمے کھا کر وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

"ادھر ادھر کی چھوڑ اصل بات بتا، کیا چھپا رہا ہے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے یار، میں نے کیا چھپانا۔"

"بکواس نہ کر، لگاؤں گا چماٹ، سیدھی طرح بول کیا ہوا ہے۔"

"تیری یہ رومیو جولیٹ والی پریم کہانی ابھی تک بند نہیں ہوئی۔ تجھے کہا بھی تھا اسے چڑانے والا کوئی کام نہ کرنا، وہ کیس خراب کر دے گی۔"

"بس یار! انکل نے اصلی نکاح والا چکر چلا کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"چل اوئے ایڈا تو مظلوم آ گیا ہے۔ انکل نیک آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت نیک مشورہ دیا تھا۔

اکٹھے رہتے ہوئے انسان کا کچھ بھروسا نہیں کب بہک جائے۔ بطور مسلمان ہمیں کبیرا گناہوں کے خلاف اپنی ڈھال مضبوط رکھنی چاہیے۔"

"یار! تو جانتا تو ہے کتنے سال سے یورپ میں ہوں میں۔"

"یورپ میں ہونے میں اور ایک کمرے میں کسی خاتون کے ساتھ رہنے میں بڑا فرق ہے جگر۔ پتا ہے نا ان کی اقدار اور ہماری تعلیمات میں زمین آسمان کا فرق ہے دس دس سال اکٹھے رہ کر بچوں کے والدین بن کر بھی یہ لوگ شادی نہیں کرتے تو ایسے میں ایگریمنٹ پر نینا کے ساتھ رہنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ نینا بھی ان میں سے ایک ہے۔" فرنود نے اسید کی بات کاٹ کر اپنی تفصیلی رائے دی۔

"اب، اب کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے خوشامد کر کے اسے راضی کریں گے۔ تم سوری کرنا میں شکریہ ادا کروں گا کہ میرے جگر کو جیل جانے سے بچایا ہے۔ میں نے ایک اور بات سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ڈبل شفٹ سے تیری انکم اب اچھی ہو چکی ہے Tax payer بھی ہو، ان شاء اللہ" نیشنلٹی بھی مل جائے۔ گی تو کیوں نہ تیری شادی کی بات چلا دی جائے۔ پانچ چھ مہینے تو ہم مزاج پاکستانی لڑکی ڈھونڈنے میں لگ ہی جائیں گے۔ اس کا ایک تو یہ فائدہ ہے کہ تم نے یہ جو رومیو جولیٹ والی لو اسٹوری شروع کر رکھی ہے اس سے تمہاری توجہ ہٹے گی۔ دوسرا یہ کہ جب تمہیں نیشنلٹی ملے گی اور نینا کے ساتھ ایگریمنٹ ختم ہوگا تب تک تم اپنی گھریلو زندگی میں سیٹ ہو چکے ہو گے۔"

اسید خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا ہوا ہے کہیں نینا کی محبت میں زیادہ ڈونگی چھال تو نہیں مار لی۔"

"نہیں نہیں بھول جائے گی، ابھی اتنی دور نہیں گیا۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر انیس بھائی اور اس کی فیملی بھی سے بات کر لیتے ہیں۔"

فرنود کے جانے کے بعد گرم کپڑوں میں اچھی طرح پیک ہو کر وہ بھی اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ برف کے روئی جیسے سفید برستے گالوں میں وہ جیری کے ری ہیب سینٹر پہنچا تھا۔ گھنٹہ بھر لمبے کوریڈور میں اس کے ساتھ کبھی واک کرتے تو کبھی بیٹھ کر برف دیکھتے گزارا۔

"نینا ناراض ہے نا اس لیے نہیں آئی۔"

"تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ، وہ خوش ہو جائے گی پھر تمہیں خود لے کر جائے گی۔"

"میں کوشش کر رہی ہوں تم اس سے کہنا مجھ سے ناراض نہ ہو۔"

"وہ تم سے ناراض نہیں ہے گڑیا۔"

"وہ ہے اسی لیے تو کرسمس پر نہیں آئی۔ سب سے ملنے ان کی فیملی آئی میری فیملی سے صرف تم آئے۔" اٹھارہ انیس سالہ جیری اس سے لپٹ کر رو دی وہ سر تھپکتا رہا۔ سینٹر کی کینٹین سے جیری کے لیے گھڑی اور اس کی پسند کی ویڈیو گیم خرید کر اسے تحفہ دے کر وہ سینٹر سے نکل آیا۔

کتنی ساعتیں نہر کنارے کھڑا گرتی برف دیکھتا رہا پھر جیسے فیصلہ ہو گیا اس نے گرینی کے روٹ والی بس پکڑ لی۔ ملاقاتی کے خانے میں نینا کا شوہر لکھ کر وہ گرینی کے پاس آ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ بوڑھی گرینی اسے پہچانے گی۔ لیکن وہ اسے بطور نینا کا شوہر پہچانتی تھی۔

"نینا کے گرینڈ پا کی طرح مت کرنا پلیز۔"

وہ سر ہلا کر ان کی کرسمس بنا کر نکل آیا۔

☆☆☆

اگلے کئی مہینے ان دونوں کا آمنا سامنا نہ ہوا۔ وہ اسید کی غیر موجودگی میں اپنا روز مرہ کا استعمال ہونے والا سامان اٹھا کر لے جا چکی تھی۔ اسید نے سائیڈ ٹیبل ان دونوں کی شادی والی تصویر الٹا دی کہ آتے جاتے نظر نہ پڑے۔ ایک وہ ساتھ لے گئی تھی جو

اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے ایگریمنٹ کو ہر حال میں پورا کرے گی۔ اسی لیے اسید بھی ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ میں طے شدہ رقم کی قسط ڈال دیا کرتا۔

''ہیلو اسید! مجھے سینٹر نے مکمل کلیئر قرار دے دیا ہے۔''

جیری کی آواز میں بلا کی کھنک تھی، اسے دوران ڈیوٹی اس کی کال ریسیو ہوئی۔

''بہت مبارک ہو جیری۔''

''کب ملنے آرہے ہو مجھ سے؟''

''تم آجاؤ سٹی مارٹ۔''

''میں ابھی آرہی ہوں۔''

''آدھے گھنٹے بعد وہ اس کے سامنے تھی۔ آنکھوں کے سیاہ ہلکے مدھم ہو چکے تھے۔ اس کی شخصیت میں کچھ تھا ایسا جو اسید سے کہہ رہا تھا کہ اس کی زندگی کو نیا موڑ دے دے گا۔ اسی خوشی میں اس نے جیری کو شاپنگ آفر کر ڈالی۔

''تم باقی لوگوں کی طرح نہیں ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے، ہم تمہاری اچھائی کا ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ سینکڑوں لوگ یہاں نیشنلٹی کے لیے پیپر میرج کرتے ہیں کوئی بھی اپنے پیپر پارٹنر کے رشتوں پر جذبات نہیں لٹاتا۔ اسید، کیا تم اس پیپر میرج کو ریئل میرج میں کنورٹ نہیں کر سکتے۔ نینا کو تمہاری ضرورت ہے وہ بہت اچھی ہے میں نے اور گرینی نے اس کی زندگی کے کئی سال ضائع کیے ہیں۔ وہ ہمارے جیسی نہیں ہے وہ تم جیسا ریلیشن ڈیزور کرتی ہے۔''

''پیاری جیری! میں اور تم لوگ دو مختلف کلچر اور مذہب کے پیروکار ہیں ہم ساتھ نہیں چل سکتے۔''

''ہزاروں ایشیائی لوگوں نے یہاں شادیاں کر رکھی ہیں ان کی شادیاں بھی تو چل رہی ہیں تم دونوں کیوں نہیں چل سکتے۔''

''شاید میرے قبیلے اور خون نے میرا مزاج ایسا بنا دیا ہے کہ میں ان ہزاروں لوگوں کی طرح نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی مجھے میرے ہی مذہب اور مزاج کی چاہیے جو کسی غیر مرد کے گلے نہ لگے اور جسے کوئی غیر مرد سرعام بوسے نہ دے سکے۔''

''جیری کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔

''نینا غلط کہتی تھی کہ تم مختلف ہو۔ میرا بھی اندازہ غلط تھا کہ تم الگ ہو۔ تم وہی دقیانوسی ایشیائی مسلم ہو جو یہاں ہمارے ملک آکر یہاں کی عورتوں، دوسروں کی بیویوں، گرل فرینڈز کو بصد شوق گلے لگاتا ہے بوسے دیتا ہے لیکن اپنی بیوی کو چار دیواری میں چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے ایشیائی مردوں کی بالکل یہی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ تمہارا شکریہ تم نے میرے منہ پر بیٹھ کر بتا دیں۔ میں اب نینا کو سنبھال لوں گی۔''

''وہ جیسے آندھی طوفان کی طرح آئی تھی ویسے ہی چلی گئی ساتھ ہی اس کا نمبر بھی بلاک کر دیا۔ اسید کو دلی رنج ہوا تھا لیکن اسے غم منانے کا موقع نہ مل سکا کہ اگلے ہی دن رمضان شریف شروع ہو گیا تھا۔ ڈبل شفٹ کے ساتھ معمول سے زیادہ عبادت کو وقت دیتے رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ناقابل یقین تیزی سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆

''اسید! کل گھر میں افطار پارٹی ہے کوئی اور پروگرام مت بنانا میں تمہیں اسلامک سینٹر سے ہی پک کرلوں گا۔''

''انیس بھائی! اتنی دیر میں آپ کے گھر میں کیا کروں گا شام میں ہی نہ آؤں؟''

''نہیں کل دراصل ایک فیملی سے بھی تمہیں ملانا ہے افطار سے پہلے کا وقت ٹھیک رہے گا۔ ہوسکتا ہے تم دونوں پارٹیز کی بات طے ہو جائے یعنی تمہیں بھی لڑکی اور اس کی فیملی پسند آجائے، انہیں بھی تم پسند آجاؤ۔''

وہ انڈین مسلم فیملی تھی اسلامی شعار و تعلیمات کی مکمل پابند، رتیہ میں بھی انکار کرنے کے لیے کوئی نقص نہیں تھا۔ انہوں نے وہیں رشتہ منظور ہے کہہ دیا لیکن فرنود اور جیسمین نے اس کی کیفیت دیکھتے

ہوئے اس کی طرف سے چند دن کا وقت لے لیا تو اسے یک گونہ سکون ملا تھا۔

''انیس! وہ گوری اسید کے ساتھ نہیں رہتی کل کو گورنمنٹ کوئی مسئلہ تو نہ کھڑا کرے گی میرا مطلب ہے نیشنلٹی کے لیے اپلائی کرتے ہوئے۔''

''امی! میں نے وکیل سے بات کی تھی ہم اس گوری سے بھی دوبارہ بات کریں گے دیکھتے ہیں کوئی نہ کوئی جگاڑ تو لگا ہی لیں گے۔ ویسے وکیل کے مطابق وہ اسید کو نیشنلٹی دلانے کے لیے ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہے۔''

''چلو شکر ہے ورنہ مجھے تو ان گوری چمڑی والوں کا کوئی اعتبار ہی نہیں۔''

''آنٹی! انہیں ہم ایشیائی لوگ کا اعتبار نہیں۔ انیس کی بیوی نے پھلجڑی چھوڑی تو سب ہی ہنس دیے۔

☆☆☆

''وہ ڈیوٹی کے لیے نکل رہا تھا جب رقیہ کے والد و والدہ کی کال آئی۔''

''چاند مبارک بیٹا۔''

''عید ہوگئی؟''

''جی ابھی سعودی عرب میں اعلان ہوا ہے۔ (اکثر یورپی ممالک میں مسلم کمیونٹی سعودی اسلامی تاریخ فالو کرتی ہے۔)

''اچھا۔''

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے بیٹا۔''

ان کے سوال پر اسے خیال آیا کہ خیر مبارک کہنا تھا اور ان کو بھی جوابی مبارک دینی تھی۔ آج صبح ہی تو فرنود اور جیسمین نے اس سے پوچھ کر رقیہ کے گھر ہاں کا پیغام بھیجا تھا۔

''صبح ہماری طرف آپ کی دعوت ہے بیٹا، دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔''

''جی میں وعدہ نہیں کرتا، کوشش کروں گا چکر لگ جائے۔''

عید کی نماز کے بعد وہ لیٹا تو بی بی جان کی یاد سر پر سوار تھی ویسے بھی جب دل روٹھا ہوتا، اسے ماں زیادہ ہی یاد آتی تھی۔ تکیہ منہ پر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے تکیہ ہٹایا تو ساکت رہ گیا۔ جیسمین کا لایا ہوا پاکستانی برانڈ کا سوٹ، گلے میں نیلم جڑا چاندی کا پینڈنٹ اور کلائی میں سرخ کانچ کی چوڑیاں۔ یہ تو کوئی پاکستانی نینا تھی۔

''اسے دیکھ کر وہ بے اختیار بیڈ سے کھڑا ہوا وہ شال میں الجھتی سنبھلتی اس کے سامنے آئی اور پھر اس کے گلے لگ گئی۔ اسید نے اپنے گرد بازو بالکل نہ اٹھائے پر نینا کو پروا نہیں تھی۔

''آئی لو یو۔''

''اس کے لبوں پر کئی مہینوں سے روٹھی مسکراہٹ پورے طمطراق سے ابھری۔

''ذرا زور سے کہو۔''

''آئی لو یو۔''

''اب کے اس نے بھی بازوؤں کا حصار باندھ لیا۔''

''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا خود اظہار محبت کرنے والی کسی بے باک لڑکی سے مجھے محبت ہو جائے گی۔ مجھے اس لمحے سے پہلے تک یہی لگتا تھا کہ عورت اظہار محبت کرتی ہوئی بے حد بے حیا لگتی ہے۔''

وہ اصول پرست لڑکی اس کے سامنے دھواں دھار روتی رہی۔ الٹی سیدھی لی شال کندھوں سے گر کارپٹ پر جا پڑی۔ اسید نے اٹھا کر پاکستانی اسٹائل میں اس کے سر پر اوڑھا کر بائیں کندھے پر ڈال دی۔''

''مجھے شال اوڑھنی نہیں آتی۔''

''میں سکھا دوں گا۔ وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔''

''تم نے کبھی بتایا کیوں نہیں کہ تمہاری تو میں شرعی بیوی ہوں۔''

شربتی آنکھوں میں شکوؤں کی سرخی تھی اسید کی آ

نکھوں میں نمی ابھری۔

"تمہیں یہ ٹرم کیسے پتا چلی۔"

"جب اسلام قبول کیا تب اسلامک سینٹر سے پتا چلا۔"

وہ شاکڈ ہوا تھا۔

"نینا! تم نے اسلام قبول کر لیا۔"

"نینا نہیں سکینہ۔ عید کی نماز پر اسلامک سینٹر میں حسین اور رقیہ کی فیملی ملی تھیں۔ وہیں سے پتا چلا تم رقیہ سے شادی کرنے والے ہو۔ تب سوچا ایک بار تو تمہیں ضرور بتا دوں کہ تم میری زندگی میں آنے والے بھلے پہلے مرد نہیں ہو لیکن پہلے مرد ضرور ہو جس سے میں نے دل سے محبت کی ہے۔ تم نے جیری سے بالکل ٹھیک کہا تھا ہمارا کلچر ایک جیسا نہیں ہے ہم دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں اس لیے میرا لائف اسٹائل تم سے الگ تھا۔ تم لوگ جن حدود و قیود کے قائل ہو وہ ہماری دنیا میں نہیں ہے اس لیے جیسا تم نے جیری سے کہا تھا ویسا ہی ہے۔"

"میں شرمندہ ہوں۔"

"نہیں تم مجھے بولنے دو۔ تم ایک بہت اچھے انسان اور اچھے مسلمان ہو میں نے لاکھ چاہا کہ میں تم سے محبت نہ کروں لیکن یہ ہو گئی۔ مجھے پیار کے اس آزار میں ڈالنے والے بھی تم ہو۔ وجے کمار کو اردو میں جو تم بول کر آئے تھے وہ اس نے مجھے بعد میں ڈچ میں ترجمہ کر کے بتا دیا تھا۔" اسید پھیکا سا مسکرایا۔

"وہ جو ایلی کی پارٹی میں میں نے تمہیں کال کی تھی تمہارے اردو جملے کا بھی میں نے ڈچ میں ترجمہ کروایا تھا۔ اب تم خود کہو میں تم سے پیار نہ کرتی تو کیا کرتی۔ اسی لیے میں نے اسلامک سینٹر جانا شروع کیا۔ چار مہینے ہو گئے بنیادی اور اسلامی سماجی تعلیم سیکھتے ہوئے۔ رمضان شریف میں باقاعدہ کلمہ پڑھا ہے۔"

"تمہیں بہت مبارک ہو سکینہ۔"

"اس کا اجر تمہیں جائے گا، تمہیں پتا ہے جس دن میں نے اپنے سامنے وہاں نکاح ہوتے دیکھا بالکل اسی طرح جس طرح ہمارا ہوا تھا تو مجھ میں آ کر سکالر سے سب کچھ پوچھ ڈالا۔ جب مجھے پتا چلا میں تمہاری صرف کاغذی بیوی نہیں ہوں مجھ پر جو گزری تمہیں بتا نہیں سکتی۔" ایک بار پھر اس کے آنسو گود میں دھری سرخ چوڑیوں پر گرنے لگے۔ اسید نے دائیں ہتھیلی سے اپنی آنکھ کا کونا بھی صاف کیا۔

"اسید میری طرف سے تمہیں شادی کی اجازت ہے۔ تم رقیہ جیسی پاک باز بیوی ہی ڈیزرو کرتے ہو۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گی اور کبھی طلاق بھی سائن نہیں کروں گی۔ تمہیں میرے نام کا حوالہ بھلے برا لگے۔ کیونکہ میں رقیہ جیسی پاک باز کبھی بھی نہیں ہو سکتی، ہائی سکول والا معاملہ بتایا تھا نا۔"

"سکینہ کو نینا کا ماضی یاد رکھنے کی قطعی اجازت نہیں۔ تم سکینہ ہو میری بیوی شرعی اور یہاں کے قانون کے مطابق قانونی بیوی۔ تمہارے ہوتے کسی رقیہ کی گنجائش نہیں نکلتی۔"

"کہیں نہ کہیں تو گنجائش ہے جب ہی تو تم نے ہماری شادی کی فوٹو الٹی کر رکھی ہے۔" وہ خفا ہوئی۔

"یہ تو تمہاری یاد سے بچنے کے لیے ایسے رکھی تھی۔"

"باتیں مت بناؤ، تمہیں مجھ سے محبت تھوڑی ہے جو میری یاد آئے گی۔"

"یہ مت کہو کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ تم نے تو آج سادہ سا اظہار کیا ہے میں نے تو ٹی مارٹ میں گھونسوں مکوں کی چھاؤں میں ناقابل فراموش مضبوط اظہار کیا تھا۔"

اس کی بات پر وہ بے ساختہ کھلکھلائی تو چوڑیاں بجنے لگیں۔ دونوں نے ایک ہی وقت میں چوڑیوں کو دیکھا۔

"پاکستان میں عید پر خواتین چوڑیاں ضرور پہنتی ہیں۔" "اسی لیے تو میں نے پہنی ہیں پر تم ابھی تک عید مبارک نہیں کہا۔"

"یار! تمہیں اچھا پتا چلا ہے کہ میری شرعی بیوی ہو۔ بیویوں والے شکوے ہی ختم نہیں ہو رہے۔ اب غور سے سنو۔ عید مبارک، عید مبارک"

☆☆

صبا واجد

اپنا اپنا کرنا اپنا اپنا بھرنا



اے سی کی ٹھنڈک اور ریڈ ڈفیوزر کی بھینی بھینی سی خوشبو کے ساتھ نفیس سے گلاس ٹیبل کی ٹاپ پر رکھے کباب، سموسے، کیک، بسکٹس وغیرہ جیسے دیگر لوازمات کی اشتہا انگیز خوشبو نے پورے ڈرائنگ روم کا احاطہ کر رکھا تھا۔

ٹیبل کے ارد گرد رکھے مخملیں صوفوں پر براجمان وہ دونوں خواتین مسکراتے ہوئے آپس میں محو گفتگو تھیں۔

"ماشاء اللہ خدیجہ! گھر کی سجاوٹ تو بہت خوب صورت کروائی ہے" خدیجہ بیگم کی فرسٹ کزن سمیرا بیگم نے کباب سے انصاف کرتے بیش قیمت ڈرائنگ روم میں چاروں اطراف نظر دوڑاتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔

"بس یہ تو سب اللہ کا کرم ہے! جب بھی احمد چھٹیوں کے دوران پاکستان کا چکر لگاتا ہے، کوئی نہ کوئی تبدیلی کروا کے جاتا ہے گھر کی۔" خدیجہ بیگم نے اپنے اکلوتے بیٹے کا ذکر کیا جو ہائر ایجوکیشن کے ساتھ جاب کے لیے آسٹریلیا میں مقیم تھا۔

"اوہ اچھا اچھا، ماشاء اللہ! شادی کب تک کرنی ہے احمد کی؟" سمیرا بیگم نے بے ساختہ پوچھا۔

"ان شاء اللہ اس سال کے اندر اندر کر دینی ہے۔ بس کوئی اچھی سی لڑکی مل جائے تو!" وہ مبہم سا مسکرائیں۔

"ہاں بالکل! اتنا پیارا، شریف اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔ اس کے لیے کوئی اپنی ہی جانے والی یا دیکھی بھالی ہوئی لڑکی ڈھونڈنا۔ کیونکہ تمہیں پتا ہی ہے آج

کل خاندان سے باہر رشتے کرنا کتنا پرخطر کام ہے" سمیرا بیگم نے اپنی جانب سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"میں دیکھ رہی ہوں ارد گرد۔ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ ملتا ہے، فوراً سے کردوں گی۔" انہوں نے سادگی سے کہتے پلیٹ سے ایک بسکٹ اٹھایا۔

"لڑکی بالکل ہمارے احمد ہی کی طرح کوئی اونچی لمبی اور گوری رنگت والی ڈھونڈنا، تاکہ ایک دفعہ سب لوگ دیکھیں تو کہیں کہ کیا جوڑی بنی ہے۔" ان کا اندازِ گفتگو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔

البتہ سمیرا بیگم کے دائیں جانب تب سے خاموش بیٹھی خدیجہ بیگم کی بیٹی جیا جس کی نظر تمام لوازمات پر تھی، کے ذہن میں ایک سرخ بتی جلنے بجھنے لگی۔

☆☆☆

"یار میری معصوم امی جان! آپ سمیرا آنٹی کا اشارہ ٹھیک سے سمجھی نہیں ہیں۔ انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی بیٹی علشبہ کے رشتے کی بات کی ہے۔" سمیرا بیگم کے جانے کی دیر تھی، وہ صوفہ پر آلتی پالتی کیے کافی رغبت سے سموسہ کھانے کے ساتھ ساتھ ماں کو بریفنگ دے رہی تھی۔

"اچھا! مجھے تو ہمیشہ سے یہی لگتا تھا کہ سمیرا اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھانجے سے کرے گی تو اس لحاظ سے میرا نہیں خیال کہ اُس نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔" انہوں نے فوراً سے اپنی اکلوتی صاحبزادی کی قیاس آرائی کی نفی کی۔

"نہیں امی! آپ کو نہیں پتا، مجھے اچھے سے سمجھ میں آگئے ہیں آنٹی کے اشارے۔ کیونکہ کچھ دن پہلے علشبہ نے بھی باتوں باتوں میں مجھ سے احمد بھائی کے رشتے کے متعلق پوچھا تھا۔" اُس نے سموسے کا آخری نوالہ نگل کر جوس کا گھونٹ بھرتے اپنی بات پر سچ کی مہر ثبت کی۔

"ویسے ہے تو علشبہ بھی کافی اچھی لڑکی۔ اگر ایسی بات ہے تو میں ایک دفعہ سمیرا سے بات کروں رشتے کی؟" خدیجہ بیگم فوراً سے پرجوش ہوئیں۔

"ہاں! مجھے بھی کافی پسند ہے علشبہ۔ بس کھی ہے سمیرا آنٹی جیسی جھوٹی اور دوغلی قسم کی تو بالکل بھی نہیں لگتی۔" جیا نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"ایسی بات نہیں کرو بیٹا، کسی کی پیٹھ پیچھے ایسا نہیں کہتے، غیبت کہلاتا ہے۔" انہوں نے فوراً سرزنش کی۔

"اوکے۔ میں کچھ نہیں کہہ رہی" جواباً اُس نے ہوا میں ہاتھ اٹھاتے کندھے اچکائے۔

"تمہارے ابو آتے ہیں تو شام کو اُن سے بھی مشورہ کر لیتے ہیں"

"اوکے۔ کل ٹیلر سے اپنا نیا سوٹ بھی لے آئیں۔ اب تک تو سلائی ہو چکا ہوگا وہ پہن لیجیے گا اور پھر اگلے ہفتے چلی جائیں، سمیرا آنٹی کی طرف رشتے کی بات کرنے" اُس نے یکا یک سے پلان ترتیب دیا تو خدیجہ بیگم اُس کی گرم جوشی پہ کھل کر مسکرا دیں۔

☆☆☆

"جس طرح آپ نے کہا تھا بالکل ویسا ہی سلائی کیا ہے میں نے، لیکن پھر بھی آپ ایک دفعہ اچھے سے دیکھ لیں۔ اگر کوئی کمی بیشی ہے تو مجھے بتا دیں میں فوراً سے ٹھیک کر دوں گی۔" درزن نے سامنے بیٹھی خدیجہ بیگم سے کہا۔

"نہیں، بالکل ٹھیک سلائی کیا۔"

"السلام علیکم۔" اس سے پہلے وہ بات مکمل کرتیں درزن کی کرائے دار فرحانہ اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو فرحانہ" درزن نے خوشدلی کا مظاہرہ کرتے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"کیا حال ہے خدیجہ آپا؟" فرحانہ اُن سے ہمکلام ہوئی۔

"اللہ کا شکر۔" خدیجہ بیگم مبہم سا مسکرا دیں۔

"یہ آپ کا سوٹ ہے آپا؟" فرحانہ نے

سامنے پھیلے خوب صورت سے قیمتی سوٹ کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہمم! بہت خوب صورت ہے'' تعریفی کلمات کے بعد وہ سوٹ کو ہاتھ میں لے کر جائزہ لینے لگی۔

''بس انہی چیزوں کے حسد میں ہی تو آپ کی کزن سمیرا بلاوجہ آپ کے متعلق بری باتیں کہنے سے باز نہیں آتی۔'' درزن نے سوٹ سمیٹ کر شاپر میں ڈالتے ہوئے افسوس سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' خدیجہ بیگم نے اُس کی بات پر ٹھٹک کر اُسے دیکھا۔

''بس آپا اب کیا بتاؤں! جب بھی سمیرا آتی تھی آپ کے بارے میں یہی کہتی تھی کہ آپ لوگوں کو ٹھیک سے چار وقت کی روٹی کے لیے بھی پیسہ میسر نہیں۔''

اب تو کافی دن ہو گئے ہیں آئی نہیں، لیکن پچھلے مہینے کہہ رہی تھی کہ جب سے آپ کا بیٹا احمد باہر گیا ہے، آپ لوگوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں اور...... '' درزن نے بات ادھوری چھوڑی۔

''اور؟'' انہوں نے بے ساختہ استفسار کیا۔

''آپا بات تو بہت غلط کی تھی اس نے ویسے۔ کہہ رہی تھی کہ اب احمد تو اتنے کم عرصہ میں اتنا زیادہ پیسہ کما نہیں سکتا اس لیے خدیجہ نے ناجائز کاموں سے اتنی جلدی پیسہ بنایا ہے۔ اب آگے آپ خود سمجھدار ہیں کہ کتنی غلط بات کہہ ڈالی تھی اُس نے۔'' درزن نے تاسف سے گہرا سانس لیا۔

''بس اب انسان کیا کہے، لوگ بھی آج کل حسد میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ کچھ بھی کہنے سے پہلے ایک دفعہ سوچتے تک نہیں۔'' فرحانہ نے افسردگی سے کہا۔ اس بات سے بے خبر کہ کسی کا دل بہت بری طرح سے ٹوٹا ہے۔

''اچھا، میں اب چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔'' وہ بہ مشکل سائیں سائیں کرتے کانوں کے ساتھ ٹوٹا دل سمیٹتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اُنہوں نے سوٹ کا بیگ تھامے من من بھر کے قدموں کے ساتھ مین گیٹ کا رخ کیا۔ اطراف میں چلنے والی لڑکیوں کی سلائی مشینیں اور خوش گپیوں کی نسوانی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ: جب کوئی بات ''اچھی یا بری'' جیسی بھی ہو، کسی اور کے سامنے آپ کے منہ سے نکل جائے تو پھر وہ بات صرف آپ کی نہیں رہتی، وہ سب کی ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

''آپ نے جانا نہیں سمیرا آنٹی کی طرف رشتے کی بات کرنے؟ رمضان کا مہینہ ختم ہونے میں بارہ دن رہ گئے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں آپ اِن بارہ دنوں میں یہ کام کر لیں۔'' جیا نے چاول کا چمچ منہ میں ڈالتے اپنی رائے دی۔

اس وقت وہ دونوں لنچ کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

''نہیں بیٹے! ہم اُدھر رشتہ نہیں کریں گے۔ وہ ہماری طرح کے لوگ نہیں ہیں۔ اور عید کے بعد ہم اس سلسلے کے متعلق سوچیں گے۔ تب تک احمد بھی آ جائے گا، اُس سے بھی تفصیل سے بات ہو جائے گی۔'' اُنہوں نے اپنی ازلی طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اُن کے طرز عمل میں تین دن پہلے ہونے والی بات کا شائبہ تک نہ تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے نا؟'' جیا چاول چباتے دفعتاً چونک کر ماں کو دیکھا۔

''ہاں بیٹا! سب ٹھیک ہے۔'' وہ مختصر جواب دے کر اپنی پلیٹ پہ جھک گئیں، جو اس بات کا اعلان تھا کہ بس اب مزید کوئی سوال نہیں۔ جواباً جیا نے بھی اور کچھ نہیں پوچھا وہ اپنی ماں کو اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتیں۔

ضروری نہیں ہر کوئی معاف کرنے کے بعد آپ کو گلے ہی لگائے۔ کچھ لوگ معاف کرنے کے بعد دور رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

☆☆

سنیعہ عمیر

سنگ ریزہ

مکمل ناول

دفتر کی کرسی پر بیٹھے اس نے نظر گھما کر لکڑی کی چھتوں اور ان سے لگے نوکیلے پنکھوں کو دیکھا۔ اسے آج پھر کام کرتے ہوئے دیر ہوگئی تھی۔ یہ مکان پہلے بھی گھر تھا اور اب اس کا دفتر ہونے کے باوجود کئی لوگوں کا گھر ہی تھا۔ اس نے پھر سے فائل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اتنے میں ایک گارڈ دوڑتا ہوا پہنچا۔

''پچھلے دروازے پر کوئی لڑکی آئی ہے۔ بہت زور سے دروازہ پیٹ رہی ہے۔'' گارڈ نے بوکھلا کر کہا۔ اس کو اجنبیوں کے لیے دروازہ نہ کھولنے کی سخت ہدایات تھیں۔

حماد جھٹکے سے کرسی سے اٹھا۔

''فرنٹ گیٹ سے تین آدمی بلواؤ اور باقی گارڈز کو کہو کہ الرٹ رہیں۔ یہ اندر گھسنے کی چال بھی ہوسکتی ہے۔''

وہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ راستے سے اس نے انچارج خاتون نجمہ کو بھی ساتھ لے لیا۔

اس گھر کی لوکیشن خفیہ تھی یہاں پر کسی کا خود سے آجانا خطرے کی علامت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ راہداری سے باہر نکل کے کھلے حصے میں آیا۔ وہ دروازہ پیٹنے کی آوازیں سن سکتا تھا۔ کوئی ایسے زور سے پچھلا گیٹ پیٹ رہی تھی۔ جیسے زندگی اس دروازے کے کھلنے پر ٹکی ہو۔ حماد نے گیٹ کے سوراخ سے دیکھا۔ بکھرے بالوں والی وہ لڑکی نڈھال ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

''کون؟ کدھر سے آئی ہیں۔'' حماد نے سوراخ سے پوچھا۔

لڑکی نے آواز سن کر ہی ہمت ہار دی۔ وہ وہیں گیٹ کے سامنے اوندھی گر گئی۔ حماد نے سر اٹھا کر چھت والے گارڈ کی طرف دیکھا۔ گارڈ نے سب کلیئر ہونے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس اندھیری رات میں باہر ایک فوج بھی چھپی ہو تو کسی کو خبر ہونا ممکن نہیں تھا۔ حماد کے لیے مشکل صورت حال تھی۔

''گیٹ کھولیں۔'' حماد نے آرڈر دیا۔

نجمہ گیٹ کھول کر باہر نکلی اور اوندھی گری لڑکی کو کندھے سے ہلانے لگی۔

''اس کا تو خون نکل رہا ہے۔'' نجمہ نے اپنی ہتھیلی پر لگا ہوا چپچپا خون دیکھ کر ہتھیلی واپس کھینچ لی۔ پھر اس نے قمیص کے اندر جھانکا۔ ''ساری کمر نیل و نیل ہے۔ بہت برا مارا ہے کسی نے۔''

☆☆☆

دوسرا دن تھا لڑکی ہوش میں آئی تھی پھر بے ہوش ہوگئی تھی۔ مرہم پٹی پہلے کر دی گئی تھی۔ اب بڑے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ وہ لڑکی کو چیک کر رہے تھے۔ حماد دروازے کے باہر کھڑا سن رہا تھا۔

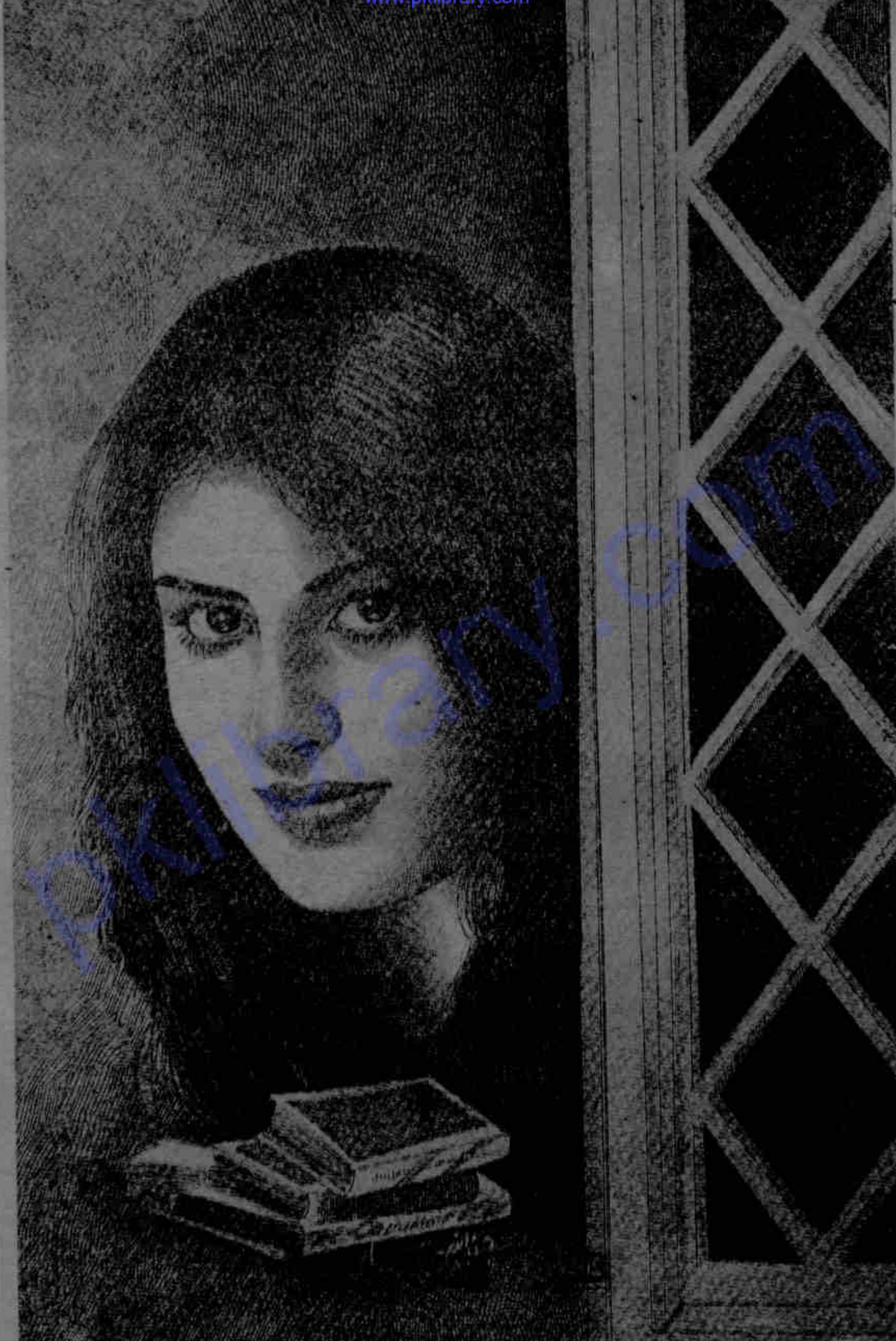
''اتنی چوٹ کیسے لگالی؟'' ڈاکٹر پیار سے کہہ رہا تھا۔

''عمر کتنی ہے؟'' ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

لڑکی کچھ نہ بولی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''اب صحت پکڑنے کے لیے اچھی خوراک لینی ہوگی۔ بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے؟ میں بنادوں گی۔'' نجمہ نے اس کے لمبے بال سہلائے۔

اب حماد کی برداشت کے باہر تھا۔ وہ دروازہ



سرکا کر اندر آ گیا۔

"کہاں سے آئی ہو؟ اس جگہ کا کیسے معلوم ہوا؟" حماد جانتا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ زخموں سے نہیں ہے اس سے ہے جس نے اس بری طرح مارا ہے۔

اب لڑکی حماد کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اس کے تاثرات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ حماد کی ہر بات سمجھ رہی ہے۔

"مجھے بتاؤ۔ کس نے مارا ہے؟ کیا وہ جانتے ہیں تم یہاں ہو؟ میں تمہیں ان سے بچا لوں گا۔ لیکن تمہارے بارے میں جانے بغیر میں تمہیں یہاں پناہ نہیں دے سکتا۔" حماد نے نرمی سے کہا۔

لڑکی جواب تک شاک میں تھی رونے لگی۔ وہ گلے سے عجیب سی آوازیں نکال کر روتی جا رہی تھی۔

"ڈرو نہیں یہ بڑے صاحب ہیں یہ سب سنبھال لیں گے۔ چلو شاباش بتاؤ۔ تمہارا نام کیا ہے؟" نجمہ نے محبت سے اسے لپٹانا چاہا۔

لڑکی نے انگلی اٹھا کر اپنے منہ کھول کر اپنی حلق کی طرف اشارہ کیا۔

"آں آں۔" اور نفی میں انگلی ہلائی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

جھنڈا پکڑنے کی ذمہ داری عروش کی تھی جو عین موقع پر غائب تھی۔ آڈیٹوریم کے باہر پوری کلاس لمبی قطار بنائے کھڑی تھی اور انچارج جھنڈا پکڑے اس کی منتظر تھیں۔ تب باتھ روم کی سمت سے دوڑتی مہمانوں سے ٹکراتی عروش نظر آئی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور قطار کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"تم نے لیٹ ہونے کی روایت چھوڑی نہیں۔ ابھی میں جھنڈا کسی اور کو پکڑانے لگی تھی۔" انچارج نے خفگی سے کہا۔

آج ان کی کونوو کیشن تھی اس لیے وہ اس پر زیادہ غصہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"میں دیر نہیں کرتی۔ میں بس عین وقت پر پہنچتی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں میری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

عروش نے کالج کا جھنڈا دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سب کے سروں سے بلند کیا۔ یہ خود اعتمادی اس میں اس لیے بھی کیونکہ زندگی نے اس کو خوش قسمت بنایا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے اردگرد والوں کا لکی چارم تھی۔ مشکلیں اس تک پہنچنے سے پہلے ہی کسی ان دیکھی شیلڈ سے ٹکرا کر پلٹ جاتی تھیں۔ اس نے اپنی بائیں طرف کھڑے صمد اعجاز کو مسکرا کر دیکھا۔ صمد نے کالج مونوگرام والا جھنڈا پکڑ رکھا تھا۔ جو کلاس کے سیکنڈ بیسٹ اسٹوڈنٹ کو ملتا تھا۔ عروش کی مہربانی سے پچھلے پانچ سال وہ سیکنڈ رہا تھا۔ پیپرز میں اس کے نمبرز زیادہ آ بھی جاتے تو بھی وہ باقی معاملوں میں کبھی عروش جیسا نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ وہ دوسروں کی طرح اس کے جادو کا دیوانہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ غور کرتا رہتا تھا کہ اس میں آخر ایسا کون سا سحر ہے جو ہر کسی کو اس کا بھنور اپنا دیتا ہے۔

"چلو میوزک شروع ہوتے ہی اینٹری ہے۔" انچارج نے کہا۔

آڈیٹوریم میں ایک طرف والدین اور فیملیز بیٹھی تھیں اور دوسری طرف اسٹوڈنٹس۔ میوزک شروع ہوا تو اپنے ٹیچر کے پیچھے وہ سارے دو قطاروں میں داخل ہوئے۔ وہ کالے گوٹ اور اجلے چہروں کا دن تھا۔ آج ڈگری پا کر وہ عملی زندگی میں قدم رکھنے والے تھے۔

"پانچ سالہ روایت توڑتے ہوئے اس سال گولڈ میڈل حاصل کرنے والی ایک لڑکی ہے۔ عروش حیدر۔" پرنسپل صاحب نے ڈگریاں ملنے کے بعد اناؤنس کیا۔

تالیوں کے اٹھنے والے شور میں صمد اعجاز کی باہمت تالیوں کی آواز بھی تھی۔ جو محض چند نمبروں سے ایک بار پھر دوسری پوزیشن پر رہ گیا تھا۔ عروش نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر سب سے پہلے بائیں طرف موجود اپنے والدین کو دیکھا اور ایک فلائنگ کس ان

کی طرف بھیجی۔ اس کی سبز پتھر والی موٹی انگوٹھی سب نے دیکھی۔ اور یہ بھی عروش ہمیشہ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ یہ نہیں سوچتی تھی کہ دنیا کیا کہے گی۔ وہی کرتی تھی جو اسے صحیح لگتا تھا۔ عروش نے سونے کا وزنی میڈل سینے پر سجایا اور مائیک کے سامنے پہنچ گئی۔ سب خاموش تھے اور اس چنچل لڑکی کو سننا چاہتے تھے۔

"مجھے میری زندگی کی سب سے ناقابل فراموش نصیحت میرے کزن نے کی تھی۔ تب جب میں محض آٹھ سال کی تھی۔ ان نے کہا تھا کہ پتھر دنیا کے سب سے بڑے دانشور ہوتے ہیں۔ جو صدیوں زمین میں رہ کر اس کے اثرات اور ثمرات جذب کر لیتے ہیں۔ پتھر کو پہننے دیا جائے تو وہ جوہر بن جاتا ہے۔ ہر پتھر کی اپنی خاصیت ہوتی ہے۔ انسان کا کام ہے تراشنا۔ اس دن میں نے اپنے اردگرد موجود ہر شخص کو ایک پتھر سمجھ لیا۔ جو یا تو تراشا جا چکا ہے یا میرے ہاتھوں تراشے جانے کا منتظر ہے۔ اس دن سے ہر سمت واضح ہوگئی۔ احساس ہوا کہ ترقی کا راستہ ڈھونڈا نہیں بنایا جاتا ہے۔ اتنے اچھے ادارے سے پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ میں اور میرے تمام ساتھی دنیا کے اس پتھریلے راستے میں اپنا راستہ ضرور تراش لیں گے۔"

عروش نے کہا اور اپنا ہاتھ سر کی طرف لے گئی۔ پھر اس نے اپنی چوڑی سیاہ ٹوپی ہوا میں اڑائی۔ والدین کی تالیوں اور ہوا میں بے فکری سے پھینکی اسٹوڈنٹس کی ٹوپیوں میں سب نظم و ضبط بکھر گیا۔

تقریب ختم ہوئی مہمان خصوصی کو علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا۔ پھر تو اتنی گہما گہمی ہوئی کہ کسی کو کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اصل ڈگریاں انہیں بعد میں ملنی تھیں۔ اس دن انہیں ڈگری کی جگہ ربن لگا بہت خوبصورت گتے کا لمبوترا ڈبا ملا تھا۔ جس میں ان کی کلاس فوٹوگراف تھی۔ محفل میں بے فکری آگئی۔ پھر تو ہر ایک نے ہر طرح سے تصویر کھینچی۔ ٹوپی پہن کے ٹوپیاں اڑائے۔ پاؤٹ بنا کر جمگھٹے میں، والدین کے ساتھ اکیلے اور حتی کہ مہمان خصوصی کی کرسیوں پہ بیٹھ کر۔ آخر کار حیدر زمان کو ہی کہنا پڑا کہ اب گھر چلیں۔ انہیں ایک تقریب سے دوسری تقریب میں جانا تھا۔ ان کے مرحوم بھائی سکندر زمان کی بیٹی سومارہ کا نکاح تھا۔ جس کے میزبان بھی وہ خود تھے۔

"ٹھیک ہے، میں اپنے فرینڈز کو بائے کہہ کر آتی ہوں۔" اس نے باپ سے کہا اور اپنی ساری سہیلیوں کو باری باری گلے لگانے لگی۔

"ارے دیکھو میری فوٹوگراف کتنی اچھی آئی ہے۔ شکر ہے۔ میں فریم کرواؤں گی۔"

ایک سہیلی نے اپنا ڈگری نما لمبوترا گتے کا ڈبا کھول کر اپنی تصویر دیکھی۔

دیکھا دیکھی باقی بھی اپنی گروپ فوٹو نکال کر دیکھنے لگے۔ تب عروش نے بھی قریبی میز پر موجود اپنے سامان سے ڈبا اٹھایا۔ تصویر سے زیادہ اس کی توجہ اندر موجود گلابی رنگ کے کاغذ پر گئی۔ جس پر اردو میں عبارت لکھی تھی۔

"دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں
وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں"

عروش نے عبارت پڑھی۔ پھر اپنی سہیلیوں کو دیکھا۔

"تم لوگوں کو کون سا شعر ملا ہے؟"

"شعر؟ ہمیں تو کوئی شعر نہیں ملا۔ اندر تو صرف تصویر ہے۔"

سامنے موجود ساتوں لڑکیوں نے یہی کہا تو عروش کو حیرت ہوئی۔ پھر اس نے اپنے اردگرد نظر گھما کے ہر طرف دیکھا۔ کوئی بھی اس کی طرف غیر معمولی طرح سے متوجہ نہیں تھا۔ یہ کاغذ آیا تو کہاں سے آیا۔

☆☆☆

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر وہ دوبارہ گلابی

کاغذ کی عبارت پڑھ رہی تھی۔

"تم نے پتھر کی بات کی تھی۔ مجھے پتھروں کا معلوم نہیں بیٹا، لیکن یوں لگ رہا ہے کہ میں نے ہیرا تراش لیا ہے۔" حیدر زمان نے ڈرائیو کرتے ہوئے فخر سے اپنی بیٹی کو کہا۔

عروش نے کاغذ دوبارہ تصویر میں ڈال دیا اور ایک گہری سانس لی۔

"نہیں پاپا ابھی نہیں۔ ابھی میں ہیرا نہیں ہوں۔ ہیرا تو میں تب بنوں گی۔ جب آپ کو آپ کا آبائی گھر واپس دلاؤں گی۔" اس نے عزم سے کہا۔

آٹھ سال پہلے عروش میں سمجھ نہیں تھی۔ مگر اب وہ ہر مشکل کا سامنا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"جہاں سب مل کر رہتے ہیں گھر وہی ہوتا ہے۔ اب ہمارا گھر یہی ہے۔" آمنہ بیگم نے بھی کہا۔ لیکن آمنہ بیگم کی یہ بات دوسروں کو جھوٹی تسلی کے سوا کچھ نہ لگتی تھی۔

"مجھے ابھی بھی اپنے امرود کے وہ درخت بہت یاد آتے ہیں۔ معلوم نہیں ہے۔ اب ادھر پھل لگتے ہوں گے کہ نہیں۔" عروش نے کہا۔

☆☆☆

رانی کو شہر گئے عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتی تو ہر جاننے والے کے گھر جاتی اور ان کی زندگیوں میں ویسی ہی گہری دلچسپی دکھاتی کہ سب کو احساس ہی نہ ہوتا کہ اب وہ وہاں نہیں رہتی۔ وہ سکینہ کے گھر سال بعد آئی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی وقت گزرا ہو۔ پچھلی بار کی طرح سکینہ اس بار بھی پیٹ سے تھی۔ سکینہ کی پانچ سالہ شادی میں رانی کو یاد نہیں پڑتا کہ وہ ملے ہوں اور سکینہ کا پاؤں بھاری نہ ہو۔ لیکن اس بار سکینہ سخت اوازار تھی۔ پچھلا بچہ گود میں اٹھایا ہوا تھا اور اس سے پچھلا دوڑیں لگا رہا تھا۔

"تم نے شادی کر کے بچوں کی لائن نہ لگائی ہوتی تو میرے ساتھ شہر چلتیں۔ کسی کوٹھی میں لگا دیتی۔ بیگمات کو قبول نہیں کہ ملازم بھی گندا ہو۔ پاؤڈر پرفیوم تک دیتی ہیں۔"

رانی کو سکینہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہت افسوس تھا۔ سکینہ میں موقع پرست تھی۔ شہر کی رونق دیکھتی تو ممکن تھا ایمان داری اور عزت بھی چھوڑ دیتی۔ وہ رانی کے ساتھ مل جاتی تو رانی کا کام خوب چلتا۔ مگر اس نے ماں کے کہنے پر شادی کر لی۔ اب تو وہ روپ بھی نہیں رہا تھا۔

"ماسی! میرا دل نہ جلاؤ۔ ان چار چھوٹے بچوں میں مجھے تو اب صرف پوتڑوں کی بو یاد ہے۔" سکینہ نے گود کے بچے کو فرش پر رکھا اور سامنے چاول کی پلیٹ رکھ دی۔

یہ غریب کا بچہ تھا۔ نعمتوں کو خود کھاتا تھا۔ شہر کی کوئی بیگم دیکھ لے کہ اتنا چھوٹا بچہ خود کھا رہا ہے اور وہ بھی بڑوں کی غذا تو صدمے میں چلی جائے۔

رانی جان گئی تھی کہ اب سکینہ چاہے روئے پیٹے نہیں رہے گی۔ اس لیے اٹھنے لگی۔ رانی کا کام اب ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ کوئی نئی لڑکی بھی نہیں تھی جس کے ذریعے کمائی کرے۔ سوچا تھا گاؤں سے کوئی مل جائے گی۔ لیکن وہ بھی ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اٹھنے کو تھی کہ اندر کمرے سے ایک ننھی بچی گھٹنوں کے بل چلتی چاول کی پلیٹ کی طرف آئی۔ آدھا راستہ گھٹنوں کے بل طے کر کے وہ بچی کھڑی ہوئی اور چارپائی پکڑ کر چلنے لگی۔ وہ بہت بھوکی تھی۔ چاولوں کی پلیٹ کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بچی نے دو قدم لیے تو اپنی ہی شلوار میں پھنس کر دھڑام سے گری۔

"ایک تو یہ نمانی گلے پڑ گئی ہے۔" سکینہ نے روتی بچی کو اٹھا کر اسے ہی دو تھپڑ جڑے۔ پھر اس کمزور سی جان کو الٹا کر کے اس کی شلوار اتار دی۔ نیچے اس نے گندہ جانگیا پہن رکھا تھا۔ سکینہ نے بچی کو بھی چاول کی پلیٹ کے پاس بٹھا دیا۔

"سکینہ تمہارے جوڑے ہوئے تھے؟" رانی نے ان ہم عمر بچوں کو دیکھ۔

"یہ میری بچی نہیں ہے۔ میرا جیٹھ جو پٹھانی بیاہ لایا تھا اس کی بچی ہے۔" سکینہ نے نفرت سے کہا۔

"ہاں یاد آیا۔ بڑی حسین تھی۔ ماں کہاں ہے؟" رانی کو دلچسپی ہو رہی تھی۔ بچی ابھی لاغر اور کملائی ہوئی تھی۔ مگر خون تو پٹھانی ماں کا تھا ذرا سی توجہ سے روپ نکل آنا تھا۔

"ماں تو بہت کمزور ہو گئی تھی۔ میرے جیٹھ کو تو تم جانتی ہو۔ پہلی دو بھی اس کی طبیعت سے تنگ آ کر چھوڑ گئی تھیں۔ یہ والی تو ست ساتھ ماہ کا بچہ پیدا کر کے جان سے ہی گئی۔ باپ پھر کہیں نکل گیا۔ چھ ماہ سے شکل نہیں دکھائی۔ یہ "گگی" میرے سر آ گئی۔" سکینہ نے بتایا۔

"ہائیں گگی؟ یہ کیسا نام ہوا۔" رانی کی ہنسی نکلی۔

"ماں کا نام گل رخ تھا یہ دیکھنے میں ڈنڈے والی گگی ہی لگتی ہے۔ اس لیے میں گگی ہی کہتی ہوں۔ اب نام سوچنے میں کون محنت کرے۔" سکینہ چارپائی پر بیٹھی اور کمر اکڑا کر پیٹ کو گھٹنے کی جگہ دی۔

جو لوگ نام پر محنت نہیں کرتے وہ چندہ تارا بھی کہہ کر گزار لیتے ہیں۔ یہاں فقدان محبت کا تھا۔ رانی الفاظ تول رہی تھی کہ کیسے اس بچی کو اپنے ہاتھ لے لے۔ پالنا مشکل کام تھا۔ اب تک اس نے بھی اتنی چھوٹی بچی نہیں لی تھی۔ پھر سوچا بڑی لڑکیاں چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ ساتھ نبھائے گی۔ لیکن اتنے میں ہی بچی اٹھ کر پھر چلنے لگی۔ رانی نے اس کی پتلی اور ٹیڑھی ٹانگوں کو دیکھا۔ گھٹنے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ اور ٹانگیں گولائی میں ٹیڑھی تھیں۔ رانی کے الفاظ تو منہ میں رہ گئے۔ اس نے معذور لڑکی کیا کرنی تھی۔

"ماسی! تم میری مشکل آسان کر دو اسے شہر لے جاؤ۔ بے شک کسی یتیم خانے میں ڈلوا دینا۔ میرا جیٹھ تو بھول بیٹھا ہے کہ اس کی کوئی اولاد بھی ہے۔" سکینہ اس کا گھٹنہ پکڑ کر بولی۔

"نہ بابا نہ۔ پرائی اولاد ہے۔ پولیس کے چکر پڑ جاتے ہیں۔ گاؤں میں کل کو کوئی مجھ پر بھروسا نہیں کرے گا۔ میں نہیں لے جا سکتی۔" رانی نے کہا۔ سکینہ منت کرتی رہی۔ پھر رانی کو اپنی بھکارن

سہیلی یاد آئی۔ جو بچہ گود میں لے کر سگنل پر مانگتی تھی۔ اس نے گگی کو دیکھا۔ وہ اپنے اپنے ہاتھ کی انگلی سے اپنے بالوں کی لٹ سے کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

کچھ لوگ گھروں کو بھی نام دیتے ہیں۔ پھر ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے خاندان کے سربراہ سے کی جاتی ہے۔ وہ سب "تبسم منزل" کے مکین تھے۔ آٹھ سال پہلے وہ تبسم منزل سے نکل گئے تھے اور اس نئے گھر میں آ گئے تھے۔ نئے گھر کو انہوں نے کبھی دل سے نہیں اپنایا تھا۔ اس لیے وہ گھر بے نام رہا تھا۔ آج اس بے نام گھر میں فنکشن کی بتیاں لگ رہی تھیں۔ صوفے پر بیٹھی سومارہ پارلر جانے سے پہلے اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ اور صفیہ بیگم فون پر اپنے بڑے بیٹے ارحم بات کر رہی تھیں۔

"تم نے آنے کی پوری کوشش کی ہوتی تو تم یہاں ہوتے۔ بہن کے نکاح کی دور سے مبارک نہ دے رہے ہوتے۔ ظالموں نے باپ کو تو اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ بیٹی کو رخصت کرتے یا بیٹے کا سہرا دیکھتے۔ کم از کم تم تو آ جاتے۔" صفیہ بیگم نے مخصوص روہانسے لہجے میں کہا۔

سومارہ نے ضبط کرتے ہوئے انگلیاں اکڑائیں۔ چھ سال میں ایک لمحہ ایسا نہیں گزرا تھا جب اس کے باپ کو خوشی سے یاد کیا گیا ہو۔ جانے والے کو ہنس کر یاد کرنے کی روایت کیوں نہیں ڈالی جاتی؟ سومارہ سوچ کر پھر نیل پالش لگانے لگی۔

"اچھا، اب میں فون رکھتی ہوں تم یاد سے رات کو بنٹی کو مبارک باد کا فون کر لینا۔" صفیہ بیگم نے پھر کہا۔

اس بار تو سومارہ تڑپ اٹھی۔

"امی! اس کا نام سرفراز ہے۔"

جب سے بات پکی ہوئی تھی وہ گھر والوں کے منہ پر سے اپنے منگیتر کا پیار کا نام بنٹی ہٹا کر اصلی نام سرفراز چڑھانے پر جتی ہوئی تھی۔ مگر مجال ہے کوئی جو دو لہے کو عزت بخشتا۔ ہر کوئی بنٹی بنٹی کی گردان کرتا

تھا۔

"اتنی دور سے بھائی کا فون آیا تھا۔ بیچ میں شور کرنا ضروری تھا۔" صفیہ نے فون رکھ کر سومارہ کو دیکھا جو انہیں چلتی پھرتی بدشگونی لگتی تھی۔

"آپ جانتی ہیں کہ وہ پڑھنے گئے ہیں۔ آپ کیوں انہیں ہر بار گلٹ میں ڈالتی ہیں۔" سومارہ نے الٹاماں کو سمجھایا۔

اتنے میں عروش کا چھوٹا بھائی معاذ کپڑوں کا بیگ لیے اندر داخل ہوا۔

"بنّی بھائی کا ڈرائیور یہ دے کر گیا ہے۔"

سومارہ نے جھٹ نیل پالش کی پروا کیے بغیر معاذ کے سر پر تھپڑ لگایا۔

"ابھی واپس لو اپنے الفاظ اور بولو سرفراز بھائی کا ڈرائیور دے کر گیا ہے۔ سرفراز۔"

معاذ سر رگڑتا رہا اور صفیہ بیگم نے اس طوفانی دلہن کو دیکھ کر سر پکڑ لیا۔

"تائی امی۔" عروش کا لا کوٹ اور گریجویشن کی ٹوپی پہنے اندر داخل ہوئی۔

"ارے میری بچی، آگئی۔ مبارک ہو۔ ماشاء اللہ۔" صفیہ بیگم نے اس کی بلائیں لیں۔

وہ مختصر سالاؤنج ان سارے افراد سے بھر گیا۔ ہر خوشی کی طرح اس بار بھی جو تھے ان لوگوں کے ہونے سے زیادہ ان لوگوں کی کمی زیادہ محسوس کی گئی جو نہیں رہے تھے۔

"چلو اب جلدی سے پارلر جاؤ۔" آمنہ نے یاد کروایا۔

سومارہ سامان سمیٹتے ہوئے اٹھی اور کہا۔

"امی! وہ جو بنّی کو سلامی میں انگوٹھی دینی ہے وہ کہاں رکھوں؟"

سارے خاموش ہوگئے اور ایسے گھورنے لگے جو بنّی سن کر مرنے مارنے پر آجاتی تھی اب خود کہہ رہی تھی۔ سومارہ نے اپنی زبان دانتوں میں دبائی۔ اور خفت سے معاذ کو ہی چپت لگادی۔

"تمہاری وجہ سے میرے منہ پر بھی بنّی چڑھ گیا ہے۔ سرفراز نام ہے۔ سرفراز۔"

سب کھل کر ہنسے اور سومارہ سرفراز کی گردان کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

فنکشن دو گھر چھوڑ کر ایک بڑے سے پلاٹ میں کیا گیا تھا۔ سومارہ کو گھر پر ہی چھوڑ کر تمام لڑکیاں شامیانے میں لڑکے والوں کا استقبال کرنے نکلیں۔ عروش نے خواتین کو آمد پر گجرے دینے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں گجرے کا بڑا سا تھال پکڑے وہ نکلی تو دیکھا لڑکے والے گاڑیوں سے اتر رہے تھے۔ ساری لڑکیوں نے دوڑ لگادی۔ عروش نے سب سے ہٹ کر کیاری سے شارٹ کٹ لینا چاہا۔ تو اس کی ہیل کیاری کی نرم مٹی میں دھنس گئی۔ وہ ڈول کر گرنے ہی لگی تھی جب ایک باڑ نے اسے سہارا دیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہیل والی جوتی کیاری کی نرم مٹی میں دھنسی تھی۔ نیٹ کا دوپٹا باڑ میں اٹکا ہوا تھا اور وہ دائیں طرف کو جھکی مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ پھر کسی اللہ کے بندے نے اس کی مدد کی اور وہ دوڑ کر نکلی تو معلوم ہوا کہ لڑکے والے نشستیں سنبھال رہے ہیں۔

"تم کہاں رہ گئی تھیں، چلو سب کو گجرے دو۔" صفیہ نے عروش کو حکم دیا۔

عروش سب سے پہلے دولہے کی امی کی طرف گئی اور گجرے تقسیم کرنے لگی۔ ابھی نوکری میں چند گجرے باقی ہی تھے تو عروش کو اندر سے گلابی کاغذ جھانکتا نظر آیا۔ عروش کے ذہن میں صبح والا کاغذ آیا مگر اس بار عبارت مختلف تھی۔

"برسوں کے بعد دیکھا ایک شخص دلربا سا
اب ذہن میں نہیں پر نام تھا بھلا سا
ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا"

پڑھتے ہی اس کا خون منجمد ہوگیا تھا۔ اس نے ارد گرد دیکھا ہر شخص شناسا سا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عبارت دوبارہ پڑھ سکتی۔ اسے اسٹیج پر بلالیا گیا۔

پرچی ٹوکری میں رکھ کر وہ دوبارہ تقریب میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

پلاسٹک کی ٹوکری اس کے ننھے ہاتھوں کے لیے بہت بڑی تھی۔ چاندنی کی کل دنیا کی طرح یہ بھی اس کے ہاتھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ اور اس کی دنیا کی طرح ہی اس میں نازک، سستی کوالٹی کی چیزیں بھری تھیں مگر ساری رنگین تھیں۔ پلاسٹک کے کلپ، چمکیلے پھندنے والی پونیاں۔ ہتھیلی جتنا شیشہ۔ دوسرے بچے بچپن میں برف پانی اور پکڑن پکڑائی کھیلتے تھے۔ ان سگنل کے بچوں کی زندگی بھی ایسی ہی تھی۔ ان کا برف پانی تھا کہ کیسے کسی گاہک کو برف سے پانی بنا لیا جائے۔ ان کی ریس تھی کہ کون زیادہ تیزی سے چلتی گاڑیوں کے سامنے سے سڑک کراس کرتا ہے اور ان کی پکڑن پکڑائی بھی مختلف تھی۔ چاندنی ہارڈ شولڈر پر کھڑی گاڑی کے پاس گئی۔ مرد بیکری میں گیا تھا۔ گاڑی میں ماں اور بچے تھے۔ بچے پچھلی سیٹ پر بیٹھے موبائل پر گیم کھیل رہے تھے۔

"باجی! پونیاں کلپ لے لیں؟" اس نے کھڑکی سے ناک چپکا کر کہا۔

"نہیں چاہیے۔" عورت نے جانے کو کہا۔

دوسرے بیچنے والوں کی طرح چاندنی نے منت نہیں کی نہ ہی اللہ رسول کا واسطہ دیا۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہوئی۔ ٹوکری پکڑی اور دور جانے لگی۔ اس کو دور جاتا دیکھ کر عورت کو بھی یاد آیا کہ اس کو پنیں چاہیے تھیں۔ اس نے آواز دے کر چاندنی کو دوبارہ بلایا۔

"میری بہن کی شادی تھی اس نے ایسا گھنگھروں والا کلپ لگایا تھا۔ میں تو بڑے سیٹ بھی لاتی ہوں۔ مگر وہ یہاں کوئی نہیں لیتا۔ وہ دکان پر اچھے بکتے ہیں۔ میرے بھائی کی دکان ہے۔ سارا ایک نمبر سامان ہے۔" وہ کمال سیلز گرل تھی۔ عورت نے صرف پنیں مانگیں۔ اس نے ساری ٹوکری دکھا دی۔ بچے بھی وہ بالیں دیکھ رہے تھے جن میں لائٹ جلتی تھی۔ قیمتیں اتنی مناسب تھیں کہ عورت نے بہت سا سامان لے لیا۔ اس بچی کی دیکھا دیکھی پچھلی کھڑکیوں پر دولڑکے اخبار اور ماچس لیے آگئے کہ ہم سے بھی سامان لے لو۔ مگر گاڑی والوں نے انہیں چلتا کیا۔

"میری شادی ہوگی تو میں آپ کو کارڈ بھیجوں گی۔ یہاں پیچھے جھگیاں ہیں میں وہیں رہتی ہوں۔"

وہ سودا وصول کرنے کے بعد بھی دوستی لگاتی رہی۔

جب گاڑی واپس سفر پر گامزن ہوئی تو اس نے ہاتھ بھی ہلایا۔ پھر اپنے الٹے ہاتھ کی انگلی سے بالوں کی لٹ مروڑنے لگی۔ گاڑی کے سوار جن رشتہ داروں کے یہاں جا رہے تھے وہاں سے ہو کر واپس گاڑی میں بیٹھے تو انہیں احساس ہوا کہ بچوں کا موبائل غائب ہے۔ عورت قسم اٹھا سکتی تھی کہ وہ لڑکی تو میری کھڑکی سے ہلی تک نہیں اس نے نہیں لیا۔ دو منٹ کے لیے آئے وہ ماچس فروش بچے کسی کو یاد نہیں تھے۔ چاندنی نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ جھوٹ تھا۔ حتیٰ کہ اس کا نام بھی چاندنی نہیں تھا۔ وہ تو رانی کو چند دن اسے بھکارن کو کرائے پر دینے کے بعد اس پر پیار آگیا تھا۔ وہ سرکاری ہسپتال لے کر گئی تو معلوم ہوا ٹیڑھی ٹانگوں کی بیماری خوراک کی کمی سے تھی۔ ڈاکٹر نے چند قطرے دیے اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ مگر رانی جس کام کے لیے مشہور تھی وہ اس میں اس بچی کی قیمت نہ لگا سکی۔ وہ اپنے بیٹے ارسلان کے ساتھ ہی اسے بھی پالنے لگی۔ اور وہ تھی ہی ایسی میٹھی کہانیاں بنانے والی کہ ہر ایک کو اس سے محبت ہو جاتی تھی۔ اس کو ایک گھر میں کام پر لگایا تو چھوٹی سی ملازمہ بچوں کی دیکھا دیکھی مالکن کو ماما کہنے لگی۔ بچوں کے ساتھ کھیلتی وہ پڑھنا لکھنا بھی سیکھ گئی۔ پھر وہاں سے ہاتھ صاف کر کے نکلی تو سڑک پر ارسلان کے ساتھ گٹھ جوڑ بنا لیا۔ یہ گاہک کا دھیان ہٹاتی اور ارسلان اس کا قیمتی سامان لے کر رفوچکر ہو جاتا۔ یہ تھی ان سگنل کے بچوں کی پکڑن پکڑائی۔

☆☆☆

"ایک سو پندرہ ایک سو پچاس، ایک سو نوے۔"
سومارہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی اور اپنے جوڑے میں سے نکلنے والی پنوں کو بڑھا چڑھا کر گن رہی تھی۔ جوڑا کھولتی ہوئی عروش کھوئی ہوئی تھی۔

"تمہاری سوچوں پر کون سوار ہے؟" سومارہ اور عروش کمرا شیئر کرتے تھے۔ دونوں کے بیچ میں کوئی سیکرٹ نہیں تھا۔

"مجھے بہت نیند آرہی ہے۔" عروش نے وضاحت دی۔

"ہر چار مہینے بعد ایک فنکشن کرنا چاہیے تاکہ ڈھیر سارے تحفے آئیں۔" سومارہ آلتی پالتی مار کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور اپنے تحفے دیکھنے لگی۔

"عروش! یہ تحفہ تو تمہارا ہے تم نے بھی کسی کو بلایا تھا؟" سومارہ نے ایک چھوٹی سی ڈبیا عروش کی جانب بڑھائی۔

"نہیں، میرا تو کوئی مہمان نہیں تھا۔" عروش نے اپنے وسوسوں کے غلط ہونے کی دعا کرتے ہوئے تحفہ تھاما۔ پھر سرد پڑتی انگلیوں سے کاغذ پھاڑتے ہوئے۔ اس نے ایک زیور کی ڈبی کو آزاد کیا۔ جو اس کی ہتھیلی جتنی تھی۔ کلک کی آواز کے ساتھ ڈبی کھلی اور اس کو لگا جیسے اس میں سے سبز روشنی نکل رہی ہو۔ اندر ایک بیزوی چمک دار تراشا ہوا زمرد پڑا تھا۔ عام حالات میں وہ یقیناً اس خوب صورت پتھر کو دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھتی۔ مگر اس وقت اسے وہ پتھر اپنی رگیں کاٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ ڈبی میں ایک تہہ شدہ کاغذ تھا۔ گلابی رنگ کا کاغذ۔

پتھر کے خدوخال سے متاثر ہونے والے
یہ دل موم سا پگھلتا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
تجھے پانے کی آرزو ہمیں زیب نہیں دیتی
پر فیصلہ کریں گے تیری جستجو کے بعد

اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی ڈبی گری اور زمرد فرش پر چکرانے لگا۔

"کیا ہوا؟" سومارہ نے نظر اٹھا کر اس کی پیلی پڑتی رنگت کو دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔" اس کی آواز سرگوشی کی طرح نکلی تھی۔

چند منٹوں بعد عروش پانی کا گلاس تھامے بستر پر ہی بیٹھی تھی اور سومارہ تینوں پرچیوں کو اپنے سامنے پھیلائے معائنہ کر رہی تھی۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تمہارا کلاس فیلو ہوگا۔" سومارہ نے عروش کو بھیگی بلی بنے دیکھا۔

"میری کلاس میں ہر کوئی مجھے لڑاکا سمجھ کے خائف رہتا تھا۔"

"بظاہر خائف رہنے والا ممکن ہے تمہیں پسند کرتا ہو اور اب اپنی بات کہنا چاہ رہا ہو۔" سومارہ نے پھر اکسایا۔

"لیکن زمرد کا تحفہ۔ پتھروں کی خصوصیت پر بات چیت تو ارحم بھائی اور میری ایک ذاتی عادت ہے۔ کسی تیسرے کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" عروش نے کہا۔

اس بار چہرے پر سائے منڈلانے کی باری سومارہ کی تھی۔

"ہو سکتا ہے ارحم بھائی ہی اپنے کسی دوست کے ذریعے ایسا کروا رہے ہوں۔" سومارہ نے بہت محتاط انداز میں کہا۔

"ہزاروں میل دور بیٹھے انہیں مجھے ستانے کا ہی کام سوجھا ہے۔ وہ ایسا کیوں کریں گے؟" عروش نے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ سومارہ نے دل میں افسوس سے سوچا کہ نادان عروش اب تک نہیں سمجھی کہ ارحم ایسا کیوں کرے گا۔

☆☆☆

وہ کہیں سے دو بچوں کا باپ نہیں لگتا تھا اور اس بات کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا۔ ماں باپ نے اتنی جلدی شادی کردی تھی کہ ارمان پورے نہیں ہوئے۔ وہ تو بھلا ہو کمائی اچھی تھی۔ وہ گھر والی کے ساتھ باہر والی بھی افورڈ کر سکتا ہے۔ پہلے اس نے سمجھدار بال بچوں والی حسین عورتوں سے تعلق بنایا۔ مگر اس بار وہ کمسن کلی سے دل لگا بیٹھا تھا۔ اس کا نام ایمان تھا۔

جو اسے رانگ کال پر ملی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ صرف سترہ سال کی ہے تو سوچا راستہ الگ کر لے۔ مگر اس کی ان چھوئی معصومیت نے ایسا کرنے نہیں دیا۔ ایمان اپنی تصویریں نہیں بھیجتی تھی۔ مگر ملنے آجایا کرتی تھی۔ اب بھی وہ پارک میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ پکڑنے پر ہی شرما جاتی تھی۔ اس بار تنویر اس کے لیے سونے کی بالیاں لایا تھا۔ وہ مہینوں سے اس پر خرچا کر رہا تھا۔ کپڑے، بیلنس، تحفے بہت کچھ لٹایا تھا۔ ایمان پیسوں کی کمی کے باعث کالج چھوڑنے والی تھی۔ تنویر نے ہی فیس کے پیسے دیے تھے۔ اب تنویر وصولی چاہتا تھا۔

"میں آگئی۔" دوپٹے کے ہالے سے جھانکتی تیس اور اس کا پاکیزہ چہرہ۔ تنویر تو دیکھتے ہی سب لٹانے پر راضی ہو جاتا تھا۔

"چلو آؤ، کسی خاموش جگہ پر چلیں۔" تنویر بھی کاروباری تھا۔

"میں تو کالج سے واپسی پر رکی ہوں۔ دیر ہوئی تو امی کو معلوم ہو جائے گا۔" ایمان نے ڈرتے ہوئے کہا۔

تنویر نے بالیوں والی ڈبیہ کھولی۔

"میں چاہتا تھا تمہیں اپنے ہاتھوں سے پہناؤں اب یہ سب یہاں تو نہیں ہو سکتا۔" تنویر نے اپنے کندھے سے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ گھبرائی شرمائی اور پھر اس کے ضد کرنے پر مان گئی۔ وہ اسے ہوٹل روم میں لے آیا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں تم ایسے ہی مسکراتی رہیں تو دیکھنا سونے میں تول دوں گا۔" تنویر نے کمسی محبوبہ کو رام کرنے کے لیے بڑک ماری۔

"ایسا ہے تو آپ رشتہ کیوں نہیں لے آتے؟ میرے ابا انکار نہیں کریں گے۔" ایمان نے شرما کر کہا۔

تنویر کے منہ کا ذائقہ ایک دم سے بدمزا ہوا۔ یہ لڑکیاں گھوم پھر کر شادی پر ہی کیوں آجاتی ہیں؟ دنیا لذتوں سے بھری ہوئی ہے۔ مگر لڑکیوں کی سوچ وہی سطحی ہوتی ہے۔

"ابھی صرف اپنی بات کرو تمہاری طرف سے ہاں ہے؟" تنویر نے اس کا سنہری بالی والا کان چھوا۔

"اقرار ہے تب ہی تو آپ سے ملنے آتی ہوں۔" معصومیت سے کہتے ہوں۔ ایمان دور ہوئی۔

وہ ایک گم نام ہوٹل کے کمرے میں صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تنویر بیچ کا سارا فاصلہ سمیٹنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا ایمان پہلے شرمائے گی تال مٹول کرے گی۔ مگر آج وہ اسے منا ہی لے گا۔

"کھولو، کون ہے اندر۔ کھولو دروازہ؟" باہر کوئی جنونی انداز میں دروازہ پیٹنے لگا۔

"یہ کون آگیا؟ پولیس نہ ہو؟" ایمان گھبرا کر اٹھ گئی۔

"کچھ نہیں ہوتا میں جو ساتھ ہوں۔" تنویر کو خود پر بہت غرور تھا۔ اس نے اعتماد سے دروازہ کھول دیا۔

"میں جو مرضی کروں تم کون ہو؟" اس نے آنے والے کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

"میں ایمان کا بھائی ہوں۔" آنے والا تنویر کو دھکا دے کر اندر آیا اور ایمان کو چٹیا سے پکڑ لیا۔

"بھائی! ہم صرف بات کر رہے تھے۔ تنویر بہت اچھے ہیں۔ ہم شادی کرنے والے ہیں۔" ایمان پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ماں باپ کی عزت نیلام کر دی۔" آدمی نے نحیف سی ایمان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

تنویر نے آہستگی سے اپنا والٹ اور موبائل پکڑا اور نکلنا چاہا۔

"یہ کہاں کرے گا شادی تم سے، یہ تو بال بچوں والا ہے۔ اقبال ٹاؤن میں رہتا ہے۔ میں نے سارا پتا نکلوا لیا ہے۔" بھائی نے تنویر کا سارا ایڈریس سنا دیا۔

تنویر کے ہاتھوں کے تو توتے اڑ گئے۔ وہ اس چوبیس سال کے آدمی سے ڈرنے لگا۔

"نہیں بھائی، میں انہیں اچھے سے جانتی ہوں۔ تنویر کاروبار میں مصروف رہے تھے ان کی شادی نہیں ہوئی۔ کیوں تنویر بتائیں نہ بھائی کو۔" ایمان روتے ہوئے چھوٹی بچی لگ رہی تھی۔

"وہ ایمان میں......" تنویر نے وضاحت دینے کا سوچا۔ پھر باہر کی طرف دوڑا۔

"تم چلو، میں تمہیں تمہارے گھر آ کر ملتا ہوں۔ تمہاری بیوی کو بتاتا ہوں کیسے لڑکیاں پھنساتے ہو۔" ایمان کے بھائی نے وہیں سے آواز لگائی۔ اب تنویر کیا کرتا واپس پلٹ آیا۔

"کچھ لے دے کر معاملہ نبٹا لو، میں نے تمہاری بہن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"نابالغ لڑکی کو ورغلاتے ہو اور کہتے ہو کچھ نہیں کیا۔ اب شادی کرو اس سے۔ دوسری بیوی بناؤ یا تیسری، میں نہیں چھوڑوں گا۔ میری بہن اب تمہاری ہی بیوی بنے گی۔" بھائی کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس بار اس نے تنویر اور ایمان کی تصویریں نکال کر بیڈ پر پھینکیں۔ ان کی ملاقاتوں کی رنگین داستان کمرے میں بکھر گئی۔

☆☆☆

"مجھے تو لگا تم آج میرا اس سے نکاح پڑھوا کر ہی مانو گے۔" وہ الٹے ہاتھ کی انگلی سے بالوں کی لٹ سے کھیل رہی تھی۔

"وہ نکاح کرنے والی چیز نہیں تھا۔ نکاح وہاں کریں گے جہاں لمبی جائیداد ہو۔" ارسلان نوٹ گننے میں مصروف تھا۔

ایمان عرف چاندنی عرف گل بنام .... وہ اس گندی دنیا میں اپنا اصلی نام استعمال نہیں کرتی تھی۔ ایک نام ہی تو بچا تھا جو اسے پاکیزگی کا احساس دیتا تھا۔ ارسلان کے منہ سے شادی کا سن کر وہ لمحہ بھر کو دہل گئی۔ اس کو اور ارسلان کو رانی نے ساتھ پالا پوسا تھا۔ اور یہی کہا تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سگے ہیں۔ ان دونوں کی شادی ہوگی۔ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے باقی لڑکے لڑکیاں تو آنے جانے ہیں۔ پھر بھی ارسلان کتنے آرام سے اس کا نکاح شادی کسی دوسرے سے کرنے کی بات کہہ لیتا تھا۔ وہ لمحہ گزر گیا۔ وہ بھی پر سکون ہو گئی۔ اسے پیار کی عادت تھی عزت کی نہیں۔

"چل تنویر، جیسا بھی تھا تیری کمائی تو اچھی کروا گیا۔" وہ شاپنگ بیگ سے نئے جوڑے نکال کر دیکھنے لگی جو وہ راستے میں لے کر آئے تھے۔

اس کے سارے ٹھاٹھ امیروں والے تھے۔

"یہ تو پہلی قسط ہے۔ اس تنویر کا تیل تو آخری دم تک نچوڑوں گا۔" ارسلان رقم گن کر نوٹ پنکھا بنا کر جھلنے لگا۔

☆☆☆

"خدا کا لاکھ شکر۔ خیریت سے سومارہ کا نکاح ہو گیا۔" آمنہ بیگم نے مٹھائی کی ڈبی پر نام کی پرچی لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو حیدر اور تم نے سب سنبھال لیا مجھے تو انگلی تک نہیں ہلانی پڑی۔" صفیہ بھی بدر کی تھیلیاں بانٹنے کے لیے الگ کر رہی تھی۔

"غیروں سی باتیں نہ کریں۔" آمنہ نے کہا۔

"لیکن آمنہ یہی تقریب ہمارے اپنے گھر میں ہوتی تو کتنا عالیشان منظر ہوتا۔"

تبسم منزل کو پرائے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے مگر اب بھی وہ "اپنا گھر" کہا اور سمجھا جاتا تھا۔

"خدا غارت کرے اس بدر اعجاز کو اس نے ہمارا سب کچھ چھین لیا۔ اب تک زندہ بھی ہوگا تو تڑپ کر جی رہا ہوگا۔"

بدر اعجاز کے لیے تو بددعائیں ان کے منہ پر ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

"جانے دیں بھابھی، ہم نے اپنی پوری کوشش کی۔ اب اس کا حساب خدا کی عدالت میں ہے۔ جن کی سرشت میں چال بازی ہوتی ہے وہ پھر خسرو پرویز بن جاتے ہیں۔ ان کی اپنی اولاد ہی ان کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔"

عروش اس ہی وقت سیڑھیاں اتر کر آئی تھی۔

دونوں خواتین کی باتیں سنیں تو وہیں سے پلٹ کر بیرونی دروازے تک آ گئی۔ بیرونی دروازے سے گیٹ نظر آتا تھا۔ بیچ میں لان نہایت ہی مختصر تھا۔ عروش نے آنکھ اپنے آبائی گھر میں کھولی تھی۔ پرانی آبادی کا وہ گھر بہت کشادہ تھا۔ دیواریں اتنی اونچی کہ اوپر روشن دان ہوتے تھے۔ سب سے بڑا تھا، درختوں سے لدے گھر کو اپنی حفاظت میں سمیٹے بڑا سا لان۔ دادی جب تک زندہ تھیں ان کی پسندیدہ کہانی اس گھر کے بننے کے مراحل تھے جو بچوں کو ازبر ہو گئے تھے۔ کس طرح پلاٹ لے کر تعمیر شروع کروائی گئی تو اکہتر کی جنگ چھڑ گئی۔ اخبار والے آئے اور زیرِ تعمیر گھر کی تصویر کھینچ کر لے گئے کہ ایک طرف جنگ لگی ہے۔ دوسری طرف حوصلے سے زندگی کا سازوسامان تیار ہو رہا ہے۔ جب چھوٹی پھپھو کی شادی ہوئی تھی تو اپنے ہی لان میں شامیانے ہفتہ بھر لگے رہے۔ بچوں کے لیے تو وہ تقریب محلوں کی کہانیوں جیسی تھی۔

سکندر زمان کے دو ہی بچے تھے ارحم اور سومارہ۔ حیدر زمان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا۔ عروش، ارم اور معاذ۔ عروش اور سومارہ ہم عمر تھے۔ مگر بچپن میں اس کی زیادہ دوستی ارحم سے رہی تھی۔ ارحم اس کے لیے وہ دانش مند کزن تھا۔ جس کے پاس اس کے ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔ عروش کو درختوں اور پودوں سے بہت پیار تھا۔ وہ ہر وقت درختوں پر چڑھی رہتی۔ ایک بار وہ پکنک پر گئے وہاں وہ ڈوبتے ہوئے بچی تھی۔ تب بھی ارحم اس کے پاس تھا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔

دس سال پہلے زمان برادرز نے ایک فیکٹری لگانے کے لیے اپنے گھر پر لون لیا تھا۔ فیکٹری کا منصوبہ نہایت جانچا ہوا تھا۔ یقیناً دو سالوں میں وہ لون چھڑانے میں کامیاب ہو جاتے۔ مگر وہ ایک غلطی کر بیٹھے۔ اور وہ غلطی تھی، بدر اعجاز جیسے موقع پرست انسان پر بھروسا کرنا۔ بدر اعجاز اندر ہی اندر فیکٹری کو کھا گیا تھا۔ لون کی ادائی نہ ہونے کی صورت میں عدالت نے گھر کی بولی لگوا دی۔ دادی بیمار پڑ گئی تھیں۔ گھر خالی کرنے سے پہلے آخری گیدرنگ جو ہوئی وہ دادی کا جنازہ تھا۔ اور نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد پہلی قابلِ ذکر بات سکندر زمان کو دل کا دورہ پڑنا۔

ان کا نیا گھر ایک جدید اور اچھے علاقے میں تھا۔ مگر اس میں جو مختصر سا قطعہ تھا اس میں تایا ابا کندھے جھکائے پچھلی نسل سے شرمندہ اور آنے والی نسل کے مجرم بنے بیٹھے رہتے۔ اس لیے وہ لان گھر کے بچوں میں کبھی بچپن نہیں جگا سکا۔ بلکہ انہیں عمر سے پختہ کر گیا۔ عروش نے بھی اپنے باٹنیسٹ بننے کے تمام ارادے صندوق میں ڈال کر سمندر کی تہ میں دے مارے۔ اس نے نئی راہ متعین کی اب اس کو وکالت کرنی تھی۔ کالے کوٹ اور قانون کی پیچیدگیاں الجھنی تھیں۔ اس کو اپنا گھر حاصل کرنا تھا۔ بدر اعجاز کو کٹہرے میں لانا تھا۔ ارحم بھی سنجیدہ رہنے لگا تھا۔ دو سال بعد سکندر زمان کے انتقال کے بعد وہ باہر پڑھنے چلا گیا۔ زندگی سب کی اچھی گزر رہی تھی۔ وہ ہنستے تھے، خوشیاں مناتے تھے۔ جھگڑتے تھے اور مان جاتے تھے۔ بزنس پہلے جیسا نہیں رہا تھا مگر اب بھی چل رہا تھا۔ پھر بھی ماضی ایک لوہے کی زنجیر کی طرح ان کے پاؤں سے اب بھی چمٹا ہوا تھا۔

☆☆☆

عروش اور سومارہ کا ایک ہی کمرے میں رہنا دونوں کے لیے تب تک باعثِ خوشی تھا جب تک سومارہ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد سومارہ کی سرفراز المعروف بنی سے چیٹنگ کا سلسلہ ہر وقت چلتا رہتا۔ وہ روز رات بلا ناغہ نو بجے کے خبرنامے کی طرح بات بھی کرتے۔ سومارہ شادی کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے منہ پر ہر وقت اوڑھنے پہننے کی باتیں ہوتیں۔ سرفراز بھی جاے وار کے قصے کمال ضبط سے سنتا تھا۔

سومارہ نے موبائل کی جان تب چھوڑی جب بیٹری بالکل ڈیڈ ہو گئی۔ وہ یو-پی-ایس پر چارج

کرنے کی نیت سے لاؤنج میں آئی تو عروش کی چھوٹی بہن ارم رازداری سے فون پر بات کر رہی تھی۔

"جی ارحم بھائی، میں نے سب نوٹ کر لیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔" ارم نے ایک پرچی مٹھی میں دبائی۔

"میں جانتی ہوں آپ نے سرپرائز دینا ہے میں کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ آپ آ رہے ہیں۔ خدا حافظ۔" اس نے کسی ایجنٹ کی طرح فون بند کر دیا۔

"ارم! کس سے بات کر رہی تھیں؟" وہ سب کچھ سن کر بھی انجان بنی۔

"میں اپنی سہیلی سے اسائمنٹ کا پوچھ رہی تھی۔" ارم نے پرچی والا ہاتھ اپنی پشت پر کر لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

انسان عموماً غلط فہمی میں رہتا ہے کہ محبت کرنے والوں کا ساتھ اس کی طاقت ہے۔ اسے اپنی اصلی قوت کا علم تنہائی میں ہوتا ہے۔ جب کوئی سہارا موجود نہ ہو تو اپنے قدموں پر بھروسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ تمام پوشیدہ صلاحیتیں نکل کر باہر آتی ہیں جن کا کبھی اسے علم بھی نہ تھا۔ عروش بھی بالکل تنہا تھی جب اسے گاڑی کے وائپر میں گلابی پرچی پھنسی ہوئی نظر آئی۔ اس بار اسے خوف نہیں غصہ آیا تھا۔ جیسے کوئی کٹھ پتلی بنا کر اس کی رسیاں کھینچ رہا ہو۔ اسے کسی دوسرے کی دکھائی راہ نہیں چاہیے تھی۔ یہ قصہ اسی روز ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر عروش نے تیزی سے گاڑی چلا دی۔ مگر وہ سوچ سمجھ کر پھنسایا ہوا کاغذ گاڑی کے وائپر سے جدا نہ ہوا اور حوصلے کے ساتھ شیشے پر پھڑ پھڑاتا رہا۔ عروش نے گھر پہنچ کر جب گاڑی بند کی تب بھی وہ پرچی وہیں موجود تھی۔

"بڑے دنوں سے تمہارے غصے کا ناغہ تھا، اب تمہیں طیش میں دیکھا ہے تو تسلی ہوئی ہے کہ سورج مشرق سے ہی نکل رہا ہے۔" سومارہ نے پیر پٹختی عروش کی آمد پر تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔

جواب میں عروش نے سومارہ کو پرچی تھما دی جس پر ایک ریسٹورنٹ کے نام کے نیچے جمعہ چار بجے درج تھا۔

"یعنی تمہیں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔" سومارہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پر میں نہیں جاؤں گی۔" عروش کا فیصلہ بالکل فطری تھا۔

"ایسا نہ کرو، بھائی کے سارے پلان پر پانی پھر جائے گا۔" سومارہ بے دھیانی سے بولتے ہوئے ایک دم چوکنا ہو گئی۔ وہ ارحم کے راز کو یوں افشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ کون یوں رقعے بھیج رہا ہے۔" سومارہ نے سنبھل کر کہا۔

"اوچھی حرکتوں کو اچھے طریقے سے بڑھاوا دینے کے علاوہ بھی زندگی میں کئی کام ہیں۔" عروش نے وہ کاغذ چار ٹکڑوں میں پھاڑ کر دوبارہ سومارہ کے ہاتھ میں تھمایا۔

"اور اگر یہ سلسلہ نہ رکا تو تم کیسے کھوج لگاؤ گی کہ اس کے پیچھے کون ہے۔" سومارہ کو پھٹے ہوئے کاغذ میں ارحم کے بکھرے ارمان نظر آ رہے تھے۔

"تم چاہتی ہو میں ایک انجان شخص کے بے ہودہ بلاوے پر ملنے چلی جاؤں؟" عروش کو سومارہ کی عقل پر حیرت ہو رہی تھی۔

"مجھے نہیں لگتا وہ شخص انجان ہوگا۔ ویسے بھی ایک معروف ریسٹورنٹ میں دوپہر کے وقت جانا خطرناک کیسا؟" سومارہ گویا دھکا دے کر اسے بھیج رہی تھی۔

"میں کسی کے غلط ارادے کو شہ نہیں دینا چاہتی۔" عروش نے دوٹوک کہا۔

"بیچ میں لٹکنے سے بہتر ہے اس کو اور خود کو پار لگا دو۔"

سومارہ ہر زاویے سے اس کو قائل کر رہی تھی۔ عروش نے تسلی سے سوچا، سومارہ صحیح کہہ رہی تھی۔

اسے اپنے مقابل کا علم ہونا چاہیے تھا۔
"ٹھیک ہے پھر تم میرے ساتھ چلو گی۔" عروش نے کہا۔
اس تجویز پر سومارہ ہڑبڑا گئی۔ عروش کو اکیلے جانے پر آمادہ کرنے میں اسے پوری رات لگ گئی۔

☆☆☆

وہ ریسٹورنٹ کے بالکل درمیانی سیٹ پر بیٹھی مضطرب انداز میں دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اس کا پاؤں بے چینی سے جنبش کر رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا عروش پوری طرح متوجہ ہوئی۔ آنے والا ریسٹورنٹ کا ایک ویٹر تھا۔ وہ جھینپ گئی۔ دیکھنے والے اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ کالج میں اسے سکھایا گیا تھا کہ اپنی اندرونی کیفیت یوں عیاں ہونے دینا وکیل کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمیٹا جیسے بہت اہم کیس لڑنے جا رہی ہو۔ کورٹ میں آپ کے الفاظ اہم ہونے چاہئیں نہ کہ آپ کا لباس۔ وہ گرے رنگ کا پلین سوٹ پہن کر آئی تھی۔ کندھے پر ایک طرف ڈالے ہوئے دوپٹے میں سفید دھاریاں تھیں۔ کانوں میں ایک موتی نگ والے ٹاپس تھے اور انگلی میں جیڈ اسٹون کی مردانہ انگوٹھی جس کے بارے میں اس کا ماننا تھا کہ وہ اس کو مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ وہ آنے والے کو یہ نہیں دکھانا چاہتی تھی کہ وہ اتنی غیر مصروف ہے کہ ایک بلاوے پر آ گئی۔

اس نے بیگ سے ایک کاپی پنسل نکالی اور بہت انہماک سے اپنی گروسری لسٹ لکھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت اہم کام کر رہی ہے۔ اپنے چہرے پر نظر آنے والے تمام بے چینی کے تاثرات ہٹا کر وہ کمر اکڑا کر اعتماد سے بیٹھ گئی۔ اگر اس میں کہیں بھی کوئی کمزوری تھی تو اس کے رعب سے بیٹھنے سے صرف اس کے کردار کی مضبوطی ہی عیاں تھی۔ یہی تاثر وہ آنے والے کو دینا چاہتی تھی۔ اب جب دروازہ کھلا تو اس نے گردن اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ اپنے کام میں مگن رہی۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا تھا

کہ آنے والا ایک مرد ہے۔ کیمل کلر کی ڈریس پینٹ اسے نگاہ اٹھائے بغیر بھی نظر آ رہی تھی۔ آنے والا منتظر کو ہاتھ ہلا کر اس کی ٹیبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ذہن میں ایک اور کورٹ ایکسرسائز کی۔ اس نے پہلے ہی تین بدترین باتیں آنے والے سے منسوب کر لیں تا کہ مزید کوئی بات عروش کو شاک نہ کر سکے۔

اول، وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے پاس عروش کی قابل اعتراض تصویریں ہیں۔ جو کہ ناممکن تھا مگر وہ بدترین سوچ رہی تھی۔

دوم، وہ کوئی کالج کا لڑکا تھا جو اس کو پرینک کر کے اب بدلہ لینے والا تھا۔

سوم، وہ سرفراز تھا۔

عروش نے سوچا کہ جو بھی ہو گا ان تینوں باتوں سے برا نہیں ہو سکتا۔ عروش نے اپنے چہرے پر ایسی تحریر لکھی جیسے بے حد معروف زندگی سے اسے ایک بے کار سے کام کے لیے بلایا گیا ہو۔ اسی اکتائی نگاہ سے اس نے نظر اٹھا کر اس شخص کو دیکھا جو کیمل کلر کے سوٹ میں ملبوس تھا نیچے گول گلے والی سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ایسے اعتماد سے آگے آ رہا تھا جیسے ہوا تک اس کی زرخرید ہو۔ عروش نے اس کی شکل میں شناسائی ڈھونڈ لی۔ وہ شناسائی اسے پیچھے کھینچ کر سومارہ کے نکاح کی رات لے گئی۔

گجروں کا تھال تھامے وہ کیاری کی مٹی میں دھنسی مدد کو پکار رہی تھی۔ تب کہیں اچانک سے یہ شخص برآمد ہوا تھا۔ اس نے صرف دو لفظ بولے تھے۔ "ٹھہریں" پھر آہستگی سے اس کا دوپٹا دوپٹا آزاد کر کے کہا تھا۔ "ہو گیا۔"

عروش نے پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا اور شکریہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔ اسے لگا کوئی مہمان ہو گا۔

آنے والا کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"عروش حیدر۔" یہ جیسے اس شخص کے سلام کرنے کا طریقہ تھا۔

"جب دو افراد میں ایک نام سے انجان ہو تو دوسرے کو نام کے استعمال کی اجازت نہیں ہوتی۔" یہ عروش کا نام پوچھنے کا انداز تھا۔

وہ جیب سے سگریٹ نکال کر ہلکا سا مسکرایا۔

"اگر آپ میرے بارے میں ہر معلومات پر اپنی ایک معلومات دینے کی شرط عائد کر رہی ہیں تو یہ آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

اس کی رنگت گندمی تھی چوڑا چہرہ سنجیدہ تاثرات شکاری آنکھیں، کشادہ ماتھے کے اوپر کالے بال ایک طرف سے مناسب پھولے ہوئے تھے۔

"مجھے پہیلیوں میں پھنس کر وقت ضائع کرنا پسند نہیں مگر لگ رہا ہے آپ اس کا خاص شوق رکھتے ہیں۔" اب وہ واقعی اکتا گئی تھی۔

"سادے الفاظ میں کہا ہوتا تو آپ یہاں آتیں۔" وہ بے حد اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"اور میں یہاں کس سے ملنے آئی ہوں؟" اس بار عروش نے سیدھا پوچھا۔

"بدر اعجاز۔"

اس کا مختصر سا جواب عروش کو پہلی بار ہی سمجھ میں آ جاتا۔ اگر اس نام کا ہر ہجہ عروش کے جسم میں خنجر کی طرح پیوست نہ ہوا ہوتا۔

"آپ بدر اعجاز کے بیٹے ہیں؟" حیرت اور غصہ دونوں ایک دوسرے پر غالب آنے کی جنگ کر رہے تھے۔ یہ تو اس کی بدترین سوچ نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"آپ کی معلومات کچھ کمزور ہیں، بدر اعجاز پینتیس سال کی عمر میں اب تک غیر شادی شدہ ہے اور بدر اعجاز میں ہوں۔"

حیرت جیت گئی۔ عروش جو ابتدا سے ٹھوس انداز میں بیٹھی تھی اپنے تاثرات چھپانے میں ناکام ہو گئی۔ جس شخص کو وہ اپنی باپ کی عمر کا سمجھتی تھی وہ تو اب بھی کسی حد تک جوان تھا۔ تو آٹھ سال پہلے تو لڑکا ہوتا ہوگا۔ اتنے سالوں جیسے ایک سراب میں گزارے تھے۔ کئی لمحے وہ خاموش بیٹھی جائزہ لیتی رہی اور بدر اس کے انگوٹھے میں پہنی مردانہ انگوٹھی دیکھتا رہا۔ وہ تو اس ہی گلابی شاعرانہ انداز میں آیا تھا جس میں اس نے رقعے بھیجے تھے۔ مگر بازی پلٹ گئی تھی۔ عروش کے لیے بدر اعجاز بدقسمتی کی وہ علامت تھا جس نے اس کا گھر برباد کیا تھا اور وہ آج اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"تو پھر آپ کی جرات کیسے ہوئی حیدر زمان کی بیٹی اور سکندر زمان کی بھتیجی کو اس انداز میں پرچیاں بھیجنے کی۔" اسے مضبوطی کے لیے کسی ڈھونگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے اندر موجود سالوں کا غصہ اس کی رگوں کو سریا بنا رہا تھا۔

بدر سگریٹ جلاتے جلاتے رک گیا۔ وہ اس خوش فہمی میں آیا تھا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور عروش بھول بیٹھی ہے۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ عروش وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہا تھا۔

"میں نے آپ کو بلانے میں جلد بازی کر دی۔ اکثر آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" بدر نے ہاتھ میں موجود سگریٹ کے دو ٹکڑے کر دیے۔

اتنے میں ویٹر منٹ لیمنیڈ لے آیا جس میں ماحول کے برعکس برف اور پودینے کے ذرات تیر رہے تھے۔ عروش نے نظر ہٹا کر اپنے اطراف کا معائنہ کیا۔ وہاں گملے اور ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ پہلے موجود افراد اب جا چکے تھے۔

"میں چاہتا تھا ہم بغیر کسی مداخلت کے اطمینان سے بات کر سکیں۔" بدر نے اس کی نگاہ پڑھ کر جواب دیا۔

ویٹر جا چکا تھا۔ عروش کو اگر خوف زدہ ہونا چاہیے تھا تو وہ اشتعال میں آ گئی۔

"مجھے اندازہ ہے آپ جیسے انسان کے لیے لوگوں کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا ہوگا۔" اس نے تنہائی کی خواہش کو دوسرا ہی رنگ دے دیا۔

"آپ نتائج پر بہت جلد پہنچ جاتی ہیں۔" اس بار وہ غیر آرام دہ تھا۔

"میں نتائج پر پہنچانے کے عزائم بھی رکھتی ہوں۔ اگر آپ مجھے دھمکانے آئے ہیں۔ تو میں آپ کو بتاتی چلوں۔ آٹھ سال پہلے آپ جیتے تھے۔ ہمارا گھر بکا تھا۔ بزنس کمیونٹی میں ہماری ساکھ خراب ہوئی تھی۔ اپنے گھر کو ہم "تبسم منزل" کہتے تھے۔ آپ کی وجہ سے فیکٹری خسارے میں گئی۔ دادی مسکرانا بھول گئی تھیں۔ نیلامی سے پہلے اس گھر میں میری دادی کا جنازہ ہوا تھا آپ کی وجہ سے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ آپ گڑھے مردے اکھاڑنے کا ارادہ کیوں رکھتی ہیں؟"

اسے عروش کی تلخی نے بھلا ہی دیا تھا کہ وہ یہاں کیا کہنے آیا تھا۔ آتے وقت بدر کا انداز ایسا تھا کہ جیسے ہر چیز اس کی گرفت سے ایک لمحہ دور ہو۔ تب عروش گھبرائی تھی۔ اب بدر تہی دامن دکھ رہا تھا۔ اس لیے عروش دبنگ ہو گئی تھی۔

"آخری بات۔ کوشش کیجیے گا کہ اب میرے اور میرے گھر والوں کے راستے میں آپ کا آنا نہ ہو۔ ورنہ میں گزری ہوئی ایک ایک بات کا حساب لے کر رہوں گی۔ بہت جلد آپ کی ہار کا سلسلہ شروع ہوگا۔" وہ غصے سے بیگ اٹھا کر ریسٹورنٹ سے نکل گئی اور بدر اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

"میں نے پہلی بات بھی نہیں کی اور تم نے آخری بات بھی کہہ ڈالی۔ عروش حیدر زمان عرف بندریا۔ میری ہار کا سلسلہ تو شروع ہو گیا ہے۔"

ٹیبل پر کچھ نوٹ رکھ کر۔ بدر نے اپنا سستا دیسی سگریٹ جلایا۔ وہ مہنگے کپڑے پہننے لگا تھا۔ لمبی گاڑی میں گھومتا تھا۔ امیروں کی طرح گھر سجا رکھا تھا اور ضرورت سے زیادہ ملازم بھی رکھ لیے تھے۔ مگر سگریٹ کے معاملے میں اس کا طلب اب بھی سستے برینڈ کے سگریٹ سے ہی بجھتی تھی۔

عروش اپنی سوچوں میں الجھی واپس گھر لوٹی تو لاؤنج میں عید کا سماں تھا۔ تائی امی چھ فٹ کے ارحم کو سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔ جیسے گرفت ڈھیلی کی تو اڑن چھو نہ ہو جائے۔ معاذ اور ارم کے ہاتھ میں وہ تحائف تھے جو ارحم ان کے لیے باہر سے لایا تھا۔ آمنہ بیگم نے لنچ کا طویل مینیو بنانے کی ٹھان لی تھی اور وہیں بیٹھی لاؤنج میں سبزی بنا رہی تھیں۔

"السلام علیکم وکیل صاحبہ۔ ہماری بندریہ تو وکیل بن گئی۔" ارحم نے اٹھ کر اسے ادب سے سلام کیا وہ جینز ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت فریش لگ رہا تھا۔

"واٹ آ سرپرائز۔" اس نے کہہ تو دیا مگر ذہنی طور پر وہ اب بھی پچھلے سرپرائز کے زیر اثر تھی۔

سومارہ نے بھی عروش کو دیکھا۔

"تمہیں کسی نے بے وقوف بنا دیا۔ مجھے لگ رہا تھا۔ بھائی تو سیدھا گھر آگئے تھے۔" سومارہ نے خود ہی ساری کہانی سمجھ لی۔

"میرا بیٹا آگیا ہے اب دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زمان برادرز کا نام پھر سے اونچا ہوگا۔" صفیہ بیگم ارحم کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگیں۔

عروش اتنی بری طرح ہلی ہوئی تھی کہ دو اور دو چار بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

☆☆☆

اسے ہمیشہ سے اپنی دھوکہ بازی پر فخر رہا تھا اور صحیح بھی تھا۔ یہی اس کا امتحان ہوتا تھا اور یہی اس کی کمائی۔ ارسلان بھی اس کی زلفوں کی تعریف نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی شاطرانہ اداؤں کے قصیدے کہتا تھا کہ کیسے وہ نگاہوں سے ہی اگلے کو دیوانہ کر دیتی ہے۔

رانی نے ساری عمر روایات سے ہٹ کر گزاری مگر بڑھاپا اس پر بھی روایتی آیا تھا۔ سردیوں میں وہ جلد لحاف میں لیٹ جاتی تھی۔ وہ بہت کہنے پر بھی ساتھ نہیں آئی تھی۔ صرف ارسلان اور وہی باہر آئے تھے۔ ارسلان دیسی تھا۔ امیروں کے پہناوے میں اس کا دم گھٹتا تھا اور امیروں کے کھانے اسے بے سوادے لگتے تھے۔ اس نے سوپ آرڈر کیا تھا اور ارسلان نے وہی نان تکا۔ سڑک کے کنارے لگی پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے وہ اپنا گرم کھانا کھا رہے

تھے۔ ساری دنیا کے لیے وہ چنڈال تھی۔ لیکن ارسلان کے معاملے میں وہ فرشتہ بن جاتی تھی۔ ابھی نکاح کے دو بول نہیں پڑھے گئے تھے۔ تو کیا ہوا وہ تو آنکھ کھلنے سے جانتے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہیں۔ رانی کے سوا ان کا اور تھا ہی کون۔ وہ بھی اتنی بار یہ کہتی تھی کہ ارسلان اور وہ ایک دوسرے کے ہیں کہ اب ان کا رشتہ سند اختیار کر چکا تھا۔ ان کا کام اصولوں والا نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ایک اصول بنا لیا تھا کہ جو مرضی کر لے ارسلان اور رانی اماں سے دو نمبری نہیں کرے گی۔

"نیلے رنگ میں اچھے لگ رہے ہو۔" اس نے سوپ پیتے ہوئے ارسلان سے کہا۔ ارسلان بڑھی ہوئی الجھی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے بوٹیاں کھانے میں مصروف تھا۔ وہ ویسے ہی بھرے منہ کے ساتھ مسکرا دیا۔

"میں ہوں ہی اچھا اس لیے لگتا ہوں۔" اس نے غرور سے کہا۔

وہ بھی مسکرادی غرور میں تو وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

"اس بار اچھی کمائی ہوئی ہے۔ چل کہیں گھوم آئیں۔" اس نے مشورہ دیا۔

"یہ گھوم ہی تو رہے ہیں۔" ارسلان نے رائتے کے پیالے میں سوڈا ڈالا۔ اور ہاضمے کے لیے وہ پینے لگا۔

"ہاں، مگر میرا بھی دل کرتا ہے ہم ہوٹل میں رہیں۔ کسی دوسرے شہر کا نظارہ کریں۔ وہاں کے پارکوں میں گھومیں۔" وہ اب اٹھارہ سال کی ہوگئی تھی۔ اس لیے ارمان بننے لگی تھی۔

"اتنا دل ہے تمہارا تو دو چار شکار اس شہر میں اور کر لیتے ہیں۔ پھر مستقل کسی اور شہر چلے جائیں گے۔" ارسلان ہمیشہ پلاننگ ہی کرتا رہتا تھا۔ وہ بھی چپ ہوگئی۔ سوپ پی کر اس کو شدید گرمی لگنے لگی تھی۔

"چل جا کے ٹھنڈا میٹھا پان لا دے۔" وہ جانتی تھی ارسلان کھانا کھا کر ٹھس ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اس نے فرمائش کی۔ تھوڑی دیر مسکراہٹیں اچھالنے اور منت کرنے کے بعد ارسلان مان ہی گیا اور پان لینے چلا گیا۔

"اللہ کے نام پہ کچھ دے دو باجی، تمہاری جوڑی سلامت رہے۔" دو ننھی بچیاں اپنے قد سے لمبی چادریں لپیٹے اس کے پاس مانگنے آ گئیں۔

ویسے تو وہ خود مگموں کی پیداوار تھی اور جانتی تھی کہ مانگنے والوں کی اصلیت کیا ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے دعا ہی ایسی دی تھی کہ اس سے رہا نہیں گیا۔ ارسلان اپنا بٹوا ساتھ لے گیا تھا۔ مگر اس کا موبائل پڑا تھا۔ ارسلان موبائل کے کور میں کھلے پیسے رکھتا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے ارسلان کے موبائل کور سے سو سو کے دو نوٹ نکال کے بچیوں کا دیے۔ غیر ارادی طور پر اس نے موبائل کا پیٹرن ڈالا اور ارسلان کا موبائل دیکھنے لگی۔ وہ ارسلان کا موبائل چیک نہیں کرتی تھی اس لیے ارسلان نے سالہا سال سے ایک ہی پیٹرن رکھا ہوا تھا۔ سب کچھ بہت جلد بہت بدنما ہو گیا۔ ارسلان کے موبائل میں عورتوں کی بیہودہ تصویریں تھیں۔ گہرے گلے، ضرورت سے زیادہ میک اپ، دعوت دیتی ادائیں۔ وہ انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی گئی تصاویر نہیں تھیں۔ وہ ساری تصاویر ایک آدمی نے ارسلان کو ریٹ لسٹ کے ساتھ بھیجی تھیں۔ اور ارسلان نے جواب میں شارٹ لسٹ بھی کی ہوئی تھیں۔ حرام کا پیسہ حرام کاموں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ پھر بھی اسے بہت بڑا شاک لگا تھا۔ ارسلان یہ سب بھی کر رہا تھا؟ بات تو بے وفائی کی تھی۔ اس کا تو پیشہ ہی یہ تھا کہ مرد سب کچھ اس پر لٹانے کو تیار تھے۔ مگر اس نے بھی ارسلان کے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے بڑی گاڑیوں میں آنے والوں کی جگہ یہ اپنا بائیک والا ارسلان ہی پسند تھا۔ لیکن ارسلان کے لیے وہ کافی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ وہیں پہ جم گئے اور نگاہیں پتھرا گئیں۔

"لے تیرا پان لے آیا ہوں۔ تو بھی نہ مجھ سے بڑے کام کروائی ہے۔" وہ اتنی سی بات بھی جتائے بغیر نہیں کرتا تھا۔

"میرے علاوہ یہاں اور کس کے ساتھ آتا ہے تو؟"

"تیرے علاوہ ہے ہی کون میرا۔" ارسلان جب بھی اس کو بھتھے سے اکھڑتا دیکھتا۔ ایسے ہی میٹھی باتوں پر آجاتا تھا۔

"میرے علاوہ کوئی ایک نہیں ہے تو نے تو دکاندار سے ہی ڈیل کر رکھی ہے۔" اس نے موبائل کھول کر ٹیبل پر پٹخا۔

"تو میں نے کیا نکاح پڑھا لیا ہے جو اتنا بول رہی ہے۔ اتنا تو ہر آدمی کا بنتا ہے۔"

"کل کو تو نکاح پڑھوا کر آ جائے گا اور کہے گا چار کی تو اجازت ہوتی ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"جو سب تو کرتی ہے میں نے کبھی شکوہ کیا۔ اس دن تنویر کے ساتھ میں پکڑنے نہ آتا تو تو حد ہی پار کر جاتی۔" ارسلان نے بازی اس کی سمت پلٹ دی۔

"میں تنویر کے ساتھ اس دن گئی ہی اس لیے تھی کہ میں جانتی تھی کہ تو پیچھے سے آئے گا۔ یہی تو پلان تھا۔" وہ حیران رہ گئی۔

"اس کے بعد بھی تو تم نے ایک مرغا پھنسایا تھا جو تمہیں لانگ ڈرائیو پر لے کر جاتا تھا۔ میں بولتا نہیں ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے معلوم نہیں۔" وہ الٹا ناراض ہونے لگا۔

"تو جانتا ہے میرے دل میں کچھ نہیں تھا وہ تو بس کام تھا۔" وہ وضاحتیں دینے لگی۔

"ہاں تو یہ بھی میرا کام ہے۔ تم جانتی نہیں ان عورتوں کے پاس بڑی اسامیوں کا کچا چٹھا ہوتا ہے۔ میں بھی ان کے ذریعے اپنا کام ہی بڑھا رہا ہوں۔ کب تک یہ مہران سوزوکی والوں کو ٹھگنا ہے۔ ان کی تو گاڑیوں کی بھی اتنی قیمت نہیں جتنا کوئی مرسیڈیز والا بندہ کھڑے کھڑے تم پر لٹا سکتا ہے۔" اس نے اس بار پیار سے کہا اور وہ واقعی ہی سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"دیکھ ارسلان، میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ بڑا ہاتھ مارنے کے لیے جو بڑی قربانی دینی پڑتی ہے مجھ سے نہیں ہوگی۔ تو کوئی اور طریقہ ڈھونڈھ۔" اس کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔

"لے اب اتنی بے اعتباری تو نہ کر۔ میں اور طریقے ڈھونڈھ رہا ہوں۔ شادی کے بعد تم سے یہ سب تھوڑی نہ کرواتا ہے میں نے۔" اس نے جان کر شادی کی بات چھیڑی۔ وہ چپ ہو گئی۔

وہ جب سے برائی کے گڑھے میں آئی تھی یہی ہو رہا تھا۔ ہر چیز پہلے اسے چونکاتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اسے اس سب کی عادت ہوتی گئی تھی۔ پھر کوئی نئی غلاظت اسے چونکاتی اور پھر دوبارہ اسے اس کی عادت ہونے لگتی۔ اب ارسلان کی رنگین مزاجی اسے بری طرح سے دکھی کر گئی تھی۔ مگر یہ بھی ارسلان کے چند دلائل کی مار تھی۔

☆☆☆

بدر بے مقصد گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا باپ خاندان کا سب سے پڑھا لکھا آدمی تھا۔ وہ روز اچھی وردی پہن کر تھانے جاتا۔ تھا وہ سپاہی مگر خاندان میں اس کو جرنیلوں والی عزت ملتی تھی۔ پھر وہ ڈیوٹی میں ہلاک ہو گیا۔ بدر کے بعد دو بہنیں اور ایک بھائی اور بھی تھے۔ ماں ان کی گھریلو عورت تھی۔ ایک دم سے وہ خاندان کی قابل احترام فیملی سے گر گئے۔ سب کو وردی بھول گئی۔ یاد رہی تو وردی میں لی گئی کبھی کبھار کی رشوت۔ سب ہی ان سے پلا چھڑانے لگے تو بدر عمر سے پہلے بڑا ہو گیا۔ پڑھائی میں اس کا دل ویسے ہی نہیں لگتا تھا۔ اس نے آٹھویں کے امتحان سے پہلے پڑھائی چھوڑ کر نوکری کر لی۔ اب وہ اپنی گاڑی کو ان پرانی گلیوں میں لے گیا جہاں وہ بچپن میں بڑے خواب دیکھتا تھا۔ ایک سیاستدان نے محلے سے الیکشن جیتنے کے لیے۔ اس جیسے محلے کے لڑکوں کو آگے لگا لیا۔ ان لڑکوں نے پوسٹر لگائے۔

تقریریں کیں۔ گھر گھر جا کر ووٹ مانگے۔ یہاں تک کہ اپنے لیڈر کے لیے ہلڑ بازی کرنے پر چند روز جیل بھی رہ آئے۔ ان کا لیڈر جیت گیا اور ان کو بھول گیا۔ بدر کو تب سمجھ میں آیا کہ امیر اور غریب کے لیے اصول فرق ہیں۔ غریب ووٹر ایک رات کی دلہن ہوتا ہے۔ اس نے دوسروں سے امید لگانے کے بجائے زندگی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ دو تین قسم کی نوکریاں کرتا۔ اس نے گاڑی کو سڑک کنارے بریک لگا دی اور ڈوبنے کے قریب سورج دیکھنے لگا۔

☆☆☆

ہانیہ کی این۔جی۔او "تعبیر" اپنے سے ملحقہ جانی مانی کاٹھی لاء فرم سے بے حد مختصر اور سادہ تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ اس این۔جی۔او کی کامیابی میں ہانیہ کے والد کا ہاتھ تھا۔ مگر اس کے باوجود ہانیہ اور اس کی ٹیم کے جذبے اور محنت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہانیہ اپنی مخصوص پونی اور ہلکے فریم کے گلاسز میں گویا ایک ہی دن میں دنیا فتح کرنے کا عزم لیے کام کر رہی تھی۔ عروش نے دروازے پر دستک دی۔

"ہم ان نابالغ بچوں کی فلاح کے لیے کام کرتے ہیں۔ جو بے گھر ہیں۔ اسٹریٹ چلڈرن۔ تمہیں تفصیل بتا دوں تو تم ہل جاؤ گی کہ ننھے بچوں سے کس قسم کے کام لیے جاتے ہیں اور وہ بہک کر چند پیسوں کی خاطر کیا کر جاتے ہیں۔" ہانیہ بتا رہی تھی۔

"بچے ہماری قوم کا بوجھ نہیں، ہمارا سرمایہ ہیں۔" عروش نے تشویش سے کہا۔

"بہت سے بچے ہیں جو اپنا راستہ بدلنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں سیدھا راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی ٹھکانہ ہے جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکیں۔ ہم ایسے بچوں کے کیس مفت لڑتے ہیں کیونکہ جیل کا ماحول ان کی بری عادتوں کو پختہ کر دیتا ہے۔ اس ہی آفس میں سردیوں میں تین بجے کے بعد اور گرمیوں میں پانچ بجے کے بعد باہر لان میں ہم پڑھائی کرواتے ہیں۔ لیکن تم جانتی ہو وہ بچے پڑھائی کے شوق میں نہیں آتے۔ وہ اس کھانے کے شوق میں آتے ہیں۔ جو انہیں روزانہ پڑھائی کے بعد دیا جاتا ہے۔"

"یہ تو بہت نیک کام ہے۔" عروش کالج میں ہانیہ کی جونیئر تھی۔

"لیکن یہ آسان نہیں۔ ہمیں پل پل معاشرے اور ان بچوں کے درمیان وسائل پیدا کرنے ہوتے ہیں اور بار بار بچوں کو بھٹکنے سے روکنا ہوتا ہے۔"

ہانیہ کے پاس قانونی پیچیدگی اور معاشرتی ناہمواریوں کی اتنی بڑی فہرست تھی کہ وہ گھنٹہ بھر بات کرتے رہے۔ ہانیہ نے ان بچوں کی فائلیں بھی دکھائیں جو اب اسکول جاتے تھے۔ یا کوئی عزت دار کام کر رہے تھے۔ ان کی این۔جی۔او، ڈونر بیسڈ تھی۔ عملے کو تنخواہیں بھی ملتی تھیں۔ مگر واضح تھا کہ یہ کام صرف تنخواہ کی محبت میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کام کے پیچھے فلاحی جذبہ تھا۔ این۔جی۔او کے باقی افراد سے مل کر عروش کا جذبہ دگنا ہو گیا۔ وہاں سب سے پھرتیلا شخص حماد تھا۔ جس نے جنرلزم پڑھا تھا۔ وہ جب دفتر آتا تھا بائیک پر چند بچے لٹک رہے ہوتے تھے۔ وہ کلاس لے کر کھانا کھا کر حماد کے ساتھ ہی واپس جاتے۔ وہ سڑکوں پر ان بچوں کے مسائل سنتا تھا۔ ان کے حل نکالتا تھا۔ حماد حقیقت میں پتھر تراش کر جو ہر بنا رہا تھا۔ عروش متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ان کے جذبے سے اتنی متاثر تھی کہ اسی وقت نوکری قبول کی اور کام شروع کر دیا۔

"تم بہت اہم موقع پر آئی ہو۔ کل ہماری ایک ایسے انسان سے میٹنگ ہے جو خود سڑکوں پر پلا بڑھا ہے۔ وہ اگر بطور ڈونر بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا تو ہمیں بہت فائدہ ہے۔" حماد بتا رہا تھا۔ "اور اگر انہوں نے اپنا نام اور وقت دینے کا فیصلہ کر لیا تب تو سونے پر سہاگا ہو جائے گا۔ تم اور میں جب ان بچوں کو خواب دکھاتے ہیں تو انہیں سب جھوٹ لگتا ہے۔ لیکن اگر بدر اعجاز جیسا انسان۔ بچوں سے یہی باتیں کرے گا تو بچے سچ مانیں گے۔" ہانیہ اسے کل کی

میٹنگ کی اہمیت کا بتا رہی تھی۔

"بدر اعجاز؟" عروش کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"ہاں ابھرتا ہوا بزنس مین ہے۔ اپنے پرانے محلے کے غریب جاننے والوں پر بہت پیسہ لٹاتا ہے۔ ایک بچہ ہمارے پاس کلاس لینے آتا تھا۔ بہت ذہین تھا۔ پھر بدر اعجاز نے اسے نوکری دے دی۔ اس نے ہی جاتے ہوئے تفصیل بتائی تھی۔" حماد بتا رہا تھا مگر وہ نہ سن رہی تھی نہ سمجھ رہی تھی۔

"وہ صرف پیسہ دیتا ہے۔ وہ کسی کو صحیح راستے کا پابند نہیں کرتا۔ ایسے تو بچے مزید بھٹک جائیں گے۔ اس لیے میں ان سے ملا تھا۔ میں نے خاص انہیں اس وقت بلایا ہے۔ جب یہاں کلاس ہو رہی ہو۔ تاکہ وہ ہمارے کاز کو سمجھیں۔" حماد دنیا دیکھ چکا تھا۔ اس جیسا انسان بدر اعجاز کا نام اس قدر عزت سے کیوں لے رہا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے بدر اعجاز ایک فراڈ ہے؟ اس نے اپنا سارا بزنس دو نمبر طریقوں سے کھڑا کیا ہے۔" عروش بدتمیزی سے بولی۔

"تم جانتی ہو اسے؟" ہانیہ نے عروش کے چلانے پر پوچھا۔

☆☆☆

بدر اعجاز نے چاہا تو یہی تھا کہ جیسے اس کی راتیں عروش کے خیالوں میں گزرتی تھیں عروش کے ساتھ بھی ویسا ہی ہو۔ کہتے تھے وہ سب حاصل کر لیتا ہے تو یہ سچ تھا کیونکہ ساری رات عروش بدر کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔ لیکن اگر وہ یہ بھی کہتا تھا کہ وہ بدقسمت ہے تو یہ بھی سچ تھا کیونکہ عروش کے خیالوں میں بدر سے ملنے کی چاہ نہیں تھی بلکہ وہ اس لمحے کو سوچ کر غصے سے کانپ رہی تھی جب اسے بدر کے سامنے جانا پڑے گا۔

اس نے ہانیہ اور حماد کو نہیں بتایا تھا کہ وہ بدر کو کس طرح جانتی ہے کیونکہ اس میں اپنی ہی فیملی کے راز کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ استقبال کی ایسے تیاری ہو رہی تھی جیسے کوئی بادشاہ آ رہا ہو۔ آج کھانا بھی پہلے سے پرتکلف بنا تھا۔ عروش نے ابھی وہاں کام شروع کیا تھا وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ نہیں آئے گی۔ اسے کام پر جانا تھا اور باقیوں کی طرح بدر کو قائل کرنا تھا کہ وہ "تعبیر" کا حصہ بنے۔ ایسا نہیں تھا کہ بدر اکلوتا امیر آدمی تھا نہ ہی وہ اتنا امیر تھا کہ آنکھیں بند کر کے پیسے لٹائے۔ لیکن وہ واحد شخص یہ تھا جو اس کاز کو ایک پہچان دے سکتا تھا۔ وہ ایک سکسیس اسٹوری تھا۔ عروش اس کی اہمیت جانتی تھی۔ پھر بھی بدر کا چہرہ سامنے آتے ہی اس کا دل کرتا تھا کہ اس کا سر پھاڑ دے۔

جب سب باہر بدر اعجاز کو ریسیو کرنے گئے تو وہ اپنی سبز مردانہ انگوٹھی بے چینی سے گھماتی رہی۔ پھر اس نے زبردستی ایک فائل اٹھالی اور کونے میں کھڑی ہو کر پڑھنے لگی۔

"سر آئیں، یہ ہمارا آفس ہے۔" حماد نے پہلے بدر کو باہر ہو رہی بچوں کی کلاس دکھائی تھی۔ پھر اسے اندر لے آیا تھا۔ ساتھ باقی عملہ بھی آ گیا۔

آفس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دو ہی کمرے تھے۔ ایک جو لنچ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور دوسرا وہی جس میں وہ ابھی تھے۔ عروش کے لیے چھپنا مشکل تھا۔

"ویری بیوٹیفل۔" بدر نے کہا۔

عروش فائل اپنے ہاتھ پر مارتی مڑی۔ اسے یقین تھا یہ کمنٹ اس پر کیا گیا ہے۔ لیکن وہ مڑی تو دیکھا بدر کھڑکی سے باہر ایک بچے کی طرف متوجہ تھا۔ جو کھڑا ہو کر سبق سنا رہا تھا۔ ٹیچر سامنے کرسی پر بیٹھی تھیں۔ شاید بدر نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ ان چھ لوگوں میں عروش بھی تھی۔

"ابھی تو ہمارا کام چھوٹا ہے لیکن یہ بڑا بھی ہو جائے گا تو بھی میں اپنا سیٹ اپ ایسا ہی سمپل رکھوں گی۔ تاکہ اس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہیں۔" ہانیہ نے ڈونیشن پچ بنانی شروع کی۔

"ایسے دروازے کھلے رکھنے کا کیا فائدہ؟ جو

بچے آرہے ہیں وہ باہر ہی ہیں اور دری پر بیٹھے ہیں۔ "بدر نے اعتراض کیا۔

"دن کے وقت لاء فرم کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ پھر ایسے فرش پر زیادہ بچے ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں۔" ہانیہ نے وضاحت دی۔

"پھر ٹیچر کی کرسی بھی ہٹا دیں۔" بدر نے کھڑکی سے رخ موڑ کر ان سب کو دیکھا۔ عروش کو بھی۔ مگر اس کی نگاہ میں عروش کے لیے کوئی شناسائی نہیں تھی۔

"استاد کی عزت ضروری ہوتی ہے۔" حماد نے وضاحت دی۔ اگلے جملے میں وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ والنٹیرز پر انحصار نہیں کرتے بلکہ ٹیچر کو اچھی فیس دے کر بلاتے ہیں۔ تاکہ بچوں کو معیاری تعلیم ملے۔

"ان بچوں کو تعلیم کی نہیں عزت کی عادت ڈالیں۔ عزت کی بھوک وہ سب کرواتی ہے جو پیٹ کی بھوک چھین لیتی ہے۔" بدر نے آنے کے پندرہ منٹ کے اندر ہی یہ واضح کروا دیا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے چیک کاٹنے والا نہیں ہے۔

عروش اب چھپنے کی بجائے سامنے موجود تھی۔ مگر بدر کو نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

"اس لیے ہی تو ہم چاہتے ہیں آپ ہمارے ساتھ آن بورڈ آ جائیں۔ آپ پہلے بھی کتنے ضرورت مندوں کی مدد کر رہے ہیں۔ پھر ہم نے جو سسٹم بنایا ہے۔ وہ بچوں کو تحفظ اور تعلیم دونوں دیتا ہے۔" حماد متحرک ہو گیا تھا۔ بدر کو بٹھا کر اس نے اپنے کام کی نوعیت سمجھائی۔ باقی سب بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اب عروش کے دل میں بدر کا نہ پہچاننا پھانس کی طرح چبھنے لگا تھا۔

"آپ کو یہ کیوں لگتا ہے آپ کے بنائے سسٹم میں فلاح ہے؟ اگر یہ سسٹم انہیں 'عزت داروں' کی دنیا میں جگہ دلانے میں ناکام ہو گیا۔ تو وہ اپنی پرانی زندگی میں بھی مفلوج ہو جائیں گے...... " بدر نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ کسی کو اس سے ایسے منہ پھٹ رویے کی توقع نہیں تھی۔ "میرا ذاتی تجربہ ہے کہ صحیح اور غلط کے فکس فارمولے پر کام کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے۔ کامیابی قانون کو اپنے مطابق موڑنے کا نام ہے۔ اگر آپ کے ادارے میں قانون کی سمجھ بوجھ سے زیادہ اس کی پرستش سکھائی جاتی ہے۔ تو معذرت کرتا ہوں، میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" بدر مخالفت سے نہیں ڈرتا تھا۔

"جس کی نگاہ کھوٹی ہو اس کو اچھائی مشکل سے نظر آتی ہے۔" عروش کا ضبط جواب دے گیا اس نے خود کلامی کی جو ہر شخص نے سنی۔ ہانیہ اور حماد کا رنگ اڑ گیا۔

بدر نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے عروش کو دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"یہ عروش ہیں۔ انہوں نے ابھی ہماری ٹیم جوائن کی ہے۔ آپ کے پاس ہم اس ہی لیے آئے ہیں کیوں کہ ہم جانتے ہیں آپ یہ معاملات ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے تو رات کو بس اڈے پر اور دربار کے سامنے بچوں کو سوتے دیکھا تھا۔ تب سوچا کہ ایسا سیٹ اپ ہونا چاہیے۔" حماد اپنے تجربے بتانے لگا۔ مگر بدر اب بھی عروش کو دیکھ رہا تھا۔

"محترمہ! کھوٹ تو ہر شخص میں ہے۔ لیکن معاشرے کے ٹھیکے داروں کو صرف دوسروں کے عیب نظر آتے ہیں۔ اگر اس ادارے کا مقصد ایک مخصوص طبقے کو دال روٹی پر قناعت کرنا سکھانا ہے تو آپ نے غلط آدمی کو بلایا ہے۔"

"وہ تو میں جانتی ہوں۔" عروش نے پھر طنز کیا۔

"غریب روٹی کا محتاج ہو کر رہے، وہ جائز ہے۔ لیکن اگر وہ اپنا گردہ بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لے تو قانون کی نظر میں وہ مجرم کہلاتا ہے۔" بدر نے اب کے باقی لوگوں کو دیکھ کر کہا۔ عروش پھر اس کے سامنے سے غائب ہو چکی تھی۔

عروش کا ذہن چکرانے لگا تھا۔ کیا اسے غلط فہمی ہوئی تھی کہ کبھی اس ہی آدمی نے بہت رومانوی

طریقے سے اس کو ملنے کے لیے بلایا تھا۔

"لیکن "تعبیر" میں ایسی ناانصافی نہیں ہوتی۔" ہانیہ جو پہلے عروش کو غصے سے دیکھ رہی تھی اب بدر کو بتانے لگی۔

"چلیں شروع سے اسٹارٹ کرتے ہیں۔ آپ جو بھی کریں صرف یہ دھیان رکھیں کہ ان بچوں کو اپنی حالیہ زندگی سے نفرت نہ ہونے دیں۔ ورنہ وہ خود سے نفرت کرنے لگیں گے۔ باقی ہم وقت کے ساتھ دیکھ لیں گے۔" بدر نے مسکرا کر کہا۔

اس کی مسکراہٹ عندیہ تھی کہ وہ ان کا ساتھ دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"پھر چلیں ڈنر کرتے ہیں۔" تہمینہ نے لنچ روم کی طرف اشارہ کیا جو آج بدر کی آمد پر ریسٹورنٹ کے انداز میں خوب سجا ہوا تھا۔

"اندر کیوں؟ باہر بچوں کے ساتھ کیوں نہیں؟" بدر کھڑا ہو گیا۔ کوئی جواب دیتا اس سے پہلے وہ دروازے سے نکل کر باہر آ چکا تھا۔ بچے پڑھائی کے بعد اب ان ہی دریوں پر کھیل رہے تھے۔ باقی بھی باہر جانے لگے۔ مگر ہانیہ نے عروش کو دھر لیا۔

"اپنے ذاتی اختلاف 'تعبیر' کے دروازے کے باہر چھوڑ کر آیا کرو۔" ہانیہ نے اسے آئینہ دکھایا۔

"یہ آدمی ہمارے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی ثابت ہوگا۔" عروش نے کہا۔

"مت بھولو کہ یہ ایک فلاحی ادارہ ہے۔ ایسے کاموں کے لیے بے لوث ہونا پڑتا ہے۔ ہمیں بدر کی ضرورت ہے۔" ہانیہ نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

عروش نے دیکھا بدر آلتی پالتی مارے ان بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ان کا کھیل ایسے کھیل رہا تھا جیسے وہ پرانے دوست ہوں۔ بدر کیا تھا؟ وہ جو گھر والے کہتے تھے؟ یا وہ جو اب نظر آ رہا تھا؟

"میں اب دھیان رکھوں گی۔" عروش ان بچوں سے شرمندہ تھی جن کا بنتا کام اس کی وجہ سے خراب ہو سکتا تھا۔

"ہم کھانے کا سیٹ اپ باہر لے جا رہے ہیں۔ تم اندر ہی رہو۔" ہانیہ نے اب پیار سے کہا۔

اس شام باہر دریوں پر بچوں کے ساتھ آفس والوں نے بھی کھانا کھایا۔ بدر نے بچوں سے باتیں کیں۔ جبکہ عروش ویٹر کی طرح ڈشز مائکرو ویو میں گرم کر کے باہر پہنچاتی رہی۔

☆☆☆

ساری عمر غلط کام کرنے کے بعد بڑھاپے میں انسان یکدم نہیں سدھر جاتا۔ رانی بھی اپنی زندگی پر پشیمان نہیں تھی۔ اپنے گناہوں کا خیال آتا تھا تو اللہ مالک ہے کہہ دیتی۔ دل زیادہ جھنجوڑتا تو اس مالک سے کبھی توبہ بھی کر لیتی۔ اسے صرف اپنی بچی کے معاملے میں ندامت ہوتی تھی۔ اس نے جنم نہیں دیا تھا اور اسے لائی بھی کمائی کی نیت سے تھی۔ مگر اس نے اسے ماں بن کر ہی پالا تھا۔ اب کسی بھی ماں کی طرح وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ مسئلہ یہ بھی نہیں تھا۔ لڑکا تو اس کے سامنے ہی تھا، "ارسلان"۔ جو اس کا سگا بیٹا تھا۔ اس نے ہمیشہ یہی چاہا تھا کہ "ارسلان" کی شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ ساری عمر مل کر کام بھی کریں اور مل کر زندگی بھی گزاریں۔

مگر اب رانی دیکھ رہی تھی کہ ارسلان اس سے بھی دس ہاتھ آگے ہے۔ وہ لڑکا تھا جس نے تمام عمر کبھی سیدھا کام نہیں کیا تھا۔ اسے اس جوڑ میں مسئلے نظر آنے لگے تھے۔ رانی کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ پھر بھی وہ اسے لے کر گاؤں واپس گئی۔ اب وہ بھی بچی نہیں تھی جس کو سنبھالنا پڑے۔ اسے امید تھی گھر والے رکھ لیں گے اور کہیں عزت سے شادی کروا دیں گے۔ مگر شادی کروانا جہیز دینا کون سا آسان تھا۔ باپ تو اس کا لاچار رہتا تھا۔ چچا کو کیا پڑی تھی کہ اب اس بھولی بسری مصیبت کو دوبارہ گلے ڈال لیں۔ رانی مایوس ہو کر واپس آ گئی۔ تمام سفر میں اس کے دل سے اس بچی کے لیے دعائیں نکلتی رہیں۔

"اماں! میں گرم پانی لے آئی ہوں۔ پاؤں ڈبو

لیں۔ آرام ملے گا۔"

وہ خود بھی اتنا ہی سفر کر کے آئی تھی۔ مگر اسے رانی کی فکر تھی۔

"بات سن تجھے ارسلان سے شادی میں کوئی اعتراض تو نہیں؟" اس نے اسے پاس بٹھالیا۔

"نہیں اماں، جو تیرا فیصلہ۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ اب اس کے دل میں ارسلان کے نام سے مستقبل کے خواب نہیں جگمگاتے تھے۔ مگر وہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

"پھر میرا فیصلہ یہ ہے کہ فوراً تم دونوں کا نکاح پڑھادوں۔" رانی کو یقین تھا کہ ارسلان نکاحی بیوی کے ساتھ حد میں رہے گا۔

"فوراً؟" وہ ہڑبڑا گئی۔

"ہاں بلاؤ ارسلان کو۔" رانی اٹھ کر مہم پر لگ گئی۔

ارسلان نے چوں چرا اس کی تو رانی نے صاف کہہ دیا کہ اس کی شادی کہیں اور کردے گی۔ تب ارسلان بھی مان گیا۔ رانی نے صحت کی پروا کیے بغیر کام شروع کردیے۔ بلڈ پریشر تو پہلے ہی تھا۔ گردوں پر اثر ہونے لگا۔ وہ لڑکی والی بھی تھی اور لڑکے والی بھی۔ اس جوش میں اسے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ گردوں میں پانی پڑ گیا۔ وہ ہسپتال داخل ہوگئی۔ دنوں میں اس کا وجود بھی پانی ہوگیا، وہ چلی گئی۔ ارسلان کو اس کا شوہر بنا کر جانا چاہتی تھی۔ مگر ہو نہ سکا۔ اب وہ پوری طرح ارسلان کے چنگل میں آگئی تھی۔

☆☆☆

"میرے ابا بھی بہت جلدی آف ہوگئے تھے۔ میں بھی تم لوگوں کی طرح چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔" بدر بچوں سے بے تکلف ہوگیا تھا۔

"استاد! تم کیا کام کرتے تھے جو اتنے لش کپڑے پہنے ہیں؟" ایک اور بچے نے اس کے کوٹ کو للچائی نگاہ سے دیکھا۔

بدر کھل کر ہنس دیا۔ حماد بھی ان بچوں سے ایسے ہی بے تکلفی سے بات کرتا تھا۔ کھانے کے بعد کسٹرڈ تھا۔ جوڈسپوزیبل کپوں میں موجود تھا۔ عروش ٹرے میں وہ کپ لیے آئی۔ وہ دور سے ہی تہمینہ کو دے کر جانے لگی تھی۔ جب بدر نے اس کی طرف دیکھا۔

"ایکسکیوزمی کیا نام تھا آپ کا؟" اس نے عروش کو دیکھ کر ذہن پر زور دیا۔

عروش نے جواب دینے کے بجائے شعلہ بار نگاہوں سے گھورا۔ وہ تو اس کا شجرہ نسب جانتا تھا اب کیسے بن رہا تھا جیسے نام بھی نہ جانتا ہو۔

"آپ بھی میٹھا لیں۔" اس نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔

"آؤ عروش۔" ہانیہ نے بھی پکارا۔

عروش آ گئی اور اکتائے انداز میں دری کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ بدر اتنی دیر وہاں گزارے گا۔ پھر بدر نے بچوں کو دیکھا۔

"میں تمہیں آج اپنی کہانی سناتا ہوں۔" بدر کے انداز سے لگ رہا تھا وہ وہاں گھنٹہ بھر مزید بیٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"میں نے ایک جیولری کی دکان پر نوکری کرلی تھی۔" بدر بتانے لگا۔

"وہ تو میں بھی سگنل پر جرابیں بیچتا ہوں۔" ایک پندرہ سال کا لڑکا بدر کو جھوٹا ثابت کرنے کی بہت کوشش کررہا تھا۔

"کمائی وہاں خاص نہیں ہوتی تھی۔ میں نے یہ سیکھا کہ نوکری نہیں کرنی۔ کام کرنا ہے تو اپنا کرنا ہے۔ دکان کی کمائی تو مالکوں کو ملتی ہے۔ میں نے آمدن بڑھانے کی غرض سے سائیکل پر زیور بیچنا شروع کردیا۔"

"تو کیا زیور بیچنے سے آدمی امیر ہوجاتا ہے؟" دوسرا بچہ بدر کا ترقی کا فورمولا حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

"آدمی تب امیر ہوتا ہے جب وہ پیسے کی جگہ مقام کی خواہش کرتا ہے۔" بدر نے بے حد دھیمی مسکراہٹ سے کہانی جاری رکھی۔

☆☆☆

پنک فراک پہنے آٹھ سال کی عروش بہت مہارت سے درخت پر چڑھ رہی تھی۔ جب ارحم نے اسے ٹوکا۔

"تم گر جاؤ گی نیچے اترو۔ یہ ہمارے گھر کے درخت نہیں ہیں۔ ان پر نہ جانے کون کون سے جانور ہوں گے۔"

وہ پوری فیملی پکنک منانے ایک پارک میں آئی تھی۔ تاحد نظر پھیلے پارک میں ایک مصنوعی جھیل بھی تھی جس میں بوٹنگ ہوتی تھی۔ ویسے تو پارک ہموار تھا۔ مگر جھیل کے اس کنارے میں بہت سے اونچے لمبے درخت لگے ہوئے تھے۔

"میں اوپر والے پتے دیکھنے جارہی ہوں۔ وہ نیچے والے پتوں سے کچھ نرم لگ رہے ہیں۔" عروش نے معصومیت سے وضاحت کی۔

"خیالات تمہارے سائنسدانوں والے ہیں پر حرکتیں بندریوں والی۔ چچا حیدر نے خاص طور پر مجھے تمہارا خیال رکھنے کو کہا ہے۔ نیچے آؤ۔ میں تمہیں ٹہنی توڑ دیتا ہوں۔" ارحم نے پیشکش کی۔

عروش نے درخت کی اونچائی سے دیکھا۔ رنگوں سے لدی ایک سائیکل دور سے گزر رہی تھی اور سائیکل چلانے والا آوازیں بھی لگا رہا تھا۔ عروش نے درخت کے اوپر سے ہی سائیکل پہ موجود رنگ برنگی چوڑیاں دیکھ لیں۔

"چوڑیوں والے۔" اس نے بے چین ہو کر وہیں سے صدائیں لگانا شروع کر دیں۔

"ارے کیا کر رہی ہو یہاں چوڑیوں والا کہاں سے آ گیا؟" ارحم نے روکا۔

"وہ سامنے چوڑیوں والا ہے۔ مجھے چوڑیاں لے دیں پلیز۔" اس نے جھٹ فرمائش کر ڈالی۔

چوڑیوں والا تو گاہک ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے جب ایک لڑکی کو پکارتے دیکھا تو سائیکل گھاس میں اتار لی اور اسی طرف آنے لگا۔ ان رنگ برنگی چوڑیوں کی خواہش میں عروش بھی احتیاط سے درخت سے نیچے اتر گئی۔ ارحم نے دیکھا کہ سائیکل پر سوار لڑکا اسی کا ہم عمر تھا۔ وہ لڑکا سترہ سال کا بدر تھا۔ وہ ارحم سے بڑا تھا مگر غربت کے باعث عمر سے چھوٹا لگتا تھا۔ بدر نے پنک فراک والی لڑکی کو خوشی سے اچھلتے دیکھا۔ ویسے تو وہ سامان بیچنے کے لیے کئی جملے بولتا تھا۔ مگر اس وقت اس لڑکی کو دیکھ کر وہ اس کی معصومیت میں کھو گیا۔ اچانک سے اس لڑکی اور بدر کے بیچ لڑکی کا کزن آ گیا۔ جیسے اس کو بدر سے بچانا چاہتا ہو۔ ارحم نے عروش کو کہا تھا کہ درخت کے پاس ہی کھڑی رہے۔ وہ اس کے لیے کچھ لے آئے گا۔ اب وہ خود آگے ہو کر سامان دیکھ رہا تھا۔

"کانچ تو نازک ہوتا ہے۔ مجھے کوئی مضبوط چیز دکھاؤ۔" ارحم نے بدر کو نگاہیں پھیرنے پر مجبور کیا۔

"پھر یہ دھاتی کڑے ہیں اور پتھروں سے بنے بریسلٹ۔" بدر نے اپنے بیسٹ سیلنگ آئٹم دکھائے۔

عروش نے جب قسم قسم کی رنگین اور حسین چیزیں دیکھیں تو اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ ایک ایک قدم لیتے ارحم کے قریب پہنچ گئی اور آتے ہی سائیکل سے سلور دھات میں جکڑے سبز پتھروں والا خوب صورت بریسلٹ اٹھا لیا۔

"بندریہ! پیچھے ہو جاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں نا۔" ارحم نے عروش سے کہا۔

"یہ جیڈ پتھر کا بنا بریسلٹ ہے۔ یہ پتھر حادثات سے محفوظ رکھتا ہے۔" بدر نے بتایا۔

عروش نے بریسلٹ چڑھایا تو وہ اس کی ننھی کلائی کو پار کرتا کندھے تک چلا گیا۔ وہ معصوم اس کو لہرا کر ہنسنے لگی۔

"یہ تو میرے گلے کا ہار لگ رہا ہے۔"

"ہنو میں تمہارے لیے کچھ اور دیکھتا ہوں۔" ارحم نے وہ بریسلٹ اس سے لے کر دوبارہ سائیکل کے پھٹے پر رکھا۔

"مجھے ایسا ہی کچھ چاہیے جو مجھے محفوظ رکھے۔ مجھے روز اتنی چوٹیں لگتی ہیں۔ اور آپ سب مجھے

ڈانٹتے ہیں۔"

"یعنی بندریا کو شرارتیں کرنے کے لیے لائسنس چاہیے۔ یہ پتھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ وہ خود پتھر ہیں تمہیں کیا بچائیں گے؟" ارحم نے ہنس کر مذاق اڑایا۔

"نہیں جناب، یہ پتھر تو بہت دانشور ہوتے ہیں۔ یہ صدیوں زمین میں رہ کر ان کے اثرات جذب کر لیتے ہیں۔ اس لیے ان پتھروں میں بڑی خاصیت ہوتی ہے۔" وہ دبلا پتلا لڑکا نہایت ذہین تھا۔ بظاہر نا سمجھ عروش بدر کی ہر بات کو ذہن میں جذب کر رہی تھی۔

"تمہیں بہت معلومات ہیں۔" ارحم نے ایک بار پھر عروش کا بازو پکڑ کر اسے بدر سے دور کیا۔

"بس جی انسان قدرتی کرشموں کو جان کر خود کو سائنسدان کہتا ہے۔ یہ انسان کے اختیار میں ہے، چاہے پتھروں کو قدموں تلے روند دے۔ کسی قابل سمجھے تو تراش کر جوہر بنا دے۔ حقیقت میں یہ قدرت کے تحفے ہیں۔" بدر کی زیادہ تر توجہ اسی بچی پر تھی جو رنگین زیورات میں محو تھی۔ اور اس کا کزن اس کی ڈھال بنا پھر رہا تھا۔

"بہت بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ پڑھے لکھے لگتے ہو۔" ارحم نے انگوٹھیوں کے ڈبے میں سے انگوٹھیاں دیکھنا شروع کر دیں۔

"ایسی باتیں پڑھنے سے نہیں، دھوپ میں سڑکوں پر خاک چھاننے سے آتی ہیں۔" بدر نے ایک موٹی مردانہ انگوٹھی نکالی جس میں جیڈ لگا ہوا تھا۔

"خاک چھاننا جانتے ہو تو پتھر تراش کر زیور کیوں نہیں بنا لیتے؟ اس میں زیادہ منافع ہے۔" ارحم نے مشورہ دیا اور وہ انگوٹھی اپنے ہاتھ میں پہننے لگا۔ لیکن عروش نے انگوٹھی اچک لی۔

"مجھے یہی انگوٹھی چاہیے۔ دیکھیں نا اس میں بھی وہی پتھر ہے۔" عروش نے کہتے ہی انگوٹھی انگلی میں پہن لی۔

"تمہیں تو پوری بھی نہیں آ رہی لاؤ واپس دو۔" ارحم نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لینی چاہی مگر عروش نے اسے دونوں ہتھیلیوں میں زور سے بند کر دیا۔

"مجھے یہی لینی ہے بس۔" اس نے ضد سے منہ پھلایا۔

"دیکھو عروش، ضد نہیں کرتے۔"

ارحم کو اس کا ضد کرنا پسند نہیں تھا۔ اور مزے کی بات تھی بدر کو اس کی ضد ہی سب سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے قناعت کا کڑوا گھونٹ پینے والوں کو ہمیشہ رسوا ہی ہوتے دیکھا تھا۔ خاص طور پر بچوں کو بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہ کمال بچی تھی۔ نہ صرف جانتی تھی کہ اس کو کیا چاہیے۔ بلکہ اپنی پسند کے لیے لڑ رہی تھی۔

"اچھا لے لو۔ کتنے کی ہے۔" ارحم نے ہتھیار ڈالے۔

بدر اتنی دیر میں ایک بچکانہ بریسلیٹ اٹھا چکا تھا۔ اس نے حق سے عروش کے سامنے ہاتھ کیا۔ عروش نے آرام سے اس کو انگوٹھی دے دی۔ بدر نے بریسلیٹ میں وہ انگوٹھی ڈال دی۔

"جب تک ناپ نہیں آتی آپ ایسے پہن سکتی ہیں۔" وہ عروش سے مخاطب ہوا۔ پھر عروش کو دینے کے لیے آگے بڑھا۔

ارحم نے باقاعدہ بدر کے سینے کو دھکا دیا کہ وہ کہیں عروش کے قریب نہ آ جائے۔

"میں خود پہنا دیتا ہوں۔" ارحم نے کہا۔

ارحم نے کہہ کر بریسلیٹ عروش کو پہنا دی۔ مگر بدر بہت بری طرح ہل گیا۔ اب وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی اوچھی حرکت کرے۔ وہ تو بس اس کو بریسلیٹ دینے کے لیے آگے ہوا تھا۔ مگر اس کا کزن ایسے کیوں اسے بچا رہا تھا؟ بدر نے مشکل سے ضبط کیا اور قیمت لے کر جانے لگا۔ وہ اضطراب میں تھا اور جلدی سے وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی پیدل سائیکل لیے تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پیچھے سے چیخ و پکار کی آواز آئی۔

"بچاؤ وہ گر گئی، عروش، پاپا......!" ارحم چلا رہا تھا۔

بدر نے مڑ کر دیکھا۔

"بندریہ۔" بدر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

عروش انگوٹھی لے کر جلدی میں ایک درخت کے اوپر چڑھ گئی تھی۔ اب والا درخت جھیل کے قریب تھا اور نازک تھا۔ چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں پسلا اور وہ پانی میں گر گئی۔ ارحم پیسے دے کر مڑا تو یہ سب ہو گیا۔ اب وہ چلا رہا تھا۔ بدر نے سنا تو دوڑ لگا دی اور پانی میں کود گیا۔ پانی گہرا نہیں تھا مگر عروش کم عمر تھی۔ گرنے کے شاک میں وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار پائی تھی۔ بدر نے اسے پانی میں سے نکالا۔ اس وقت تک اور لوگ بھی آ گئے تھے۔ کسی نے عروش کو اوپر کھینچا۔ کسی دوسرے نے بدر کو سہارا دیا۔ عروش بہت دیر شاک میں رہی۔ سب کو اس کو دیکھتے رہے۔ بدر پھر ایک بدبودار ماضی کی طرح پیچھے رہ گیا۔ سب نے ارحم کی پیٹھ ٹھونکی کہ اس نے بروقت دھیان رکھا۔

حیدر زمان نے اس بوٹنگ والے لڑکے کو ڈھونڈا جس نے عروش کو بچایا تھا۔ مگر وہ بوٹنگ والا لڑکا نہیں تھا ایک چھابڑی فروش تھا جو عروش کے ہوش میں آنے کے بعد چلا گیا تھا۔ اب پاس آنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔ عروش کا دو دن بعد خوف ختم ہوا تو اس نے اپنا سامان چیک کیا۔ اس میں وہی انگوٹھی تھی۔ اس معصوم عمر میں یہ ماننا کہ اس پتھر نے اسے محفوظ رکھا فطری عمل تھا۔ اسے اس دن ہوئی ہر بات یاد رہ گئی۔ مگر بدر بھول گیا۔ اسے یہی لگا وہ سب باتیں ارحم نے کی ہیں۔

اس روز جسم سے چپکے گیلے کپڑے پہنے بدر۔ گھر جاتے ہوئے سڑک کنارے رک گیا۔ ڈھلتے سورج کو دیکھتے ہوئے بدر کے اندر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اس کو اپنا آپ ایک بے زبان پتھر لگ رہا تھا۔ جس کو تراشنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ مہذب تھا۔ مگر جس طرح انگوٹھی خریدنے والا لڑکا اس لڑکی کو بدر سے دور کر رہا تھا۔ اس سے بدر کو اپنا آپ ایک آوارہ شخص سا محسوس ہوا۔ وہ اپنے لیے ایسا مستقبل نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس سے خطرہ محسوس کریں۔ تلخ تھی لیکن حقیقت تھی کہ جسم پر موجود کپڑے ہی آپ کی پہچان ہوتے ہیں۔ اسے ایسا پتھر نہیں بننا تھا جسے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔ بلکہ اس وقت اس نے ایسا ہیرا بن کر دکھانے کا عزم کیا جس کو فخر سے سر پر سجایا جاتا ہے۔ اسے اپنا آپ تراشنا تھا ہر قیمت پر۔ اس روز کے بعد سے وہ سارا دن کمر توڑ کر محنت کرتا تھا اور راتوں کو ننھے بلب میں پڑھائی کیا کرتا۔

☆☆☆

"یعنی؟" ایک لڑکے نے بدر کی کہانی سن کر پوچھا۔

"یعنی میں نے ایک پنک فراک والی لڑکی کو انگوٹھی بیچی، اس کی جان بچائی مگر میں ایک چھابڑی فروش تھا۔ مجھے وہ عزت نہیں ملی جو مجھے چاہیے تھی۔ اس دن سے میں نے پڑھائی دوبارہ شروع کی اور آج اس مقام پر ہوں۔" بدر نے ساری کہانی کا خلاصہ بتایا۔

"مطلب دل لگا کر پڑھنا بہت ضروری ہے۔"

"ہانیہ نے بچوں کو سیکھ دی۔

سرے پرسکون تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ پنک فراک والی وہیں ہے۔ عروش کا رنگ اڑ چکا تھا۔ کسی نے اس کے انگوٹھے میں پہنی اس سبز مردانہ انگوٹھی کو نہیں دیکھا سوائے بدر کے۔ اپنی کانویشن پر عروش بدر سے ٹکرائی تھی۔ بدر نے اس انگوٹھی کو تب ہی پہچان لیا تھا جب عروش اسٹیج پر تھی۔ بدر کا چھوٹا بھائی صمد اعجاز عروش کا کلاس فیلو تھا۔ یک دم بدر کو اپنی اجاڑ زندگی میں خوشی کے پھول کھلتے محسوس ہوئے۔ عروش نے اسٹیج پر اس کی کہی بات دہرائی تھی۔ لیکن ساتھ ہی عروش نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ نصیحت اس کے کزن نے دی تھی۔ تب بدر سلگ اٹھا۔ اسے لگا کہ وہ اب بھی معاشرے کا ایک بے کار پرزہ ہے، لوگ جس کے آر پار دیکھ جاتے ہیں۔ لیکن اب وہ پرانا بدر

نہیں رہا تھا۔ اب اسے یہ بات ہرگز قبول نہیں تھی۔ اس نے اس روز عروش کی گاڑی کا پیچھا کیا۔ مگر ریسٹورنٹ میں آنے سے پہلے تک وہ نہیں جانتا تھا کہ عروش، حیدر زمان کی بیٹی ہے۔

"بھلا دیا جانا کسی کو اچھا نہیں لگتا، ہے نا؟" بدر نے عروش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کو یہی سبق دینے کے لیے نظر انداز کر رہا تھا۔ عروش تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا اسے بہت بھاری پڑا تھا۔

☆☆☆

فائزہ کو ساتواں مہینہ لگا تو پاؤں سوجھنے لگ گئے تھے۔ دہری مصیبت یہ کہ کام والی چلی گئی۔ انہیں کام سکھاؤ تو یہ قریب کے کسی ملازم سے تعلقات بنا لیتی ہیں۔ یا ان کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ عام حالات میں فائزہ کے لیے کوئی بڑی مشکل نہیں تھی۔ دونوں بچے اسکول جاتے تھے۔ باقی کام وہ خود کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بستر پر تھی۔ وہ لاؤنج میں آ کر صوفے پر لیٹ جاتی۔ اسے چلنا پھرنا منع تھا۔

"یہ اتنی کم عمر لڑکی کیوں لے آئی ہو۔ مجھے تم جیسی بڑی عمر کی عورت چاہیے جو ذمہ داری سے کام کرے۔" فائزہ پھل کھاتے ہوئے بولی۔

"بڑی عمر والی کا ہزار ملنا ملانا ہوتا ہے۔ وہ یوں دن رات نہیں رہے گی۔ یہ سونی تو ادھر ہی کہیں کونے میں بستر ڈال کر پڑی رہے گی۔ صبح پھر کام پر لگ جائے گی۔" لڑکی کو لگانے والی نے منت سے کہا۔

"اس کا نام سونی ہے؟" فائزہ نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔

پتلی دبلی تھی پر کوئی خاص سونی نہیں تھی۔ چہرے پر دھبے تھے۔ رنگ مات تھا۔

"چلو میں ایک دو دن کام کروا کر دیکھتی ہوں۔" فائزہ کی مجبوری ہی ایسی تھی۔

اس نے سونی کو موقع دے دیا اور سونی خاموشی اور سلیقے سے سارے کام کرنے لگی۔ دو دن پھر دو ہفتے گزر گئے۔ فائزہ تو بھول بیٹھی تھی کہ سونی سے پہلے اس کا گزارا کیسے ہوتا تھا۔

"تم نے پیچھے بات کرنی ہے فون ملا دوں؟" فائزہ نے ایک دن سونی کی خدمت سے سرشار ہو کر کہا۔

"امی ابا تو ہیں نہیں۔ چچا ہیں۔ چاچی بہت مارتی تھیں۔ چچا سے کہوں کسی دن آ کر مل لیں۔" سونی نے خوش ہو کر کہا۔ وہ فائزہ کے پیروں کا مساج کر رہی تھی۔

"اور تمہارے باقی بہن بھائی؟" فائزہ غور کر رہی تھی۔ یہاں آ کر سونی کی رنگت بہتر ہو گئی تھی۔

"دو بھائی ہیں۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ ایک روز میں نے بھابھی کی نیل پالش لگا لی۔ انہوں نے مجھے چمٹے سے مارا۔ اس کے بعد تو نہ میں نے نیل پالش لگائی نہ کبھی ناخن بڑھائے۔"

سونی اسی کے بنے سنورے پیروں کا مساج کرتے کہہ رہی تھی۔ نرم دل فائزہ فالتو میں شرمندہ ہو گئی۔ اس روز فائزہ نے اپنی دو نیل پالش نکال کر سونی کو دیں۔

رات کو جب ناصر دیر تک بیٹھا لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا تو سونی کافی لے کر ان کے پاس گئی۔ ناصر کام میں مگن تھا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ جھکے سر کے ساتھ اس نے دیکھا۔ کافی لانے والی کے پیر بہت نازک اور خوش رنگ تھے۔ ساتھ اس نے گلابی نیل پالش لگا رکھی تھی۔ ناصر نے چونک کر نظر اٹھائی۔ ملازمہ تو وہی تھی جو کافی دنوں سے آئی ہوئی تھی، مگر آج اس کا روپ ہی نکھرا ہوا تھا۔

"کچھ اور چاہیے؟" اس نے ادب سے پوچھا۔

"نہیں تم جاؤ۔" ناصر نے کچھ وقت لے کر کہا۔

سونی الٹے ہاتھ کی انگلی سے بالوں کی لٹ کو گھماتے چلی گئی۔

☆☆☆

ایک طویل ہاتھ لینے کے بعد عروش کے سر میں

ہونے والا شور، پرسکون ہوا تھا۔ اور کچھ سمجھ میں آئے نہ آئے وہ یہ جان گئی تھی کہ بدر اعجاز اتنے کم وقت میں اتنا کامیاب کیسے ہوا تھا۔ اس کی یادداشت فولادی تھی۔ وہ سامنے والے کو چاروں طرف سے گھیرنے کا ہنر جانتا تھا۔ جیسے اس نے آج عروش کو چت کر دیا تھا۔ آج اس نے بدر کا جو روپ دیکھا تھا۔ اس سے اس کی سوچ مفلوج ہو رہی تھی۔ اس نے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے تائی امی کے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں سومارہ کی شادی کی تیاریوں کی ابتدا ٹرنک کھلنے سے ہوئی تھی۔ سالوں سے جمع کیے کپڑے نکل آئے تھے۔ سب مجمع لگا کر مشورہ کر رہے تھے۔ عروش کو ان زرق برق کپڑوں میں گھر کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا سب سے قیمتی اثاثہ اس کے یہی رشتے تھے۔ سومارہ نے ایک سیاہ بنارسی سوٹ اٹھا کر سینے سے لگالیا۔

"یہ تو مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ یہ تو فائنل کریں۔" سومارہ ذرا بھی توجہ دیتی تو عروش کی حالت پڑھ لیتی۔ مگر اس کا دل آج کل اپنے کاموں میں مگن تھا۔

"کالا جوڑا بھی کوئی جہیز میں رکھتا ہے۔ نحوست کو دعوت دینے کی کیا ضرورت ہے؟" تائی امی بگڑ رہی تھیں۔

"جہیز میں کیا اب تو لوگ ویسے پر پہنتے ہیں۔ آپ کی پسندیدہ اداکارہ نے پہنا تھا۔" ارم نے یاد کروایا۔

"ان سے موازنہ نہ کرو مشکل سے آدھا درجن سال ان کی شادیاں چلتی ہیں۔" آمنہ ایک کپڑا کھول کر لمبائی ناپ رہی تھی۔

"کالے جوڑے کی نہ ہمارے بزرگوں نے اجازت دی۔ نہ ہی میں اجازت دوں گی۔ اب بس لپیٹو اس بحث کو۔" تائی امی نے دوٹوک کہا۔

"اب اگر رنگوں سے بھی ڈر کر جینا ہے تو سورج ڈھلنے کے بعد سانس روک کر بیٹھنا چاہیے۔ کہیں اندھیرے میں سانس لینے سے نحوست نہ پھیلے۔ غلاف کعبہ کالا ہوتا ہے مگر کفن ہر کسی کو اجلا سفید ہی نصیب ہوتا ہے۔ جس چیز سے جو خیال منسوب کر لیں پھر وہ ہو کر ہی رہتی ہے۔" سومارہ منہ پھلائے بے سود دلائل دے رہی تھی۔

"دیکھو آمنہ، اس کی زبان۔ میں اس کو کیا سمجھاؤں۔" تائی امی نے نہیں ماننا تھا نہیں مانیں۔

"ٹھیک ہے پھر میں سرفراز کو فون کر کے کہتی ہوں بری میں کالا جوڑا بھی بنائے، سفید بھی اور نیلا بھی۔" سرفراز تو اس کی ہر بات ماننے کو تیار تھا۔

"اف تائی امی اس ٹرنک میں اتنا سامان ہے سمجھ میں نہیں آرہا کہاں سے شروع کروں۔" ارم جتنے کپڑے دیکھ رہی تھی اتنا کنفیوز ہو رہی تھی۔

"پہلے ایک نکالو اس کا فیصلہ کرو اس کو سائیڈ پر رکھو پھر اگلا۔" آمنہ نے سمجھایا۔

عروش کو بھی یہی کرنا تھا۔ اس کا دماغ کسی ٹرنک سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

"ارحم! آپ کا بدر اعجاز کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اگلے روز ارحم اسے دفتر چھوڑنے جا رہا تھا۔ ارحم نے اسے سختی سے بھائی کہنے سے منع کر دیا تھا۔

"ہم سب کا خیال اس کے بارے میں یکساں ہی ہے۔" ارحم بھی عداوت رکھتا تھا۔

"لیکن وہ کافی کامیاب ہو گیا ہے۔ بزنس میگزین میں بھی اس کا انٹرویو آیا ہے۔" عروش کا نظریہ جڑ سے ہل چکا تھا۔

"اس لیے کیونکہ جو چال بازیاں اور پینترے اس کے ذہن میں آسکتے ہیں کم ہی لوگ اس تک پہنچے ہیں۔" ارحم بولا۔

"تعبیر" میں جو معصوم بچے آتے ہیں وہ ابھی معصوم ہیں۔ یہی بچے بڑے ہو کر غلط کاموں میں پڑ جاتے ہیں۔ بدر اعجاز بھی ایسا ہی ہے۔ بچپن میں معصوم تھا۔ بڑا ہو کر شاطر ہو گیا۔"

"جس لمحے ہم اپنے فیصلے کرنے لگتے ہیں ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ وہ پہلے بھی

شاطر تھا اور اب مہا شاطر ہے۔ اس کو دیکھو تو ہر لمحے یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کا ستایا ہوا شخص ہے۔ جو وقتاً فوقتاً صحیح راہ سے بھٹک جاتا ہے اور کسی بھی لمحے پٹڑی پر واپس آ جائے گا۔ مگر وہ درحقیقت وہ مکڑی ہے جو خاموشی سے شکار کے گرد جالہ بن دیتا ہے۔ دوسرے کو پھانس کر خود چلتا بنتا ہے۔ ایسے شخص سے دور رہنا چاہیے۔" ارحم نے اپنے باپ اور تایا کی غلطی یاد کی۔

"آپ کو یاد ہے یہ انگوٹھی۔" عروش نے اپنا ہاتھ آگے کر کے ارحم کو دکھایا۔

"بالکل یاد ہے ہمیشہ تو پہنتی ہو۔" ارحم مسکرایا۔

"یہ یاد ہے کس سے لی تھی؟" عروش کو امید تھی ارحم کو تو یاد ہوگا۔

"تم نے ہی لے کر دی تھی۔ اس دن تم درخت سے گری تھیں اور ڈوبتے ہوئے بچی تھیں۔" ارحم کو بھی باقی سب یاد تھا بدر کے علاوہ۔

"وہ سائیکل پر زیور بیچنے والا لڑکا یاد ہے؟" وہ کسی سے ہمراز بنانے کے لیے مچل رہی تھی۔

"لڑکا تھا؟ مجھے لگا کوئی آدمی تھا۔" ارحم نے بے خیالی میں کہا۔

عروش خاموش ہوگئی۔ جب تک وہ خود فیصلہ نہیں کر لیتی کہ وہ اس سب کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہے۔ وہ کسی اور کو نہیں بتائے گی۔

☆☆☆

"یہ دیکھو بدر اعجاز نے کل چیک دیا تھا۔" ہانیہ نے چیک حماد کو دیا۔

ہمیں چند کمرے چاہییں تا کہ بچوں کو ٹھکانا ملے۔" حماد نے اگلے گول کی نشان دہی کی۔

"میرے لیے ممکن ہوتا تو اپنے گھر کو وقف کر دیتی۔" ہانیہ کا اصل چیلنج یہی تھا کہ وہ حماد کے علاوہ کسی اور میں وہ جذبہ نہیں دیکھتی تھی جو وہ خود محسوس کرتی تھی۔

"جانتا ہوں میں بھی۔" حماد نے غیر سنجیدہ انداز میں کام کرتے ہوئے کہا۔

ہانیہ نے اس بار سر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ پتلا دبلا انسان تھا۔ خوش رنگ۔ بال گردن تک آتے تھے۔ وہ جینز پر کالر والی شرٹ پہنتا تھا۔ جو حالات اس نے دیکھے تھے اس کے باوجود وہ ہمیشہ پرامید رہتا تھا۔ حماد نے گردن موڑی تو ہانیہ کو خود کو دیکھتا پایا۔

"اس ہی لیے تو شادی نہیں کرتا۔ تا کہ یہ وقت کسی اور کو نہ دینا پڑے۔" حماد کو لگا وہ اس کی بات پر غور کر رہی ہے اس لیے وضاحت دی۔

"اس سے شادی کرو جو تمہارے کاز میں شریک ہو۔" ہانیہ نے کہا۔ اس سے پہلے وہ سمجھتا عروش آ گئی۔

"آپ دونوں مجھ سے ناراض مت ہوں۔ میں خود ہی معافی مانگتی ہوں۔ اب میں سوچ سمجھ کر بولوں گی۔ آپ لوگ جو ہدایت دیں گے وہی کروں گی، پکا۔ مجھے "تعبیر" کا حصہ رہنے دیں۔" اس نے معصومیت سے کان پکڑے۔

"آف کورس، تمہیں "تعبیر" سے کوئی الگ نہیں کر رہا۔" ہانیہ نے مسکرا کر عروش کے لیے بانہیں پھیلا دیں۔

عروش بھی گلے لگ گئی یہ جانے بغیر کہ اگلی بار وہ اس سے بھی بڑی حماقت کرے گی۔

☆☆☆

آج اس نے دماغ چلائے بنا صرف کام کیا تھا۔ فارغ ہو کر وہ گھر کے لیے نکلی تو دیکھا۔ باہر سڑک پر بدر اعجاز اپنی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ عروش نے خاموشی سے الٹے قدم لیے اور اندر جانے لگی۔

"میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ یہیں ختم کر دیں۔" بدر نے پہلے ہی اسے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا۔ اب سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں بھی جانتا ہوں آپ کون ہیں اور آپ بھی مجھے اچھے سے جانتی ہیں۔" بدر آدھے ہونٹ کی

ٹیڑھی مسکراہٹ سے ہنسا۔ اس کے منظر میں آتے ہی سب جیسے ایک شطرنج کی بساط میں بدل جاتا تھا۔

"کس سے ملوں؟ اس بدر اعجاز سے جو میرے خاندان کی تباہی کا باعث ہے یا اس سے جس نے میری جان بچائی تھی۔ آپ دو مخالف سمتوں پر کھڑے ہیں۔"

"تم نے اپنی کانووکیشن پر جس نصیحت کو اپنی زندگی کی سب سے اہم نصیحت کہا تھا وہ میرے لفظ تھے۔" بدر سیدھا بات پر آیا۔

"آپ میری کانووکیشن پر بھی تھے؟" عروش کو اپنے اردگرد مکڑی کا جالا محسوس ہونے لگا جس کا ذکر ارحم نے کیا تھا۔

"صہیب میرا بھائی ہے۔ جس دن میں نے تمہیں انگوٹھی بیچی تھی اس دن میں نے اپنا آپ بدلنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ میں نے پڑھائی شروع کی کامیاب ہوا۔ مجھے لگا میں اپنا بدبودار ماضی پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ مگر تم نے مجھے پھر وہیں لا کھڑا کیا۔ تمہیں میری باتیں حرف با حرف یاد تھیں۔ یاد نہیں تھا تو میں۔" بدر ایسے کہہ رہا تھا جیسے بدلہ لینے والا ہو۔

"میں بہت چھوٹی تھی۔" اب تک اس کا دماغ چل رہا تھا۔

"کانووکیشن سے نکل کر میں نے تمہاری گاڑی کا پیچھا کیا تھا۔" بدر نے اعتراف کیا۔

"لیکن کیوں؟" عروش کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"تاکہ تمہیں بتا سکوں کہ میں کون ہوں۔ اور اس بار تم چاہ کر بھی مجھے بھلا نہیں پاؤ گی۔" بدر کے چہرے پر شیطانی تبسم ابھرا۔ عروش کو ویسے ہی حیرت میں چھوڑ کر وہ پلٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

بڑے سے گھر میں تنہا رہنے کا ایک فائدہ تھا کہ گاڑی کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی تمام نوکروں کو مالک کی آمد کی اطلاع ہو جاتی اور وہ ہاتھ باندھے اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ بدر کو بے شمار برقی روشنیوں سے جگمگاتے مکان میں داخل ہو کر بھی تنہائی کی تاریکی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی ماں چند سال ہوئے فوت ہو چکی تھیں۔ بہنیں اپنے گھروں میں سے کبھی چکر لگا لیتی تھیں۔ بھائی اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ لیپ ٹاپ بیگ نوکر کو تھما کر وہ فریش ہوا پھر ڈائننگ روم میں پہنچا۔ پرتکلف کھانے کو دیکھ کر کوفت کی ایک اور لہر اس کے دل میں اترنے لگی۔ جب سے مکھن پنیر اور خشک میوے اس کے لیے عیاشی سے بدل کر معمول ہوئے تھے۔ ان چیزوں نے اپنی لذت کھونا شروع کر دی تھی۔ اب وہ کھانا پیٹ بھرنے کے علاوہ اسے کوئی خوشی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آستین کہنیوں تک چڑھا کر خود کچن میں گھس گیا۔ جب بھی اسے موقع ملتا تھا وہ اپنا کھانا خود ہی تیار کرتا تھا۔ یہ جیسے اس کی مشینی زندگی میں رہ جانے والی واحد تفریح تھی۔

جب اس نے پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کی ٹھانی تب مالی حالات خستہ ہونے کے باعث پرائیویٹ میٹرک کیا تھا۔ اپنے سادہ سے نمبرز کو دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ باقاعدہ کلاسیں لیے بغیر آگے اس کے لیے ترقی کی راہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے وہ دن کو کالج جاتا اور رات کو ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں میں کام کرتا۔ تب سے ذائقوں اور مسالوں نے اس کی زندگی میں گھر بنا لیا تھا۔ اب تو ملازموں کو بھی عادت ہو گئی تھی کہ صاحب اپنے لیے خود ہی کھانا بنا لیں گے اور دوسرا کھانا ملازموں کے حصے آجائے گا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی گونج لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگی۔ وہ یہی تو چاہتا تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ اسی طرح گونج کر اپنی کامیابی کی داستان سنائے۔

گریجویشن کے بعد اسے یہی لگا تھا کہ اچھی سی نوکری کر کے خوب محنت سے ترقی پائے گا۔ مگر اس کا ثانوی سا بیک گراؤنڈ اور سادہ سا انداز اس کے

راستے میں یوں حائل ہوئے کہ جوتیاں چٹخانے اور خاک چھاننے کا مطلب واضح کر گئے۔ اچھے ہوٹل میں سوٹڈ بوٹڈ گاہکوں کے آرڈر لیتے ہوئے اس نے بھی مناسب سمجھا کہ عزت سے یہی کام کرتا رہے۔ مگر چاکری کی یہ دنیا اسے قبول نہ ہوئی۔

اسے پہلی اچھی نوکری بہت دیر سے ملی۔ مگر خوب ملی جہاں اس کو اپنے تیز دماغ چلانے کے بہت مواقع ملے۔ کام میں قدم جمانے اور باس کا اعتبار حاصل کرنے کے کچھ ہی روز بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ کمپنی کو ایک بلی کا بکرا چاہیے تھا۔ جو تمام غیر قانونی کاموں پر اپنے دستخط کر کے ان کا ذمہ دار بن جائے۔ مالکوں کی مہربانی اس لیے تھی کہ اگر پکڑ ہو تو بدر کی ہو، وہ بچ جائیں۔ معاشرہ بھی آرام سے قبول کر لیتا کہ ایک رشوت خور پولیس افسر کے بیٹے نے یہ سب کیا ہی ہوگا۔ عقل کو تو یہی گوارا تھا کہ بدر فوراً ایسی نوکری چھوڑ دے۔ مگر وہ آنکھ منہ کان لپیٹے سال بھر نہ صرف مالکوں کی فرماں برداری کرتا رہا بلکہ ان کو نئے حربے بھی تجویز کرتا رہا۔ کمپنی کو تعلقات کی بنا پر سرکاری ہسپتال میں اے۔سی لگانے کا کانٹریکٹ ملا۔ اس جیسی چھوٹی کمپنی کے لیے یہ نہایت غیر معمولی بات تھی۔ سرکاری کام تو لیے ہی اس لیے جاتے تھے کہ ان میں پیسا بنایا جائے۔ مالک نے دو نمبری دکھائی اور کئی غیر معیاری سستے اے۔سی خرید کر مہنگے داموں حکومت کو بیچے۔ بدر نے اس اے۔سی والے معاملے سے کوئی پیسے حاصل نہیں کیے۔ جب دو سال بعد بدر نوکری چھوڑ کر گیا۔ تو کمپنی میں کبھی کوئی مسئلہ ہوتا کبھی کوئی اور۔ جس طرح کمپنی مالک دوسروں کو چونا لگا رہے تھے۔ بدر نے کمپنی کو ویسا ہی چونا لگا دیا تھا۔ اس کا ماننا تھا جھوٹے سے جھوٹ بولنے میں کوئی عار نہیں اور دھوکے باز دھوکا ہی ڈیزرو کرتا ہے۔ زیادہ تر معاملوں میں اس کا سیدھا پینترا چل جاتا تھا جہاں نہیں چلتا تھا وہ انگلی ٹیڑھی کر لیتا۔

جب حیدر زمان سے پارٹنرشپ ہوئی تھی تو اس وقت بھی وہ چھوٹے درجے کا بزنس مین تھا جو اپنے ملک سے محبت کرتا تھا کیونکہ وہ جیسا غریب وجود تھا۔ جس کو سب اپنے مطلب کے لیے لوٹتے تھے اور حکمرانوں سے نفرت کرتا تھا جو ملک و قوم کو لوٹنے کے نت نئے طریقوں کے موجد تھے۔

آج وہ جیسے چوٹی پر کھڑا تھا۔ اب زندگی بہت عرصے سے سپاٹ تھی۔ اسے ایک نیا چیلنج چاہیے تھا۔ اب بزنس کا پھیلاؤ اور پیسے کی آمد اس کو سکون نہیں دیتے تھے۔ اسے جیتا جاگتا شکار چاہیے تھا۔ جو اپنے تمام دفاع کے باوجود پھندے کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ شکاری اس کی بے بس آنکھوں میں اپنی جیت پڑھ سکتا ہے۔ ایسا شکار۔ بدر نے ٹھوکر مار کر میز سے گلدان گرایا اور پاؤں پھیلا کر سگریٹ سلگا لیا۔

☆☆☆

انہوں نے پہلے کبھی چوبیس گھنٹے کی ملازمہ نہیں رکھی تھی۔ اب رکھی تھی تو چھوٹی عمر کی لڑکی رکھ لی۔ سونی دو دن بمشکل سرونٹ روم میں سوئی تھی۔ پھر اس نے منت کی کہ وہاں ڈر لگتا ہے تو فائزہ نے اسے لاؤنج میں سونے کی اجازت دے دی۔ اب تھوڑا ہی وقت رہتا تھا۔ فائزہ تو بستر اور کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ آدھی رات کو فائزہ کا رول کھانے کا دل کیا۔ سب سو چکے تھے۔ ناصر کو ہی بیگم کی فرمائش پورا کرنے کے لیے اٹھنا پڑا۔ وہ باہر آیا تو دیکھا سونی اپنے بستر پر بیٹھی اپنے بال بنا رہی تھی۔ دوپٹا کہیں دور پڑا تھا۔ ناصر کو روایتی لمبے بال بہت پسند تھے۔ اسے لگتا تھا یہی عورت کا حسن ہے۔ مگر فائزہ کندھے تک چھوٹے بال رکھتی تھی۔ نیم تاریکی میں اس کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے سارے بال سمیٹ کر کندھے پر ڈال لیے اور گردن موڑ کر پیچھے کھڑے ناصر کو دیکھا۔

"صاحب کچھ چاہیے؟" اس نے بہت سکون سے پوچھا۔ یعنی وہ جانتی تھی کہ ناصر پیچھے کھڑا ہے۔ نہ اس نے دوپٹا ڈھونڈا۔ نہ ہی بال بناتے ہوئے ادائیں دکھانے میں کوئی کمی کی۔

ناصر تو ہکا بکا رہ گیا۔ مرد تھا اور بیوی کتنے مہینے سے بستر پر تھی۔

"نہیں میں کر لوں گا۔" اس نے خود کو سمیٹ کر کہا اور کچن میں چلا گیا۔ جب پیچھے سے سوہنی آ گئی۔

"صاحب میں کر دیتی ہوں۔" اس نے ناصر کے ہاتھ سے چمٹا لینے کی کوشش کی تو ان کی انگلیاں مس ہوئیں۔ ناصر نے چمٹا چھوڑ دیا اور وہ فرش پر جا گرا۔

"آپ کی بیوی بہت خوش قسمت ہیں جو آپ جیسا شوہر ملا۔" سوہنی نے بائیں ہاتھ کی انگلی سے بالوں کی لٹ مروڑ ہوئے کہا۔ اس کی بات سادہ تھی۔ شوہر بیوی کی خدمت کر رہا تھا۔ مگر سوہنی نے جیسے کہی تھی وہ سادہ انداز نہیں تھا۔ ناصر بچتا بچاتا کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن سوہنی کے انداز دیکھ کر ناصر نے فائزہ کی اماں کو بلالیا۔ سوہنی نے شبیر کے ذریعے جسے ناصر نے اسی گھر میں مالی لگوادیا تھا۔ ارسلان کو کہلوایا کہ اسے ضروری بات کرنی ہے۔

☆☆☆

عروش فارغ وقت میں بچوں کی آرٹ کلاس لیتی تھی۔

"شبیر دو ہفتوں سے "تعبیر" نہیں آیا ہے۔ دوسروں سے پوچھ رہی ہوں کہہ رہے ہیں کہیں چلا گیا ہے۔" عروش نے اس دن کلاس کے بعد فکر مندی سے کہا۔

شبیر ہنر مند بچا تھا۔ لیکن عمر میں بڑا ہو چکا تھا۔ ایسے بچے سب کچھ فائدے نقصان میں تولنے لگتے ہیں۔

"میں اسے ڈھونڈنے گیا تھا۔ مدینہ ہوٹل کا جو یاسر ہے۔ اس کے ہاتھ چڑھ گیا ہے۔ وہ پہلے بھی کچھ لڑکوں کو ورغلا کر الٹے کاموں پر لگوا چکا ہے۔" حماد نے بتایا۔

"تو کیا اب شبیر کبھی نہیں آئے گا۔" عروش کو ابھی ناکامی کی عادت نہیں تھی۔ اس نے آسان راستے دیکھے تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ کوئی کیوں مشکلوں کا انتخاب کرے گا۔

"مجھے نہیں لگتا وہ اب آئے گا۔ اب ہمیں شبیر کے حصے کی توجہ بھی ان کو دینی چاہیے جو "تعبیر" آرہے ہیں۔" حماد نے اسے سمجھایا۔

لیکن جو سمجھ جائے وہ عروش کیسی۔

☆☆☆

وہ کتابوں پر یقین رکھتی تھی۔ اسے ابھی اصلی زندگی کا تماچا نہیں پڑا تھا۔ اسے لگا تھا وہ تھوڑی اور محنت کرے گی شبیر کو سنائے گی تو وہ غلط راستے سے پلٹ آئے گا۔ ہانیہ اور حماد بڑا مقصد لے کر چلنے والوں میں سے تھے۔ عروش اگر شبیر جیسے ایک شخص کی زندگی بھی سنوار دیتی تو اس کے لیے یہی بہت تھا۔ حماد اور ہانیہ نے اسے فیلڈ میں نہیں بھیجا تھا۔ تپتی دھوپ، ناہموار سڑک، اور تنگ گلیاں اس کی زندگی کا حصہ کبھی بھی نہیں رہی تھیں۔ مگر ان کی خاک چھاننا اس نے بخوشی قبول کیا تھا۔ دوسرے دن وہ گھر سے گاڑی لے کر نکلی تھی۔ آفس جانے کے بجائے وہ ٹرک اڈے کے پاس بنے بارونق مدینہ ہوٹل آ گئی تھی۔ اس نے دوپٹا کھول کر سر پر لے لیا۔ سب نے اسے باجماعت حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ ایک لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گئی اور چائے آرڈر کی۔

"سنو لڑکے ہم شبیر کو جانتے ہو! وہ میرے اسکول آتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے غائب ہے۔" ایک تیرہ سال کا لڑکا اس کی ٹیبل پر چائے رکھنے آیا تھا۔ عروش نے اس سے پوچھا۔

"اے بی بی غائب نہیں ہوا۔ اس نے تم لوگوں کا پالتو بننے کے بجائے اپنی مرضی سے راستہ بدلہ ہے۔ تمہیں بھی اپنی جان پیاری ہے تو اور دوبارہ یہاں مت آنا۔"

عروش اس چھوٹے وجود سے اتنی بڑی بات سن کر حیران رہ گئی۔

"تم یاسر ہو؟" اس نے ہوا میں تیر چلایا۔ تیر

نشانے پر لگا۔

لڑکا اس پر ہنستے ہوئے چلا گیا۔ یا اللہ یہ کیا دنیا تھی جہاں بچوں سے معصومیت چھین لی گئی تھی۔ یاسر کی تیرہ سالہ شکل پر چالیس سال کا بھیانک تجربہ تھا۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ ان بچوں کو اب رونا بھی نہیں آتا۔ ان کو کبھی کوئی ہاتھ نہیں ملا جو انگلی پکڑ کر راستہ دکھاتا انہوں نے زندگی کو ہمیشہ خود جیا اور مشکل جیا۔ اس دن تو عروش شاک کے عالم میں چلی گئی۔ لیکن اگلے دن پھر آ گئی تھی۔ اسے اب شبیر کے ساتھ یاسر کو بھی بچانا تھا۔

☆☆☆

اس بار عروش پلاننگ سے آئی تھی۔ اس نے نیبل پر کینوس نکالا اور پینٹ کرنے لگی۔ حروف سب کو مشکل لگتے ہیں۔ اور آرٹ سب کو اپنی طرف پکارتی ہے۔ یاسر بھی آج اس کی نیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے بار بار اس کی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔

"تم رنگ بھرو گے؟" عروش نے یاسر کو پکار کر اپنا برش اس کی سمت بڑھایا۔

یاسر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا رویہ نرم پڑ گیا تھا۔

"ہاں دکھاتا۔" اس نے آگے ہو کر برش پکڑا عروش خوش ہو گئی۔ آخر اس نے یاسر جیسے پتھر کو موم کر ہی لیا۔

"مجھے وہ سبز رنگ چاہیے۔" یاسر کہتے ہوئے آگے ہوا۔ اور ہاتھ میں موجود شوربے کی ساری پلیٹ کینوس پر الٹا دی۔

"واٹ نان سینس۔" عروش اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی بینچ سے اٹھی۔

"میں کیا پسند آ گیا ہوں جو روز آ جاتی ہو۔" یاسر نے ظالمانہ قہقہہ لگایا۔ عروش کو اس کی آنکھوں میں دنیا کے لیے وہی حقارت نظر آئی تھی جو بدر اعجاز کی آنکھوں میں تھی۔

"بچے ہو بچے ہی رہو۔" عروش نے غصہ کیا۔

"آخری بار سمجھا رہا ہوں میرے علاقے سے نکل جاؤ۔ دوبارہ نہیں سمجھاؤں گا۔" یاسر نے ہاتھ میں پکڑے برش کو دو ٹکڑے کیا۔

اب تو یاسر عروش کے لیے ضد بن گیا تھا۔

☆☆☆

"میں آج یاسر سے ملنے گئی تھی۔" عروش نے دفتر میں بتایا۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا وہ خطرناک ہیں۔" حماد نے سمجھایا۔

"وہ ایک بچہ ہے۔" عروش کو سب کے رویے پر حیرت تھی۔

"سڑک پر گزارا ایک سال گھر میں رہنے کے دس سال جتنا ہوتا ہے، وہ بچہ نہیں رہا۔" حماد اب بھی اپنی بات پر قائم تھا۔

"ایسے لوگوں کو تو توجہ کی اور زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

دوسروں نے ایک واضح لکیر کھینچ لی تھی کہ ان کی پہنچ کہاں تک ہے۔ عروش ابھی یہ سب نہیں کر سکی تھی۔ وہ دل لگانے والوں میں سے تھی اور اب اس کا دل یاسر سے لگ گیا تھا۔

"وہ آٹھ سال کی عمر میں جنسی تشدد کا شکار ہو کر گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ پھر جن لوگوں کے ہاتھ لگا انہوں نے اس کی ہیرا پھیری میں ایسی تربیت کی ہے کہ ہم اس کی عقل کو نہیں پہنچ سکتے۔ بظاہر وہ ہوٹل پر کام کرتا ہے۔ اصل میں وہ ایک مخبر ہے۔ بس اڈے پر رہ کر وہ اپنے گینگ کے لیے بزنس اور معلومات دونوں حاصل کرتا ہے۔" ہانیہ نے بھی تفصیل بتائی۔

"کبھی کسی نے اس کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" عروش دکھی ہوئی۔

"کی تھی کئی بار کی تھی۔ مگر فائدہ نہیں ہوا۔ اس کو پولیس سدھار سکتی ہے۔ لیکن کم عمری کے باعث وہ ان کے ہتھے نہیں چڑھتا۔ آخری بار ایمبولینس میں اسلحہ سمگل کرتے ہوئے اس کا نام آیا تھا۔ چند دن پولیس کی خاطر تواضع کے بعد پھر سے اپنے کام لگ گیا۔ میں تمہیں بددل نہیں کر رہا مگر میں نہیں چاہتا تم میری طرح اپنا وقت ضائع کرو۔" حماد بھی پہلے

عروش کی طرح سوچتا تھا کہ وہ اس کو سدھار لے گا۔

"ہمارا ادارہ ان کے لیے ہے جو ٹھیک ہونا چاہتے ہیں۔ یاسر ایسا نہیں ہے، وہ الٹا ہمارے سسٹم کو خراب کردے گا۔ میں تمھیں سختی سے منع کررہا ہوں اس کے چکر میں مت آؤ۔" حماد نے عروش کو ہر طرح سے سمجھایا۔ وہ یاسر کے رویے کو دیکھ کر پہلے ہی دکھی تھی۔ اب تو وہ ہار ماننے کے قریب ہوگئی۔

☆☆☆

"جج صاحب! کتنی زیادتی ہے کہ دلہن اکیلی ہی شادی کی تیاری میں لگی ہے۔ دلہن کی کزن کو اتنا ہوش نہیں کہ کوئی تھیم ڈیسائیڈ کرے...... کوئی ڈھولکی رکھے...... کوئی ڈانس پریکٹس!"

سومارہ ٹی-وی پر نیا فلمی گانا لگا کر بیٹھی تھی۔ جب عروش گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے جان کر عروش کو اونچی آواز میں سنایا۔

"دلہن کے پاس جب اس کا بنٹی ہے تو اسے کسی اور کی ضرورت ہی کیوں ہے۔" وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"سرفراز نام ہے اس کا۔" سومارہ نے پھر آستین چڑھا لیے۔

"خدا تمہیں اور اس کے رشتے کو سرفراز کرے۔" عروش نے لاڈ سے کہا۔

"میں نے اور سرفراز نے ایک بہت اچھا ڈانس تیار کیا ہے۔ تم بھی ڈانس تیار کرو۔ مجھے کرن جوہر اسٹائل کی خوب رونق والی شادی چاہیے۔" سومارہ نے لسٹ بتانا شروع کردی۔

کچن میں صفیہ اور آمنہ کام میں لگی تھیں۔

"میں اکیلی ڈانس کرتے اچھی نہیں لگوں گی۔" عروش نے منہ بنایا۔ اس ہی وقت سیڑھیاں اتر کر ارحم نیچے آرہا تھا۔ سومارہ کی شرارتی حس پھڑکی۔

"ارحم بھائی! آپ اور عروش میری مہندی پر ڈانس کریں گے؟ بولو قبول ہے؟" سومارہ نے کہا۔

"مجھے تو قبول ہے ان کو بھی پوچھ لو۔" ارحم بھی شوخ ہوا۔ ہمیشہ کی طرح یہ بھی عروش کے سر سے گزر گیا۔ اسے جب تک ہر بات کھول کر نہ بتائی جائے اسے کہاں سمجھ میں آتی تھی۔

صفیہ اپنے بچوں سے پوچھ چکی تھیں۔ اب جب سومارہ کو کھلے عام بات کرتے دیکھا تو احساس ہوا اس کے ارادے زیادہ دن چھپنے والے نہیں۔

"آمنہ میں نے تم سے ارحم کے رشتے کی بات کرنی تھی۔" وہ کچن میں ہی آمنہ کو کہنے لگیں۔

"جی بھابھی بولیں۔" آمنہ بھی الرٹ ہو گئیں۔

دونوں میں سے کس کو اعتراض ہونا تھا۔ دونوں نے خوشی سے قبول کیا اور سوچا ایک کمرے سے رخصت ہو کر دوسرے میں ہی جانا ہے۔ اس لیے سومارہ کی شادی کے فورا بعد کردیں گے۔ صفیہ نے من پسند بہو کا سوچ کر ٹرے لگائی اور لاؤنج میں لے آئیں۔

"باہر پوری دنیا مل سکتی ہے۔ جو نہیں مل سکتا وہ ہے امی کے ہاتھ کا دال کا حلوہ۔" ارحم نے ٹرے سے پیالی اٹھائی اور دال کا حلوہ ڈالنے لگا۔ حلوے کی خوشبو نے عروش کو بھی متوجہ کیا۔

تائی امی! ایک کام کریں گی میرے لیے پلیز۔

"عروش نے پاس بیٹھی صفیہ کا گھٹنہ دبایا۔

"اتنی خوشامد کی ضرورت نہیں۔ بولو کیا چاہیے؟"

☆☆☆

یاسر جو سمجھا تھا کہ جان چھٹی اس کو ایک بار پھر آتا دیکھا۔ وہ کوفت سے خود ہی آرڈر لینے پہنچا۔

"میں آج چائے پیوں گی لیکن تمہارے پیسوں کی۔ بدلے میں تمہارے لیے کچھ لائی ہوں۔" عروش نے ٹفن کھول کر خوشبودار دال کا حلوہ آزاد کیا۔

"بی بی! باز آجاؤ مجھے دوسرے حربے آزمانے پر مت اکساؤ۔" وہ ہمیشہ سے زیادہ خوف ناک طریقے سے بولا۔

عروش کو یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس لڑکے میں اچھائی ہے جو اسے صرف دھمکیوں سے چوکنا کررہا

ہے۔

"دو پلیٹیں لے آؤ۔" عروش نے ایسے آرام سے کہا جیسے یاسر اس کا لنگوٹیا دوست ہو۔ تماشا نہ ہو جائے اس لیے یاسر چلا گیا۔ اور چائے اور پلیٹیں لے آیا۔

"بیٹھو تم بھی کھاؤ۔" اس نے حلوہ پلیٹ میں نکالنا شروع کیا۔

یاسر غصے میں تھا مگر وہیں کھڑا تھا۔ عروش کو یقین ہو گیا کہ اب وہ سامنے دیکھ کر آگے بڑھتی رہی تو منزل سیدھی ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ایک آدمی نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ بدر اعجاز نے عروش کو اس غیر متوقع جگہ پر دیکھا تو گاڑی پارک کر کے خود بھی ادھر آ گیا۔ عروش نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

"یاسر! اگر تم اس شخص کو بھگا دو تو وعدہ میں اگلے پورے ہفتے تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔" اس نے یاسر سے التجا کی۔ یاسر نے سر اٹھا کر خوش لباس بدر کو دیکھا۔ بدر قریب آیا۔

"جب بے موقع محل کوئی مل جاتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ رزق پر نام لکھا ہوا ہے۔" بدر بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور عروش کے سامنے والی پلیٹ اپنی طرف کھینچ لی۔

"میں یہاں ضروری کام کر رہی ہوں بہتر ہوگا آپ یہاں سے چلے جائیں۔" عروش اپنے درینہ غصے پر آئی۔

"تم کام نہیں بے وقوفی کر رہی ہو۔ اپنے ارد گرد بیٹھے کسی بھی شخص کو جانتی ہو؟ تمہیں کوئی چائے میں کچھ گھول کر پلا دے تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔" بدر نے عروش کے سامنے موجود چائے کی پیالی اٹھائی اور زمین پر انڈیل دی۔ پھر سکون سے حلوہ کھانے لگا۔

"لڑکے تم بھی کھا لو۔ سمجھو صبر کا پھل مل رہا ہے۔" بدر یاسر سے مخاطب ہوا۔ یاسر بھی ان لوگوں میں سے نکلا جو بدر کی بات سے انکار نہیں کر سکتے۔ وہ بیٹھ گیا۔ بدر نے تھوڑا سا حلوہ ایک اور پلیٹ میں نکال کر یاسر کی طرف بڑھایا۔

عروش نے سوچا اگر صفیہ کو معلوم ہو جائے کہ محنت سے پکایا حلوہ بدر مزے لے کر کھا رہا ہے تو ان کا کیا ردعمل ہوگا۔ وہ سوچ کر ہی دہل گئی۔

"کیسا ہے؟" بدر نے یاسر سے پوچھا۔ وہ آتے ہی منظر پر قبضہ کر لیتا تھا۔ حلوہ صفیہ نے بنایا۔ یاسر کے لیے عروش لے کر آئی۔ عروش کی وجہ سے بدر یہاں آیا۔ مگر اب سب کرتا دھرتا بدر لگ رہا تھا۔ یاسر نے جواب نہیں دیا اور کھاتا رہا۔

"میں یہاں کچھ اصولی باتیں کرنے آئی تھی۔ آپ ایسا کریں باقی حلوہ بھی رکھ لیں اور جائیں۔" عروش نے ٹفن کا ڈھکن لگایا اور بدر کو دیا۔

"اصول کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ اصولوں پر چل کر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آپ یہاں اپنی این-جی-او کے اصول توڑ کر ہی آئی ہیں۔ ہے نا؟" وہ چہرہ دیکھ کر داستان پڑھ لیتا تھا۔ پھر وہ یاسر سے کہنے لگا۔

"دنیا ٹیڑھے راستوں سے بھری ہوئی ہے۔ بس یہ یاد رکھنا راستہ جو بھی ہو۔ اپنے باس خود بنو۔ پھر لائف سیٹ ہے۔" بدر چلتے پھرتے لائف لیسنز لٹاتا پھرتا تھا۔

"کام سیکھ رہا ہوں بعد میں اپنا ہی کروں گا۔" یاسر اس کے سامنے کھل رہا تھا۔ عروش کتنے دنوں سے اسے بولنے پر اکسا رہی تھی مگر وہ بولا تو بدر کے سامنے۔

"لیکن راستہ سیدھا ہونا بھی ضروری ہے۔ محنت تو ہر کام میں ہے پھر سیدھی طرف کیوں نہیں کی جائے۔" عروش پھر سے یاسر کو وہی سب سمجھانے لگی جو اتنے دن سے کہنا چاہ رہی تھی۔ دونوں مردوں نے اس کو نظر انداز کر کے حلوے پر توجہ کی۔

"شبیر بہت اچھی پینٹنگ بنانے لگا تھا۔ کہہ رہا تھا گھر واپس چلا جائے گا۔ اس کی زندگی سیٹ ہونے

جا رہی تھی۔" عروش نے ٹھنڈی سانس لی۔

"لڑکی، تم غلط سوچتی ہو کہ گھر سے دور ہو کر ہم مشکل میں ہیں۔ گھر تو ٹارچر تھا۔ یہاں اپنی خوشی سے جی تو سکتے ہیں۔" یاسر نے سلگتے ہوئے بتایا۔

"اپنی خوشی سے جینے کا مطلب اگر دوسروں کو دلدل میں کھینچنا ہے تو یہ خوشی تمہیں رفتہ رفتہ گدھ بنا دے گی۔ جہاں زندگی کا واحد مقصد دوسروں کی موت کا انتظار رہ جاتا ہے۔" اس نے بھی یاسر کو بچہ سمجھے بغیر کہا۔

"گدھ نہیں لیکن انسان کو شکاری ضرور بننا پڑتا ہے۔ تاکہ اپنا حق چھین سکیں۔" اس بار بدر بولا۔

"آپ نے ٹیڑھے حربے استعمال کیے۔ ہر مطلوبہ منزل حاصل کرلی۔ پھر بھی آپ کی زندگی میں کوئی کمی تو رہ گئی ہے جو یوں زنگ آلود کرسیوں پر ان برتنوں میں کھانا کھا رہے ہیں۔" عروش نے اس کی دکھتی رگ پر پاؤں رکھا۔

بدر کا ہاتھ رک گیا۔ اس کا دل چاہا عروش کو اپنی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور کرے اور اپنی ہر محرومی بتا دے۔

"زندگی کے کسی بھی موڑ پر توبہ ہو سکتی ہے۔ راستہ ٹھیک کرلو تو مستقبل اچھا ہو سکتا ہے۔ ان سے ہی پوچھ لو۔ انہوں نے کبھی اشتہاری مجرموں کا ساتھ نہیں دیا۔" اس نے عقل مندی سے بات بدر کی سمت موڑ دی۔

"وہ پڑھا لکھا ہے اس لیے دفتروں میں چھپے کرتا ہے۔ میں ان پڑھ ہوں میں سڑکوں پر ہاتھ چلا لیتا ہوں۔" یاسر آج پہلی بار بغیر غصے کے بول رہا تھا۔

"میں نے سیکھا ہے، لوٹنا جائز ہے تو ان کو لوٹو جنہوں نے غلط طریقے سے پیسہ کمایا ہے۔ دو نمبری والے کے ساتھ دو نمبری کرو۔ عام آدمی اور اپنے جیسے محنت کشوں کو لوٹنا غداری ہے۔" بدر نے اپنا فلسفہ بتایا۔

"اب تو تم بڑا آدمی بن گیا ہے، سب کچھ کر سکتا ہے۔" یاسر نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"نہیں، سب کہاں ملتا ہے۔" بدر نے خالی پلیٹ میں چمچ پھینکا۔ اور تفن دوبارہ عروش کی طرف کیا۔

"مس عروش! میں حادثہ نہیں ہوں، ہوتا تو آپ کی انگوٹھی مجھے آپ سے دور رکھتی۔" بدر نے اس کو مخاطب کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر سن گلاسز آنکھوں پر چڑھائے۔ اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

وہ سحر پھونک کر عروش کو ایسے ہی بے چین کر دیتا تھا۔ وہ جب تک چلا نہیں گیا عروش دل میں ہونے والی ہوک کے زیر اثر رہی۔ آٹھ سال پہلے عروش نے ذہن میں بدر اعجاز کے نام سے ایک شیطانی صورت وابستہ کرلی تھی۔ اب ہر ملاقات کے ساتھ اس میں رد و بدل ہو رہی تھی۔ وہ چلا گیا تو عروش کو یاد آیا وہ یاسر کے لیے کچھ لائی تھی۔ اس نے خالی کینوس پینٹ یاسر کو دیے۔

"یہ مجھے اتنے دن برداشت کرنے کے لیے۔" عروش نے مسکرا کر اس کو تحفہ دیا اور خود بھی چلی گی۔

☆☆☆

صفیہ بیگم عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ کمرے کے باہر تمام نوجوان نسل سازشی انداز میں منصوبہ بندی میں سرگرداں تھی۔ صفیہ نے جائے نماز سمیٹنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ معاذ کی لیڈرشپ میں سب آداب بجالاتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

"خیریت تو ہے؟ اس وقت میری مزاج پرسی کا خیال کیسے آیا؟" صفیہ بیگم نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ ٹکا کر گھورا۔

"تائی امی! ہم سب آپ کے روشن خیالات کے قائل ہو کر یہاں آئے ہیں۔ بیچ میں شادی بیاہ کے موقع پر بدشگونی کا خطرہ ہوتا ہے۔" معاذ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"اور ذرا سی اونچ نیچ سے تمام زندگی کی خوشیاں کھٹائی میں پڑ جاتی ہیں۔" ارم نے انہی کا قول

دہرایا۔

"ان دیکھی مصیبت کہاں ٹلتی ہے۔ پر دیکھی بھالی نحوست سے تو ہمیں جان چھڑانی ہی چاہیے۔" عروش بولتے بولتے صفیہ کے کندھے دبانے لگی۔

"مجھ سے زیادہ کس کو اندیشے ہوں گے میں تو ہر ممکن احتیاط کر رہی ہوں۔" تائی امی نے ننھے دانشوروں سے کہا۔

"مگر سب سے بری بات تو ہو گی اگر دلہن پر روپ نہ آیا۔ اور روپ تو شادی کا پسندیدہ جوڑا پہن کر ہی آتا ہے۔ "ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ چہرہ کیسے دمکے گا؟" سومارہ ماں کے سامنے بیٹھ گئی۔

سومارہ نے شادی کے لیے ایک مہنگا لباس پسند کر رکھا تھا۔ مگر صفیہ بیگم کو ایک دن کے جوڑے میں اتنی فضول خرچی گوارا نہ تھی۔ اس لیے سومارہ تمام گینگ تیار کر کے دلائل دینے پہنچی تھی۔

"بڑوں سے سنا ہے کنجوسی بھی بدشگونی کا باعث ہوتی ہے۔" ارم کا ڈائیلاگ تھا لیکن وہ بھول گئی تو معاذ نے کہا۔ "اور اگر شادی کے موقع پر دل میں ارمان رہ جائیں تو تمام عمر ادھوری خوشی میسر آتی ہے۔" ساتھ ہی اس نے نئے وہم ایجاد کیے۔

"اکلوتی بیٹی کے ارمان پورے نہ ہوں تو تایا ابا کی روح کو کیسا رنج پہنچے گا۔" عروش صفیہ کی لاڈلی تھی اس لیے تایا ابا کا حوالہ اس نے ہی دیا۔

اسی طرح سب اپنی لچھے دار باتوں میں صفیہ بیگم کو پھانسنے لگے۔

"اچھا اچھا مان گئی، ٹھیک ہے لے لو وہ جوڑا۔ میں دشمن تھوڑی ہوں۔ صرف عقل کا تقاضا تھا کہ تمہیں سمجھاؤں۔ مجھے کیا اعتراض۔" صفیہ بیگم نے ہتھیار ڈالے۔

"یاہو۔" صفیہ کے مانتے ہی سب کودتے پھلانگتے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

"اتنی رات گئے فون کرنا بدتہذیبی ہوتی ہے۔" اس نے فون اٹھایا تو معلوم ہوا آگے بدر ہے۔

"ادھوری معلومات دینا بھی کوئی اچھی عادت نہیں۔" بدر اپنے کمرے میں نیم دراز تھا۔

"کون سی ادھوری معلومات؟" وہ فون لے کر کونے میں آ گئی۔

"تم نے یاسر سے کہا کہ اگر وہ راستہ سدھار لے تو مستقبل بہتر ہو سکتا ہے۔ کیا یہ آفر دوسروں کے لیے بھی ہے؟" بدر کے لیے ان کا تعلق سالوں پرانا تھا۔

عروش اس کی معنی خیز باتیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے انجان بننا مناسب سمجھا۔

"ہر معاملے میں خود کو ترجیح دینا چھوڑ دیں۔" اس نے کچھ ڈپٹ کر کہا۔

"خدا کی قسم زندگی بہت سلجھی ہوئی تھی جب صرف اپنے بارے میں سوچتا تھا۔ یہ تو جب سے کسی اور کو پہلی صف میں لا کر کھڑا کیا ہے۔ تب سے نیندیں اڑ گئی ہیں۔" اس کے اشارے واضح ہوتے جا رہے تھے۔

"آپ میرے دشمنوں کی صف میں ہیں۔ میں آپ کے الفاظ میں چھپا وار سمجھتی ہوں۔" اس نے جتایا۔

"تم سمجھتی ہوتیں تو میرا پیار نظر آتا، وار نہیں۔" اسی لمحے بدر نے خود سے اقرار کیا اور عروش سے بھی اقرار کر ڈالا۔ عروش تو گرتے ہوئے بچی۔ یہ سب بدر کہہ رہا تھا اس سے؟ یا خدا وہ کس مشکل میں پھنس گئی تھی۔ وہ کونے سے ہو کر نکلی، ڈرتے ڈرتے سیڑھیاں چڑھیں۔ جیسے کوئی اس کی شکل دیکھ کر جان جائے گا۔ کمرا خالی تھا اس نے پھر بھی اندر جا کر کنڈی چڑھائی۔ بستر کے بجائے وہ کونے میں بیٹھ گئی۔ جیسے خود سے بھی چھپنا چاہتی ہو۔ پھر وہ لمبے سانس لینے لگی۔

"تم اتنی دیر سے کچھ کر رہی ہو مگر تم نے فون بند نہیں کیا۔" بدر دوسری طرف سب تحمل سے سن رہا تھا۔ عروش کو بھی احساس ہوا کہ فون اب بھی اس کے کان سے لگا ہے اور بدر اس کی بے ترتیب سانسیں

سن رہا ہے۔

"میں کمزور نہیں ہوں۔" اس نے بدر سے زیادہ خود کو بتایا۔

"جانتا ہوں اس لیے لگ رہا ہے تم میری کہانی برداشت کر سکتی ہو۔"

عروش عجیب بے بسی کے عالم میں تھی۔ جیسے اس میں فون بند کرنے کی سکت ہی نہیں ہو۔ بدر نے اپنی کہانی شروع کی۔ بچپن کی محرومیوں کی کہانی۔ ایمانداری کر کے بھوکا سونے کی کہانی۔ باپ کو رشوت ملنے پر پیٹ بھر کر کھانے کی کہانی۔ سب بے ایمانوں میں گھر کر اکیلا ایمان دار ہونے کے نقصان کی کہانی۔ عروش سنتی رہی۔

☆☆☆

پاکستان کے اندر ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ کئی سال پہلے کسی حکمران کے ذہن میں اسے آباد کرنے کا یہ طریقہ آیا کہ وہاں دس سال کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ کاروبار کی اجازت دے دی جائے۔ بے شمار موقع پرست لوگوں میں ایک بدر اعجاز بھی تھا۔ اس نے سکندر زمان اور حیدر زمان کے ساتھ مل کر ایک نئی فیکٹری لگائی۔ پیسہ ان کا تھا اور محنت بدر کی۔ وہ گرم مسالوں کا عام سا کام تھا۔ جو ترقی کر جاتا۔ وہاں اصل کمائی کا ذریعہ ٹیکس کی بچت تھا۔ ہر بڑا بزنس مین ٹیکس چوری کرتا ہے۔ بدر نے سوچا وہ بھی کر لے تو کیا بڑی بات ہے۔ ٹیکس دے بھی دیں تو حکمران اسے چوری ہی کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنا ٹیکس بچا کر خود اپنی فلاح کر لی جائے۔

بدر نے ان دنوں سائیڈ پر ٹریڈنگ کا کام شروع کر لیا۔ وہ گاہکوں سے آرڈر لیتا اور مطلوبہ جگہ سے سامان لے کر ان تک پہنچاتا تھا۔ جب آپ ایسا کام شروع کر دیں تو دنیا میں لگی ساری فیکٹریاں آپ کو اپنی فیکٹریاں لگنے لگتی ہیں۔ زمان برادرز کی فیکٹری میں یہ فائدہ تھا کہ وہاں پر باہر سے آنے والے کسی بھی سامان پر ٹیکس نہیں لگتا تھا۔ جس سے قیمت انتہائی مناسب ہو جاتی تھی۔ بدر نے پورے ملک سے آرڈر لینا شروع کر دیے۔ وہ زمان برادرز کی فیکٹری کی مد میں باہر سے سامان منگواتا۔ اپنا کمیشن لیتا اور بغیر ٹیکس کے مشینری دوسروں کو فراہم کرتا۔ وہ پیسہ کمپنی کو نہیں جاتا تھا۔ بدر کے اپنے اثاثے ترقی کرنے لگے۔

ان کا بزنس ابھی ابتدا میں ہی تھا کہ حکومت بدل گئی۔ پچھلی حکومت سے زمان برادرز کے کچھ ذاتی مراسم تھے۔ نئی حکومت نے ان کو بھی دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ باقاعدہ انکوائری ہوئی تو معلوم ہوا کہ جو سامان منگوایا گیا ہے۔ وہ آگے بیچ دیا گیا ہے اور یہاں لگا نہیں ہے۔ دوسری طرف زمان برادر سے بھی غلطی ہوئی تھی۔ انہوں نے باہر کے ملکوں میں سے بچے ہوئے وہ مسالے منگوائے تھے جن کی میعاد ختم بہت نزدیک تھی۔ ترقی یافتہ قوموں تو اس کی تحمل ہو سکتی ہیں کہ میعاد ختم ہونے سے مہینوں پہلے ہی شیلفوں سے سامان اٹھا دیا جائے۔ ان کے لیے وہ سامان بیکار ہوتا ہے۔ وہ سامان وہ سستے داموں ترقی پذیر قوموں نیشنز کو بیچ دیتی ہیں۔ یہ کام کر جائے تو ایک بہت اچھی مصنوعات کی میعاد ختم ہونے کی تاریخ ہے لیکن ان کی صورت میں یہ بھی کام نہیں کیا۔ جب انکوائری ہوئی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ کاروباری حکمت عملی ہے بہت نزدیک ہے۔ اس پر قانونی کارروائی تو نہیں ہو سکتی تھی لیکن مارکیٹ میں افواہیں پھیلنے لگیں۔ برانڈ کا نام بننے سے پہلے ہی ملیامیٹ ہو گیا۔

اب زمان برادرز نے عقل سے نہیں جذبات سے کام لیا اور سارا الزام بدر پر ڈالنے لگے۔ وہ چاہتے تھے بدر کو بلی کا بکرا بنا دیا جائے۔ اس پر کیس ہو اس لیے وہ لڑ جھگڑ کر بدر سے علیحدہ ہو گئے۔ مگر اصل معاملہ تو سیاسی انتقام کا تھا۔ وہ لینے والوں نے زمان برادرز سے ہی لیا تھا۔ بدر سائیڈ پر ہو گیا۔ زمان برادرز سے باقی بزنس بھی سنبھل نہ سکا۔ جہاں پر پیسے نہیں لگانے چاہیے تھے وہ پیسے لگا رہے تھے۔ وہ بزنس نہیں اپنا نام بچا رہے تھے اس چکر میں بزنس

مزید سے مزید ڈوبتا گیا۔ یہاں تک کہ گھر نیلام ہونے کی نوبت آگئی۔

☆☆☆

"قانون بنانے والے اپنا مقصد سوچ کر ہی قانون بناتے ہیں جب وہ اس قانون سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں؟" بدر اسے بتا رہا تھا۔

"لٹیروں کی کمی نہیں ہے۔ ان کو برا بھلا کہتے ہوئے تم بھی وہی کرنے لگے۔" غصے میں عروش نے کہا۔

"میں نے زمان برادرز کے بزنس میں ایک پیسے کا بھی غبن نہیں کیا۔ صرف کاغذوں میں کچھ لفظوں کی ہیرا پھیری کی تھی۔ جو میرے نزدیک جائز تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا یہ امیر ہم جیسے محنتیوں کو کبھی اوپر نہیں آنے دیں گے۔ ایک موقع تھا جس کو میں نے حاصل کر لیا۔" بدر وضاحت دے رہا تھا۔

"تم موقع پرست ہو میں جانتی ہوں اور پاپا نے بھی یہی بتایا تھا۔ انکوائری تمہارے کاموں کی وجہ سے ہوئی۔ اگر سچے تھے تو فیکٹری سے کمایا ہوا پیسہ واپس اس بزنس میں کیوں نہیں لگایا؟" عروش جواب مانگ رہی تھی۔

"اگر وہ مجھے مجھ پر بھروسا کرتے اور مجھے بزنس سے الگ نہ کرتے تو میں یہ بھی کر جاتا۔ میں اپنا الگ کام کر رہا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اس فیکٹری کو وقت نہیں دیا۔ اس فیکٹری کی ایک ایک چیز میں نے خود ڈیزائن کروائی تھی۔ میں دن رات کا فرق بھول گیا تھا۔ اس میں میرا خون پسینہ شامل تھا۔ مجھے سزا دی گئی۔ مجھے وہاں سے بغیر کسی معاوضے کے نکال دیا گیا۔ جب وہ بزنس میرے لیے پرایا ہو گیا۔ پھر میں اس کے لیے قربانی کیوں دیتا؟ یہاں بھی غریب اور مجبور سے ہی قربانی کیوں مانگی جاتی ہے؟ مجھ سے ہی قربانی مانگی گئی کہ میں اپنی محنت کو بھی چھوڑ دوں اور جو میری اپنی عقل کی کمائی ہے وہ بھی لگا دوں۔ نچلا طبقہ نچلا ہی رہے تاکہ اوپر والوں کا غرور قائم رہے۔" وہ معاشرے کا ستایا ہوا انسان تھا۔ وہ یہی سوچ رکھتا تھا۔

"ہم نے دوسرے کی قبر میں نہیں جانا۔ ہم نے اس کے اعمال کا حساب نہیں دینا۔ وہ چور ہے تو ہم نے چور نہیں بن جانا۔ آپ کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آرہی۔" عروش بری طرح زچ ہوئی۔

"معاشرے والے سبزی فروشوں، جمعداروں اور خاکروبوں کو عزت دینا شروع کردیں تو کسی کو اپنی زندگی اجیرن کر کے اوپر ہونے کی خواہش نہ رہے۔ ہمارا مسئلہ ہی یہی ہے۔ محنت نہیں پیسے کو عزت دیتے ہیں۔ بھوکے پیٹ بھی سوؤ اور بے عزت بھی ہو۔ یہ دونوں چیزیں کوئی کیسا قبول کرے؟"

"اگر تم یہی محنت سچی طرف کرتے تو بھی ضرورت کی ہر خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ ہاں تب شاید لٹانے کے لیے پیسہ نہ بچتا۔ اب جو تم نے الٹے طریقوں سے پیسہ حاصل کیا ہے اس کو اردگرد لٹا ہی رہے ہو۔ وہ تمہارے کس کام کا؟ کیا وہ دلی سکون مل رہا ہے جو تم راستے میں کھو آئے ہو؟" اب وہ بھی اسے کسی داستان کی طرح پڑھنے لگی تھی۔ اب وہ بھی ایسے محسوس کرتی تھی جیسے اسے سالوں سے جانتی ہو۔

"دل اور سکون دونوں تم سے جڑے ہیں۔ کیا تم مجھے دوسرا موقع دے سکتی ہو۔" اظہار محبت کے معاملے میں آج بھی وہ سترہ سالہ بدر تھا۔ وہ ٹھکرایا نہیں جانا چاہتا تھا۔

"آپ بھی سیدھے راستے کا انتخاب کیوں نہیں کرتے ہمیشہ وہی راستہ کیوں لیتے ہیں جس میں رکاوٹیں ہوتی ہیں۔" وہ پھر سے فارمل انداز میں بولی۔

"میری قسمت میں نقص ہے۔ آسانی سے کچھ نہیں ملتا۔" بدر خود پر ہنسا۔

"قسمت نہیں نظریہ ناقص ہے۔ آپ دنیا کو غصے اور بدلے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی معاشرے نے آپ کی ہر محنت کا صلہ بھی دیا ہے۔ اور آپ کی ہر تکلیف کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔"

"مجھے ہر صلہ نہیں ملا۔ مجھے تم نہیں ملیں۔"

عروش بری طرح لرز گئی۔ یہ الفاظ اس کے دل پہ اثر کر رہے تھے۔ اتنے سالوں سے بدر اعجاز کی نفرت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ دادی کی موت تایا کی بیماری اور اپنی وہ مجسم منزل۔ وہ سب شکوے بدر کے زندگی میں آنے کے بعد ختم کیوں ہو گئے تھے؟ بدر سچ میں ایک مکڑی تھا اور عروش کے گرد جال بری طرح سے لپٹ چکا تھا۔

☆☆☆

"تعبیر" کو بڑے ادارے تک کا سفر طے کرنے لیے میڈیا کے ذریعے تشہیر درکار تھی۔ بدر نے اپنا گھر اور خدمات پیش کر کے ان کا مقصد نہایت آسان کر دیا تھا۔ ان کی پہلی پریس میٹ بدر کے گھر ہوئی تھی۔ عروش کے جذبات عجیب مدوجزر کا شکار تھے۔ جب انسان کی سوچوں اور راستوں کی ڈور ایک ہی شخص کے در پر آ کر رکنے لگے تو احساس تلاطم سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

گھر میں داخل ہو کر واضح طور پر نظر آتا تھا کہ گھر کا مالک خود سے بہت محبت کرتا ہے۔ لاؤنج میں بدر کی ایک بڑی سی تصویر لگی تھی جس کے ارد گرد اخباروں اور میگزینز میں اس کے متعلق شائع ہونے والی خبریں فریم کر کے آویزاں تھیں۔ گھر کی آرائشی اشیا کسی پاسپورٹ کی طرح بتا دیتی تھیں کہ اس میں رہنے والا کن ممالک جا چکا ہے۔

سب سے آگے حماد اور ہانیہ تھے۔ وہ سب سے پیچھے۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ بدر کو سوچتے ہوئے ماضی بھول جاتی تھی۔ پچھلی رات اس نے تمام گلابی کاغذ نکال کر وہ شعر پڑھے تھے۔ اب بدر کے گھر میں اس کی تصویر کے حصار میں وہ شعر اسے یاد آ رہے تھے۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے ہمیں اپنے گھر میں بلایا۔ آپ کا جو آئیڈیا ہے وہ یقیناً پریس والوں کے دل میں گھر کر جائے گا۔" حماد نے بدر کو دیکھ کر اس سے مصافحہ کیا اور شکریہ کی گردان پھر شروع کر دی۔

عروش نے بدر کو پہلی بار جینز میں ملبوس دیکھا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو خوب مینٹین کیا ہوا تھا۔ لیکن اس دن پہلے سے بھی زیادہ ینگ لگ رہا تھا۔

"چلیں، تو سارے اپنی اپنی ڈیوٹی سن لیں۔ یہ اس طرف کچن ہے یہ تین لوگ کچن میں آپ کی ہیلپ کریں گے۔ یہ الٹے ہاتھ پہ لان ہے جہاں پہ کرسیاں لگ رہی ہیں۔ لیکن جب پریس کے لوگ آئیں گے تو میں چاہتا ہوں کہ ان کو مینیو این۔جی۔او کے افراد دیں۔ ہم ایک پرسنلا ئزڈ ماحول دینا چاہتے ہیں۔" بدر نے سب کو ہدایات دیں۔

این۔جی۔او کے افراد کے ساتھ وہ بچے بھی آئے تھے جو شام میں وہاں باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔

کاظمی صاحب کی کوششوں سے ایک جگہ کا انتظام ہوا تھا۔ اب اس جگہ کو ہاسٹل میں تبدیل کیا جاتا یا اسکول۔ سب نے باہمی مشاورت سے طے کیا کہ اس جگہ کو ایک اسکول بنا دیا جائے۔ اب دنیا کو "تعبیر" کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ اس لیے آج یہ پریس میٹ رکھی گئی تھی۔

تمام افراد اپنی مطلوبہ سمت کا رخ کرنے لگے تو بدر عروش کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستگی سے بولا۔

"ویلکم ٹو مائی ہوم۔"

عروش کی پلکیں وزنی ہوئی۔ بدر چند لمحے دلچسپی سے عروش کی گھبراہٹ دیکھنے کے بعد اس کے راستے سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

تقریب کو ایک ریسٹورنٹ کے انداز میں سجایا گیا تھا۔ آج اس ریسٹورنٹ کا مہمان "میڈیا" تھا۔ سارا انتظام اور پیسہ بدر نے لگایا تھا پھر بھی تعبیر کے حق میں یہی بہتر تھا کہ بدر منظر عام سے ہٹا رہے۔ اس لیے اس نے کچن کا انتظام سنبھال لیا۔ آدھے

بچے بدر کے ساتھ مل کر کچن میں کھانا تیار کر رہے تھے اور باقی آدھے حماد کی سرپرستی میں ویٹرز کا کام انجام دے رہے تھے۔ "تعبیر" کے باقی پانچ افراد میڈیا کی ٹیبلو پر موجود تھے۔ وہ "تعبیر" کے زیراہتمام ہونے والے کام میڈیا کو بتا رہے تھے۔ بدر کی کوکنگ کی مہارت بچوں کے ساتھ مل کر کھانا پکاتے ہوئے یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ ایک ہی گھر کے افراد ہیں۔ دوسری طرف حماد کی چستی اور شوخی نے میزوں پر سروس کو ایک دلچسپ کھیل کی شکل دے دی تھی۔ جس سے سارے ہی محظوظ ہو رہے تھے۔ "تعبیر" ایک این۔جی۔او سے زیادہ ایک فیملی کی طرح نظر آ رہی تھی اور یہی مثبت تاثر وہ میڈیا کو دکھانا چاہتے تھے۔

☆☆☆

وہ پیپر ناول سے ہاتھ خشک کرتا ہوا کچن سے نکلا۔ اس کا کمرا اوپر تھا۔ لیکن نیچے کی منزل پر ایک اور کمرا تھا جہاں وہ وقت گزارتا تھا۔ وہاں کا سارا فرنیچر باقی گھر کی طرح مہنگا اور ون آف آ کائنڈ تھا۔ لیکن کوئی بھی چیز دوسرے سے میل نہیں کھاتی تھی۔ سفید رنگ کی ٹیبل۔ بھوری رائٹنگ چیر۔ اور سبز ریکلائنر جس پر بدر فرصت کے دن میں لیٹ کر کتاب پڑھ لیتا تھا۔ اس ریکلائنر سے گھر کا پچھلا لان نظر آتا تھا۔ وہاں گارڈ کی چارپائی، ڈرائیور کا بستر، بدر کی پرانی بائیک پڑی تھی۔ یہ منظر بدر کو اپنے بچپن کی یاد دلاتا تھا۔ اس لیے اس نے اس حصے کو صاف کروانے کو بھی نہیں کہا۔ اب بدر اس کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا۔ کمرے میں عروش پہلے سے موجود تھی۔ وہ کتابوں کے شیلف پر ہاتھ پھیرتی کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ آسمانی لباس، کھلے بال، مسکراتے لب۔ وہ دل میں خود سے کوئی دلفریب بات کر رہی ہو گی۔ شاید بدر سے ہی مخاطب ہو۔

بدر کے لیے اس کا اپنے گھر میں ہونا ہی ناقابل فہم خوشی کا باعث تھا۔ اب وہ بدر کی پرسنل اسپیس میں اتنی پرسکون تھی تو بدر نے خود سے سارے سچ کہہ دیے۔ عروش اس کا جنون تھی۔ وہ اس کے لیے برباد ہو سکتا تھا اور ہونا چاہتا تھا۔ وہ خود کو شکاری کہتا تھا تو یہ برتری برقرار رکھنے کے لیے صرف ایک ڈھکوسلہ تھا۔ وہ تو شکار تھا۔ اس کی موجودگی سے بے خبر عروش ایک چاندی کا بکس دیکھ رہی تھی۔ بکس پر قسم قسم کے پتھر جڑے تھے۔

"محبوب کو پتھر اسی لیے کہتے ہیں۔ حسین ہوتا ہے اور مضبوط بھی۔ اپنی قیمت جانتا ہے پھر بھی تڑپانے کے لیے انجان بنتا ہے۔ ویسے میرا کمرا اوپر ہے۔ کھڑکی سے دن میں پھول نظر آتے ہیں اور رات میں تارے۔" بدر کہے بنا نہیں رہ سکا۔

عروش نے شرمندہ ہو کر اپنی کھلی انگلیاں بکسے سے ہٹائیں۔

"میں ویسے ہی ادھر آ گئی تھی۔" اس نے نظریں چرائیں۔

بدر پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر تسلی سے ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے پاس آ گیا۔ بدر نے بکسا کھول کر دکھایا۔ اندر اس کی فیملی فوٹو گرافس تھیں۔

"صمد کو تو آپ جانتی ہیں۔ یہ میری امی کی تصویر ہے۔" بدر نے ایک تصویر نکالی جس کے سارے رنگ اب نارنجی ہو گئے تھے۔

بدر جیسے نین نقش والی وہ سادہ سی خاتون تھیں۔

"یہ تو بہت نیس لگتی ہیں۔" عروش کو وہ کہیں سے بھی بدر کی ماں نہیں لگ رہی تھیں۔

"اونچائی کے سفر میں کئی لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ امی بھی ناراض رہتی تھیں۔ کہتی تھیں میں غلط چیزوں کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔" اسے اچھا لگ رہا تھا عروش سے ذاتی باتیں کرنا۔

"آپ کی اتنی بڑی فیملی تھی۔ کوئی نظر نہیں آ رہا۔" عروش ایک کے بعد ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے خاندان کے واحد کیمرے سے لی گئی تصاویر تھیں۔ ہر تصویر میں مجمع لگا تھا۔

"گھر بڑا ہو گیا تو گھر والے دور ہو گئے۔ امی رہی نہیں۔ بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ صمد کو بھی میرے طریقوں سے اختلاف ہے حالانکہ ان

طریقوں سے ہی میں نے ان سب کو پالا ہے۔ اس کو دھکے نہیں کھانے پڑے۔ وہ میری کیفیت نہیں سمجھ سکتا۔" بدر نے صمد اور اپنے بچپن کی تصویر بکسے میں رکھ کر ڈھکن بند کر دیا۔

"ویسے کالج کے پانچ سال میرا اور صمد کا ایک بھی بات پر اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن ایسا ہے تو آپ کے گھر والوں سے میری اچھی بنے گی۔"

بدر کڑوی مسکراہٹ مسکرا دیا۔

"آپ کی گڈ بکس میں آنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"دوبارہ جنم لینا ہوگا۔" عروش نے اپنے بال جھٹکے اور آگے چل کر ٹیبل پہ پڑی چیزوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"کوئی آسان طریقہ نہیں ہے۔" بدر مسکرایا۔

"اس لیے ہم دشمن ہی اچھے ہیں۔"

"آپ کی دشمنی میری محبت کی طرح ہے۔" بدر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عروش چونک کر سیدھی ہوئی اور مڑ کر دیکھا بدر نے مسکرا کر اپنا جملہ مکمل کیا۔

"دونوں ہی یکطرفہ ہیں۔"

عروش باہر جانے لگی۔ بدر نے ہاتھ آگے کر کے اس کا راستہ روکا۔

"کوئی تو چیز ہوگی جو تمہیں بہت عزیز ہو۔ جو تمہارے قدموں میں رکھ کر میں اپنا کفارہ ادا کر سکوں۔" اس کا ہر جذبہ اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔

عروش نے چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔

"تبسم منزل۔ وہاں کے امرود کے درخت۔ وہاں کا صحن۔ وہ کمرے جن میں میرا بچپن ہے۔ وہ میرے لیے سب سے قیمتی تھے۔ وہ نیلام ہو گیا۔ وقت پلٹ نہیں سکتے۔ تو ایسے سوال مت کریں۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔

باہر لان سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔

عروش سب چھوڑ کر باہر نکلی۔

حیرت کی بات ہے کہ بدر کو کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ وہ سامنے ہوتی تھی تو اسے اور کچھ کہاں یاد رہتا تھا۔

اس کے یوں اچانک چلے جانے سے بدر کو اپنا آپ اصطبل میں کام کرنے والے اس لڑکے سا لگا۔ جو شہزادی سے محبت کر بیٹھا تھا۔ وہ روز اس کی کھڑکی پر ایک سنگ ریزہ پھینک کر اس کی جھلک کا انتظار کرتا۔ لیکن وہ شہزادی تھی۔ عروش کی طرح۔ کبھی جھلک دکھلائی تو کبھی اسے یکسر فراموش کر دیتی۔ وہ تمام رات سردی میں ٹھٹھرتا شہزادی کی ایک جھلک کا انتظار کرتا رہتا۔

☆☆☆

عروش باہر لان میں پہنچی بڑے دروازے کے پاس یاسر موجود تھا۔ گارڈز نے اسے آنے دیا تھا کیونکہ اس جیسے اور بچے بھی ادھر تھے۔ لیکن جب ہانیہ اور حماد نے اس کو دیکھا تو وہ پریشان ہو گئے۔

"یاسر! تم آ گئے، بہت خوشی ہوئی۔ آؤ۔" عروش بھاگ کر اس کے پاس گئی اور بازو سے تھام کر اندر لائی۔

"اس کو عروش نے بلایا ہے؟ اس کو منع بھی کیا تھا۔" ہانیہ اوپر سے مسکرا رہی تھی اور اندر سے دانت پیس رہی تھی۔

"اس کا تو ایف-آئی-آر میں نام بھی آ چکا ہے۔ میڈیا تو منٹوں میں سارا ریکارڈ نکال لے گا۔" حماد بھی پریشان ہوا۔

سب سے بے خبر عروش یاسر کا دوسرے بچوں سے تعارف کروا رہی تھی۔ باقی میڈیا نے دھڑا دھڑ تصاویر لینا شروع کر دیں۔ ابھی وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ لڑکا کون ہے مگر اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ یہ سب سے خاص ہے۔

"میرے چیتے آ گئے۔ آؤ دونوں دوست اندر آرام سے کھانا کھاتے ہیں۔" بدر آیا تو لمحوں میں سارا ماجرا سمجھ گیا۔ وہ اتنی محبت سے یاسر کو اندر لے گیا

کہ عروش کو اس کی مصلحت کی سمجھ بھی نہیں آئی۔ باقی سارا ایونٹ پلان کے مطابق ہوا۔ یاسر اس کے کہنے پر آگیا تھا عروش تو سوچ سوچ کر ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ میڈیا کے جانے کا بعد۔ جب بدر یاسر اور باقی بچے اندر کھیل رہے تھے۔ تو حماد اور ہانیہ نے عروش کے دماغ کو زمین پر اتارا۔

"یہ فنکشن صرف "تعبیر" کے بچوں کے لیے تھا۔ تم نے اس کو کیوں بلایا۔" ہانیہ نے بے شک یہ کام فلاحی جذبے سے شروع کیا تھا۔ لیکن اب اسے اپنی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ وہ سخت گیر ہو گئی تھی۔

"یہ دیکھو کہ وہ آگیا۔ جس یاسر کے بارے میں سب نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب غلط راستے پر ہی چلے گا۔ اس کے اندر بچپنا ختم ہو گیا ہے۔ وہ میرے کہنے پر بچوں کی اس محفل میں۔ "تعبیر کی محفل" میں آیا ہے۔ اس سے بڑا ثبوت کیا چاہیے کہ وہ بھی اچھا انسان بننا چاہتا ہے۔" عروش نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ لاؤنج میں سارے بچے بے فکری سے انجوائے کر رہے تھے۔ کوئی انہیں نہیں کہہ رہا تھا کہ صوفوں پر چھلانگ مت لگاؤ۔ گندے جوتے قالینوں پر نہ رکھو۔ آرائشی اشیاء کو نہ چھوؤ۔ بدر نے سب کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔

"ہمیں یاسر سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں صرف یہ سمجھا رہی ہوں کہ اس ایک لڑکے کے لیے تعبیر کے باقی سارے بچوں کا مستقبل خراب ہو سکتا ہے۔" حماد نے اس کو سمجھایا۔

عروش کا اتنا اچھا موڈ تھا کہ اس کو کسی کی کوئی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

"کبھی کبھی کسی ایک کا راہ راست پر آنا باقی دنیا کے تمام لوگوں سے اہم ہو جاتا ہے۔ میرے لیے یاسر کا معاملہ بھی یہی ہے۔" عروش نے پکی خوشی سے کہا۔

"وہ ایک جس کے بارے میں ہم قبول کر چکے تھے کہ وہ کبھی نہیں سدھرے گا۔ اس نے اچھے راستے کی طرف پہلا قدم بڑھایا ہے۔ یہ ہم سب کی جیت ہے۔" عروش اتنے مثبت رویے سے کہہ رہی تھی کہ ہانیہ خاموش ہو گئی۔ حماد بھی اس کی بات تولنے لگا۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کا سدھرنا سب سے اہم ہو کر رہ جائے۔

☆☆☆

گھر میں ڈھولکی تھی۔ سومارہ کی سہیلیاں اور ہم عمر کزنز آئی ہوئی تھیں۔ پیزا آرڈر کیا تھا، چپس اور ڈپ بنائی تھی۔ اب وہ ڈانس پریکٹس کر رہی تھیں۔ سب کو عروش کا انتظار تھا جو دفتر سے پہنچنے والی تھی۔ ان سب میں سرفہرست حیدر زمان تھے۔ وہ تشویش کے عالم میں لاؤنج میں ٹہل رہے تھے۔ سخت گرفت کے باعث ان کے ہاتھ میں موجود اخبار پر ان کے ہاتھ جیسے گہرے بل پڑ گئے تھے۔ آمنہ بیگم بھی کھڑی تھیں۔ منیبہ صوفے پر بیٹھی سوچ رہی تھی اگر آج حیدر نے اپنی بیٹی سے جواب نہ مانگا تو وہ خود مانگیں گی۔ سومارہ بھی مہمانوں کے پاس ارم کو چھوڑ کر باہر آ گئی تھی۔

"مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا ہے۔ اتنا غصے میں مت آئیں۔" آمنہ نے سمجھایا۔

"تم بدر اعجاز کو نہیں جانتیں وہ سکندر بھائی جیسے جہاں دیدہ انسان کو انگلی پر لپیٹ سکتا ہے تو عروش تو بچی ہے۔" آج عروش نے ان کا شرمناک ماضی پھر سے ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"چلو جی دلہن صاحبہ، تمہارے لیے خاص ڈھولکی کا کیک بنوایا ہے کیا یاد کرو گی۔" عروش چہکتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں برائڈل شاور کا سامان تھا۔ ساتھ ایک پیلے رنگ کا کیک تھا جس پر مہندی کے ڈیزائن جیسی آئسنگ تھی اور ڈھولکی بنی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سب کو دیکھا۔ سارے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ کسی بھی چہرے پر مسکراہٹ دور دور تک نہیں تھی۔ حیدر زمان ٹی-وی کے سامنے سے ہٹ گئے۔ وہاں "تعبیر" پر رپورٹ چل رہی تھی۔ وہی سب دکھا رہے تھے جو کچھ گھنٹوں

پہلے ہو رہا تھا۔ ہانیہ، حماد کا انٹرویو، بچوں کی باتیں۔ عروش بھی دیکھ چکی تھی اور بدر اعجاز بھی۔

"تم اس شخص کے ساتھ اس کے گھر میں تھیں یہ تو ممکن نہیں کہ تم جانتی نہ ہو کہ وہ کون ہے۔" حیدر زمان اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

عروش اس سب کے لیے تیار نہیں تھی۔

"وہ "تعبیر" کا ڈونر ہے۔" عروش نے لرزتی زبان سے بولا۔

"ٹھیک ہے تم آج کے بعد "تعبیر" نہیں جاؤ گی۔" حیدر زمان نے فیصلہ سنا کر ٹی۔وی بند کر دیا۔

"میں اس کی نوکری نہیں کر رہی۔" عروش نے منت کی۔

"جس جگہ وہ ہو وہاں تمہارا جانا بھی محفوظ نہیں۔ میں تمہاری بھلائی کے لیے فیصلہ کر رہا ہوں۔" حیدر زمان بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔

عروش ایک کامیاب ایونٹ کے بعد بہت خوش آئی تھی لیکن یہ کیا ہو گیا۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکا کر جانے لگی۔

"چاچو! آپ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔" ارحم سب سے زیادہ طیش میں تھا۔

عروش نے جاتے ہوئے مڑ کر باپ کو دیکھا۔

"بابا! آپ کو یاد ہے ایک دفعہ میں ڈوبتے ہوئے بچی تھی۔" اس نے سب کی شکلیں دیکھیں۔ سب کو ہی وہ دن یاد تھا۔

"اس دن مجھے پانی سے بدر اعجاز نے نکالا تھا۔ وہ سائیکل پر چیزیں بیچنے والا ایک بچہ تھا۔ جن کا بچپن محفوظ نہ ہو وہ بڑے ہو کر دوسروں کو بھی خطرے میں ڈالتے ہیں۔ "تعبیر" بچوں کا بچپن بچانے کا کام کرتا ہے۔ اور آپ مجھے "تعبیر" سے جدا کر رہے ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔

حیدر خاموش رہا۔ اس کا فیصلہ بھی اٹل تھا۔

☆☆☆

وہ عجیب بوجھل رات تھی۔ سومارہ اور عروش نے کس طرح ڈھولکی میں خود کو نارمل رکھا یہ صرف وہی جانتی تھیں۔ گھر کا ماحول شادی کی رونق سے یکسر پلٹ گیا تھا۔ سومارہ خاموشی سے اپنی چوڑیاں اتار رہی تھی۔ عروش نے بھی بجھے انداز میں اپنے انگوٹھے کی بڑی سبز انگوٹھی اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

"تمہیں وہ گلابی پرچیاں بھیجنے والا بدر اعجاز ہی تھا نا؟" سومارہ کو سب سمجھ میں آ گیا تھا۔

"وہ صرف "تعبیر" کا ڈونر نہیں ہے۔ وہ انسان ہے جس نے آٹھ سال کی عمر میں مجھے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ وہ ہے جو اس دن کے بعد سے مجھے کبھی نہیں بھولا۔ اس نے میری خاطر اپنی زندگی پلٹ دی۔ اسے زندگی بار بار میرے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کے دعوے کرتا ہے۔ میں نے سالوں اس سے شدید نفرت کی۔ لیکن اب میں اس سے نفرت نہیں کر پا رہی ہوں۔" عروش سے بھی ضبط نہیں ہوا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" سومارہ پیار سے اس کے پاس آ بیٹھی۔

"مجھے سمجھ میں بھی نہیں آ رہا کہ میں محسوس کیا کرتی ہوں۔ کبھی وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ کبھی اتنا غصہ آتا ہے کہ دل کرتا ہے اس کا سر پھاڑ دوں۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"بدر اعجاز ہمارے خاندان کے لیے ایک کالا جوڑا بن گیا ہے۔ اس سے بدقسمتی کے اتنے باب منسوب ہیں کہ اب اگر وہ کوئی مثبت کردار ادا کرنا بھی چاہے تو ہم یہ ہونے نہیں دے سکتے۔" سومارہ نے تسلی سے سمجھایا۔

"پھر میں کیا کروں؟" اس کی اپنی عقل تو جواب دے گئی تھی۔

"تم وہی کرو جو چچا کہہ رہے ہیں۔ اسی میں بہتری ہے۔" سومارہ نے عروش کو گلے لگا لیا۔

عروش بھی خود کو سمجھانے لگی۔ بدر اعجاز وہ پتھر تھا جس کو تراشنا کبھی بھی اس کا مقصد نہیں تھا۔

"تمہارا فون بج رہا ہے۔" سومارہ نے اس کی

توجہ کرائی۔

"ہیلو حماد۔" عروش کو لگا تھا کہ جتنا برا ہونا تھا ہو چکا۔ وہ غلط تھی۔

"کچھ لوگوں نے مدینہ ہوٹل پہ فائرنگ کروائی ہے تم گھر سے مت نکلنا۔ آج میڈیا میں ہمارے ساتھ یاسر کی تصویریں بھی آئی ہیں۔ اس کے گینگ کا ردعمل آیا ہے۔"

"یاسر ٹھیک تو ہے؟" اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔ لیکن تم گھر سے مت نکلنا۔" حماد نے سختی سے ہدایات دیں۔

"میری وجہ سے یاسر کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ میں بھی آتی ہوں۔" وہ ضد کرنے لگی۔

"کس کس کی جان سے کھیلو گی۔ کبھی بات مان بھی لیا کرو۔" حماد نے غصے سے کہا اور فون بند کر دیا۔

عروش کو رات گئے حماد کا میسج آیا تھا کہ یاسر نہیں ملا۔

☆☆☆

شبیر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ارسلان کے ہاتھ میں بندوق تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اس ہی بندوق سے ابھی یاسر پر فائر کر کے آیا تھا۔ یاسر اس کا پرانا دوست۔ اس ہی مدینہ ہوٹل میں اس پر گولیاں چلی تھیں جہاں کچھ عرصے پہلے تک شبیر بھی جایا کرتا تھا۔ یعنی اس نے ارسلان کی نہ مانی تو اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ وہ تو اچھے مستقبل کے لیے آیا تھا۔ یہاں تو صرف غلامی تھی۔

"کیوں آیا ہے بول نا۔" ارسلان شدید اضطراب میں تھا۔ اپنے پالتو کی جان لینا آسان کام نہیں ہوتا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری ہے۔" شبیر نے پیغام دیا۔ وہ اب بھی کانپ رہا تھا۔

"یہ سب اس کے کام نہ کرنے کے بہانے ہیں۔ اس سے کہو کام کرے اور نکلے وہاں سے۔ کام نہ ہوا تو ساری عمر وہیں سڑاؤں گا۔" ارسلان نے بندوق کو مزید قوت سے پکڑا۔ شبیر مزید لرز گیا۔ اگر وہ لڑکی جو اتنی بڑی تھی۔ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ ارسلان اس سے شادی بھی کرنے والا تھا، وہ اپنی مرضی سے اس چنگل سے نہیں نکل سکتی تو شبیر کی کیا اوقات۔

☆☆☆

گھر والے اسے "تعبیر" جانے نہیں دے رہے تھے۔ "تعبیر" والے اسے آنے سے منع کر رہے تھے۔ حماد کو خود کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تھی کہ گلٹ سے مرے جا رہی تھی۔ اس نے اپنی بے وقوفی سے یاسر کی زندگی خطرے میں ڈالی تھی۔ گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا اور اس کے دل میں طوفان۔ اس ہی دوران بدر کی کال آئی۔ پہلی بار فون اسکرین پر بدر کا نام ابھرتا دیکھ کر اس کو غصہ نہیں آیا۔ جیسے دنیا میں وہ ایک واحد شخص ہے جو اس کو سمجھ سکتا ہے۔

"کیسی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ادھوری۔ شکست خوردہ۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تمہیں ادھورا کیسے ہونے دے سکتا ہوں۔ یاسر ٹھیک ہے۔ میں نے اسے ایک محفوظ مقام پر منتقل کروا دیا ہے۔"

عروش کے دل سے منوں بوجھ اتر گیا۔

"مجھے ڈر تھا کہ یاسر کو کوئی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنا آدمی اس کی نگرانی پر پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ اس نے ہی بروقت بھگایا۔"

"بھاگنا کامیابی ہے کہ ناکامی؟"

"تم نے بدی کے کیچڑ سے ایک بچے کو نکال لیا ہے۔ جو بچے اس کی وجہ سے اس کیچڑ میں جانے والے تھے ان کو بھی بچا لیا ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔" بدر نے تعریف کی۔

"چلیں میں اب چلتی ہوں۔ میری کزن کا مایوں ہے۔" عروش نے اپنے اجاڑ حلیے پر نظر ڈالی پھر گیٹ سے آتے سجے بنے مہمانوں کو دیکھا۔

"رات کو فارغ ہو کر میسج کر دینا۔" بدر نے اسے اتنی بڑی خبر دی تھی۔ انعام مانگنا بنتا تھا۔
"نہیں کر سکتی آج ہاتھوں پر مہندی لگوانی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔
"عروش کدھر رہ گئی ہو۔" آمنہ نے آواز دی عروش نے فون بند کر دیا۔
بدر نے موبائل کی بجھتی ہوئی لائٹ کو دیکھا۔ وہ قطار میں کھڑا ہونے والا ہوتا تو اب بھی جیولری کی دکان پر بیٹھا مالک کی نظر کرم کا انتظار کر رہا ہوتا۔ یا ڈگریاں ہاتھ میں لیے اس امید پر آفسوں کے چکر کاٹ رہا ہوتا کہ نوکری دینے والے بڑی سفارش اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے والوں کو چھوڑ کر اسے موقع دیں گے۔ قطار میں کھڑا ہونا اسے پہلے گوارا تھا نہ اب۔

☆☆☆

عروش کے اگر دس ہاتھ بھی ہوتے تو انتظامات کی مصروفیت میں کم معلوم ہوتے۔ ہر رسم پر اسی کا نام پکارا جا رہا تھا۔ وہ مہندی لگے ہاتھوں کے باوجود ایک طرف سے دوسری طرف بھاگے جا رہی تھی۔ قریبی رشتہ داروں کی اس مختصر سی محفل میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ پھر اچانک سب پر سناٹے کی لہر چھانے لگی۔ عروش نے بھی چونک کر سر اٹھایا۔ اس نے دیکھا گیٹ سے بدر اعجاز پھولوں کا گلدستہ لیے داخل ہو رہا تھا۔ جان نکلنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ بدر کے راستے میں ارحم حائل ہو گیا۔ لیکن بدر کو روکنے والا پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ چلتے ہوئے حیدر زمان کے سامنے آیا۔
"آپ بھی کاروباری آدمی ہیں۔ کاروبار میں بھی کرتا ہوں۔ اتنا تو ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ نفرتوں کا کاروبار دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔" بدر نے احترام سے کہا۔
"اس لین دین کے تجربے نے ہی مجھے سمجھایا ہے کہ دو منہ والے اژدھے سے تعلق رکھنا زندگی میں صرف زہر گھولتا ہے۔ میری گھریلو تقریب چل رہی ہے تم جاؤ۔" حیدر زمان نے نیچی آواز میں کہا۔

"گھر کے مہمان کے ساتھ بدسلوکی برکت اٹھا دیتی ہے۔ خاص طور پر تب جب آنے والا پرانی کدورتیں بھلانے آیا ہو۔" بدر جانتا تھا کہ زمان برادرز کے بزنس میں خسارہ چل رہا ہے اور ارحم بھی ان مشکلوں سے نبرد آزما ہونے میں ناکام ہے۔
"مہمانوں کی خاطرداری کا رواج میرے بھائی نے ڈالا تھا۔ لیکن تمہاری وجہ سے آج ان کے نام سے پہلے مرحوم لکھنا پڑتا ہے۔"
ناتواں انداز میں کہے حیدر زمان کے اس جملے سے بدر پر حقیقت آشکار ہوئی۔ وہ سمجھا تھا عروش کا خاندان بزنس میں گھاٹے کے باعث اس سے نفرت کرتا ہے۔ پر اس وقت اندازہ ہوا کہ ارد گرد کا ہر شخص اسے سکندر زمان کا قاتل سمجھ رہا ہے۔ وہ جو سمجھا تھا معافی مانگ کر بزنس میں پھنسے نکلوانے کی یقین دہانی کر کے حیدر زمان کا دل صاف کر دے گا خود کو قتل کے جرم میں بے گناہ ثابت کرنے کو بالکل تیار نہ تھا۔
عروش دروازے سے نکل کر لان میں آ چکی تھی اور فق رنگت کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ بدر اعتماد سے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ خاموشی چہ مگوئیوں میں بدل گئی۔
"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس نے آنکھیں دکھائیں۔
"تمہاری مہندی جو بھجنی تھی۔" بدر نے کہہ کر گلدستہ عروش کو تھما دیا۔
بدر کے جانے تک ہر آنکھ نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا اور اس کے جاتے ہی سب آنکھیں عروش پر جم گئیں۔ سوائے حیدر زمان کے۔ اس کے باپ کی آنکھیں شرمندگی سے زمین میں گڑ چکی تھیں۔

☆☆☆

یہ آمنہ بیگم کی سمجھداری ہی تھی کہ بگڑے ماحول میں مزید افراتفری مچنے کے بجائے سب دوبارہ رسم و رواج میں لگ گئے اور تقریب مکمل ہوئی۔ مہمان

چلے گئے مگر گھر اجنبیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے لیے ہر شخص اجنبی ہو گیا تھا۔ اس کو اپنے پیروں تلے زمین تنگ ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کے ماں باپ کی تربیت میں کسی لڑکے سے میل جول ہی نامناسب تھا۔ کہاں وہ شخص گھر چلا آیا جو خاندان کی عزت اور وقار کو تلپٹ کرنے کا باعث رہا تھا۔ صفیہ بیگم کے ان کہے لفظوں کی کاٹ بھی کم نہ تھی۔ عروش ان سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ منہ پھیر لیتیں۔ باقی بھی اس سے ایسے راستہ بدل کے چل رہے تھے جیسے وہ وہاں ہو ہی نہیں۔

سومارو کی مہندی کی تقریب عروش کے نامہ اعمال کا دن بن گیا۔ جن کو مایوں کی تقریب کا قصہ معلوم تھا انہوں نے ہر اس شخص کو بتایا جو انجان تھا۔ گھر واپس آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور اس نے خود بدر کو فون ملایا تھا۔

"میری رسوائی کا سامان کر کے آپ نے مجھے بہترین تحفہ دیا ہے۔"

"بہادری کے تمام دعووں کے باوجود تم خوف تلے جیتی ہو۔ قدم اٹھانے کی ہمت مجھے ہی کرنی تھی۔ تم نے وکالت پڑھی ہے لیکن میرے حق میں ایک دلیل بھی نہ دے سکیں۔"

"قدم اٹھانے سے پہلے دیکھ لیتا تھا کہ میرا کردار آپ کے پاؤں تلے روندا تو نہیں جا رہا!"

"تم گھر میں کہہ دو کہ بدر اعجاز یک طرفہ جذبے لیے تمہارے راستے میں حائل ہو رہا ہے۔ تم سب کی نظر میں پھر سے سرخرو ہو جاؤ گی۔ لیکن ان کو کہنے سے پہلے مجھے بتاؤ کیا یہی سچ ہے؟"

ایک بزدل دوسرا جلد باز قسمت کے کھ جوڑ بھی نرالے تھے۔

"مجھے آپ جیسے جیت کے جنونی شخص سے رابطہ بھی نہیں رکھنا۔ میری جڑیں کاٹ کر آپ اپنے جھنڈے گاڑھنا چاہتے ہیں؟ کاش میری زندگی ایسی ہو جائے کہ اس میں بدر اعجاز دور دور تک نہ ہو۔"

"اس شخص کو خود سے دور کرنا چاہتی ہو جو تمہارے لیے ہر قربانی دے سکتا ہے؟ جو تمہاری ہر مصیبت کو اپنے اوپر لینے کو تیار ہے؟ جس نے تمہیں اتنا ٹوٹ کر چاہا ہے کہ تمہارے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔" بدر شدید تکلیف میں تھا۔

"انسان کا ایک جھوٹ اس کی زندگی بھر کے سچ پر غالب آ جاتا ہے۔ آپ کا ایک دھوکا آپ کی ہر چیز پہ غالب ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔ بلکہ میں اس کے بارے میں سوچوں ہی کیوں؟ جب کہ میں جانتی ہوں کہ آپ کا کاروبار بھی دھوکا تھا اور آپ کا کردار بھی یہی ہے۔"

آج اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ خود فون بند نہیں کرے گی۔ وہ ہر بات کھول کر کرے گی تاکہ یہ قصہ ختم ہو۔

"پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہو اب میں دلائل کیوں دوں؟" اس کی بھی انا پر بن آئی۔

"اب آپ اس فیصلے کو مان لیں۔ اسی میں بہتری ہے۔" اس نے سختی سے کہا۔

"اچھی طرح سے سوچ لو۔"

"آپ آئندہ میرے رستے میں نہیں آئیں گے۔ آپ کبھی نہیں بھولیں گے کہ جن زمان برادر سے آپ کی خاندانی دشمنی ہے میں ان کی اولاد ہوں اور آپ یہ بھی یاد رکھیں گے کہ میری فیملی میرے لیے کتنی اہم ہے۔ اس فیملی کا حصہ آپ کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔" وہ جتنی سخت دل ہو سکتی تھی ہوئی۔

بدر کا دل بھی سالوں میں پتھر ہو چکا تھا وہ بھی کرچی کرچی ہوا۔

"تمہاری خوشی اس میں ہے تو یہی صحیح۔ زندگی کے کسی موڑ پر تم میرے خلوص کو پہچان جاؤ گی۔ تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔" بدر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

سومارہ رخصت ہو کر جا رہی تھی۔ تو صفیہ بیگم کا برا حال تھا۔ اولاد پر وقف کرنے والی زندگی اولاد کے ہی غموں میں گھٹتی رہتی ہے۔ تب عروش نے آ کر

چپکے سے تائی امی کو گلے لگالیا۔ گلے شکوے بھلانے کا اس سے بہتر موقع کون سا ہو سکتا تھا۔ صفیہ نے بھی عروش کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ حیدر زمان نے بھی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ عروش کو اپنے فیصلے پر کوئی دکھ نہیں تھا۔ وقت دل کو روند کر گزرنے لگا۔

☆☆☆

دنیا میں کچھ باشندے تھرل سیکر کہلاتے ہیں۔ وہ جان لیوا کھیل آزمانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اپنے ہی پیسے سے اپنی چتا کو آگ لگانے والی بات تھی۔ مگر اب اس پیسے سے خوشی حاصل کرنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تو سوچا یوں ہی سہی۔ وہ بھی ایک تھرل سیکر ہی تھا۔ چھوٹی عمر میں بڑے کاموں کا تھرل تھا۔ پڑھائی اور نوکری ایک ساتھ کرنا بھی جان لیوا جستجو ہی تھی۔ جب کسی اور کی محبت خود سے غافل کردے تو جان کی پروا ویسے ہی نہیں رہتی۔ وہ چلا گیا۔ کہیں مگرمچھوں میں سوئمنگ کی۔ کہیں آتش فشاں میں "والکینو بورڈنگ۔" کہیں خوف ناک صحرا میں موٹر بائیک چلائی۔ لیکن اس کے لیے جان پر تب بن آئی جب وہ بظاہر آسان دکھنے والی "کیو ڈائیونگ "DIVING CAVE" پر گیا۔ پانی میں چھپے غاروں میں تیرتے ہوئے وہ بھٹک گیا اور ایک غار میں پھنس گیا۔ پانی کی قبر بھی اس نے سوچی بھی نہ تھی۔ زندہ درگور صرف مٹی میں نہیں ہوا جاتا۔ جس گہری جگہ پر اس نے یہ کرنے کا ارادہ کیا وہاں تربیت یافتہ لوگوں کے علاوہ جانا منع تھا۔ وہاں ابھی سائنسدان ریسرچ کرنے جاتے تھے۔ لیکن یہ متوالہ بھی پہنچ گیا۔ اسے ڈھونڈنے والے ان غاروں کی بھول بھلیاں میں اس کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے اپنے آکسیجن ٹینک کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

صمد اعجاز آیا تھا۔

"بھائی کو ہمیشہ سے جان لیوا کھیل آزمانے کا شوق تھا۔ وہ کہتے تھے میں وہاں تب جاؤں گا جب پیچھے کوئی میری زندگی کے لیے دعا کر رہا ہو۔" صمد نے اس کے آتے ہی بتایا۔

کمرے میں حیدر زمان اور ارحم بھی موجود تھے جو خاموشی سے اس لیے سن رہے تھے کیونکہ یہی تہذیب تھی۔ عروش صمد کے موبائل پر بدر کو وہ جان نکالتے کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ صمد نے موبائل بند کر کے میز پر رکھا۔

"اب وہ وہاں کس کی دعاؤں کے بھروسے گئے میں نہیں جانتا۔" صمد کا اپنے بھائی سے اصولی اختلاف تھا کوئی دشمنی نہیں تھی۔

"یہ اس کی اپنی ذہنی خرافات ہیں۔ وہ میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔" حیدر زمان کو اب غصہ آیا۔

"صمد! آپ تو سمجھدار ہو۔ میں جتنی بھی کوشش کرلوں میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے نہ بددعا۔ پلیز سمجھو اور اس کو بھی سمجھا دو۔" عروش کو لگا وہ اس کی وکالت کرنے آیا ہے۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا۔ کل کیو ڈائیونگ میں وہ پانی سے بھرے غار میں پھنس گئے تھے۔" صمد نے کہہ کر موبائل پر ایک اور وڈیو لے لی۔ وڈیو بدر کے لیے ہونے والے ریسکیو آپریشن کی تھی۔ کیمرا انڈر واٹر ہیلمٹ پر لگا تھا۔ نیچے بھی چٹانیں اوپر بھی چٹانیں۔ بیچ میں مختصر سی اندھیری چار سو فٹ لمبی گزر گاہ۔ کوئی احمق ہی ان میں جائے گا۔

"ان کی آکسیجن ختم ہوگئی تھی۔" صمد نے بتایا۔

عروش کو احساس ہونے لگا۔ اس کا اور بدر کا بے نام رشتہ جس کی وہ ہمیشہ تردید کرتی تھی کتنا مضبوط تھا۔ وہ تمام جذبے جن سے وہ انکاری تھی اس کی آنکھوں سے امڈ امڈ کر بہنے لگے۔ حیدر زمان حیرت سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ وہ بھی بدر سے محبت کرتی ہے۔ صمد نے اسے رونے دیا۔

"ان کے ساتھی ڈرائیورز نے انہیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ جگہ ہی ایسی تھی..... " صمد

چاہتا تھا وہ خوب رو لے۔ اس لیے رلا رہا تھا۔
"بہت افسوس ہوا۔" حیدر زمان نے کہا۔
"پھر ایک ماہر تیراک کو بلایا گیا۔ اس نے ڈھونڈا۔ بھائی ایک اونچی ہموار چٹان پر بیٹھے تھے۔
صمد نے موبائل کی فوٹیج بند کر دی۔
"مطلب؟" ارحم نے آنکھیں دکھائیں۔
"مطلب انہیں بچا لیا گیا ہے۔" صمد نے موبائل جیب میں رکھا اور ایک فائل نکالی۔
"وہ ٹھیک ہے۔" اب کے عروش کو اپنی مسکراہٹ پر قابو نہیں تھا۔
حیدر زمان تعجب اور ارحم غصے سے عروش کو دیکھ رہا تھا۔ بدر اس کے لیے کیا ہے اب اس میں کوئی دو رائے نہیں تھیں۔
"یہ سب بتانے آپ یہاں آئے ہیں؟" ارحم اب شدید غصے میں تھا۔
"بھائی نے اپنا سارا کاروبار میرے حوالے کر دیا ہے۔ وہ تو اسے بند کر دینا چاہتے تھے۔ مگر اس میں ورکرز کا نقصان تھا۔ میں نے اب وہاں سسٹم بنا دیا ہے۔ اب یہ کاروبار ٹیکس چوری نہیں کرے گا۔" صمد نے بتایا۔
مگر عروش تو اپنے دونوں ہاتھ سینے سے لگائے خدا کا شکر کرنے میں مصروف تھی۔ وہ بچ گیا تھا۔
"بھائی کہہ رہے تھے وہ ایک بار کم عمری میں سب کما سکتے ہیں تو دوسری بار تجربے کے ساتھ اس سے زیادہ آسانی سے سب کما لیں گے۔ مسئلہ ہمارا تھا جنہیں ان کے پیسے کی عادت ہو گئی ہے۔"
"ہمیں کیوں بتا رہے ہو۔ ہمیں تو لوٹ کر کھا چکا ہے۔" حیدر زمان نے منہ پھیر کر کہا۔
"میں پرانے لوگوں کو بھی کمپنسیٹ (معاوضہ ادا) کر رہا ہوں۔ اس ہی لیے آیا ہوں۔ یہاں دستخط کر دیں۔" صمد نے فائل کھولی۔
"آپ کا وہ گھر جو نیلام ہو گیا تھا بدر بھائی جانے سے پہلے آپ کے لیے خرید گئے تھے۔" صمد نے عروش کی طرف فائل بڑھائی۔ جو اس سے پہلے ارحم نے اچک لی۔ اس فائل میں سے ایک کاغذ لہراتا ہوا زمین پر گرا۔ گلابی رنگ کا کاغذ۔
"تمہیں جیتے جاگتے وجود کی قدر نہیں اس لیے تمہیں بے جان پتھروں کا جھرمٹ دیے جا رہا ہوں۔ شاید یہ تبسم منزل تمہارے چہرے کی ہنسی لوٹا دے۔" اس نے کاغذ پر بدر کے الفاظ پڑھے۔
"پیپرز تو صحیح ہیں۔" ارحم نے حیدر کو بتایا۔
اگر وہ کورٹ کیس لڑتے تو بھی اتنا وقت تو لگ ہی سکتا تھا۔
عروش نے سائن تو کر دیے مگر اس کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔ صمد جانے کے لیے اٹھا۔
"اور ہاں آپ جانتی بھائی کی جان کیسے بچی؟" صمد نے پوچھا۔
عروش نے نفی میں سر ہلایا۔
"کوئی تو تھا جو ان کے لیے دعا کر رہا تھا۔" وہ اسے جتلا کر چلا گیا۔
عروش دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

تبسم منزل بدل گیا تھا۔ وہ گودام کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ اب اسے دوبارہ گھر بنا دیا گیا تھا۔ "تعبیر ہوم"
وہ بے گھر بچوں کا ہاسٹل تھا۔ اب بچوں کو ٹرک اڈوں اور درباروں پر سونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بچے دن بھر محنت سے جو پیسے کماتے تھے رات میں جب وہ چند گھڑی سونے کا جرم کرتے تو وہ چوری ہو جاتے تھے۔ اس لیے اکثر بچے اپنی ہی کلائیوں کو بلیڈ سے کاٹ دیتے تھے۔ بہتا خون دیکھ کر چوری کرنے والے ڈر جاتے اور پیسے محفوظ رہتے۔ اب ان بچوں کا اپنا ایک گھر تھا۔ تعبیر ہوم کی لوکیشن میڈیا کے سامنے نہیں لائی گئی تھی۔ ہانیہ پرانے دفتر ہوتی تھی۔ جبکہ حماد "تعبیر" ہوم سے کام کرتا تھا۔
عروش نے تبسم منزل کو حیدر زمان کو دینا چاہا۔ مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔
"یہ تمہارا ہے تم رکھو۔ ہماری زندگی اس سے

آگے نکل آئی ہے۔" حیدر زمان نے اعتراف کیا۔

وہ گھرانا کی جنگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے غم کو نئی نسل کے دل میں پیوست کر کے گھر کے بڑوں نے زیادتی کر دی تھی۔ نصف سال گزرا تھا اور لگ رہا تھا جیسے نصف صدی گزر گئی ہو۔ وہ "تعبیر ہوم" آئی اور اپنے امرود کے درخت دیکھنے لگی۔ اس پر اب پھل لگتے تھے۔

"تمہارا دل ہمیشہ سے صحیح جگہ پر تھا اب تم دنیا کے طریقے بھی سیکھ گئی ہو۔" حماد نے اچھل کر ایک امرود توڑا پھر شرٹ سے رگڑ کر کھانے لگا۔

"میں ذمہ داریاں لے رہی ہوں۔ فیصلے کر رہی ہوں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں بدر اعجاز بنتی جا رہی ہوں۔ میں سمجھنے لگی ہوں کہ اس نے جو کیا وہ کیوں کیا۔ اس لمبی زندگی کے لیے اصول چھوڑنے پڑ جاتے ہیں۔" عروش نے اس آنگن میں بچوں کو کھیلتے دیکھا۔

"وقت اپنے راز وقت آنے پر ہی کھولتا ہے۔ آؤ تمہیں بچوں سے ملواؤں۔ ویسے اسکول کو بھی ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔ وکالت سے دل بھر جائے تو آ جانا۔" حماد اسے لے کر اندرونی کمروں کی طرف جانے لگا۔

اس بات پر عروش کا تبسم لوٹ آیا۔

☆☆☆

"تو آدھا کام کر کے کیسے آ گئی؟ اتنی محنت لگی ہے اس کام پر۔ کتنے بندوں کو پیسہ کھلایا ہے تو جانتی ہے نا۔" ارسلان اس کے سر کے بال نوچ رہا تھا۔

"میں نے اس کام کی حامی اس لیے بھری تھی کیونکہ تو نے کہا تھا اس کے بعد شادی کر لیں گے۔ اب تو یہ نئی بات لے آیا ہے کہ فوٹو وڈیو بھی بنواؤں۔ پھر کیا تو بھول پائے گا؟ یا مجھے بھولنے دے گا؟" اس نے بھی گریبان پکڑ کر جواب مانگا۔

"شادی شادی شادی۔ اماں کا دماغ خراب تھا جو تجھے کہہ دیا۔ تیری جیسی دوسریوں کو اماں نے کہاں کام لگایا جانتی ہے نا؟"

ارسلان کا یہی احسان ختم نہیں ہوتا تھا کہ اس کو کام دے رہا ہے۔

اس نے بھی گریبان چھوڑ دیا۔ وہ جان گئی تھی کہ ارسلان اب اسے کبھی نہیں بسائے گا۔ وہ اسے صرف کیش کرے گا۔ ارسلان نے اس کے بدلتے رنگ دیکھے تو پرانی جون میں آ گیا۔

"یہ کام بہت اوپر سے آیا ہے۔ بڑی بڑی اداکارائیں تیار تھیں۔ لیکن ان کو کوئی انجان معصوم لڑکی چاہیے تھی۔ جو کبھی کے مالک نے میرے ساتھ دست درازی کی تو دنیا آرام سے مان جائے۔ بہت پیسہ ملتا ہے اس کا۔ ہم دونوں سکون سے سالوں کھائیں گے۔ یہ ناصر صاحب ایک بڑے کرپشن کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔ باقی بک گئے یہ قابو نہیں آ رہا۔ اس کو قابل اعتراض تصویریں وائرل کر کے پکڑیں گے۔" ارسلان نے اس بار پہلے سے زیادہ تفصیل سنائی۔ کیونکہ اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

"اس کے بیوی بچے ہیں۔ نیک انسان ہے۔ میں نے اتنے طریقے آزمائے وہ ایک دن دیکھ لیتا ہے تو اگلے دس دن اس جگہ سے بھی نہیں گزرتا جہاں میں ہوں۔" اس نے اپنی مشکل دکھائی۔

"یہ نہیں ہوگا تو پھر اس کو مروا دیں گے۔ پھر اس کے بیوی بچے رو رو مریں گے۔" ارسلان نے سمجھایا۔

"میرے ہاتھ میں کچھ نہیں وہ مضبوط دل گردے کا آدمی ہے مجھے ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔" اس نے ایسے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"مجھے لگ رہا تھا یہ لے۔ تین گولیاں پیس کر دے دینا۔" ارسلان نے ایک نشہ آور دوائی اس کو دی اور سارا طریقہ سمجھا دیا۔

"آج رات یہ کام ہو جانا چاہیے۔ تیری باجی ابھی ہسپتال ہے۔ ان کی اماں بھی وہیں ہیں۔ بچے دونوں چھوٹے ہیں۔ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔" ارسلان نے اب اس کی ساری راہیں بند کر دیں۔

وہ مٹھی میں گولیاں تھامے بیٹھی تھی۔ زہر ہوتا تو خود نگل لیتی۔ وہ ان کا نمک کھاتی رہی تھی۔ بھیڑیوں میں ایک انسان دیکھا تھا۔ وہ یہ سب کیسے کرسکتی تھی۔

"نہیں ارسلان، مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں اس خاندان کو برباد نہیں کرسکتی۔ میں ایک اچھے انسان کو ایمانداری کی سزا نہیں دے سکتی۔ میں نہیں کروں گی۔" اس نے گولیاں پھینکیں اور کھڑی ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ پڑا۔

"سالی! تجھ پر یہ جو شرافت کے دورے پڑتے ہیں مجھے ان سے بھی ڈر تھا۔" ارسلان کو مارنے کے بعد خیال آیا کہ اس کی خوب صورتی آج کی رات ضروری تھی۔

"میں نے پیسہ پکڑا ہوا ہے کام نہ ہوا تو وہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر سگنل پر بھیک مانگوں گا ساری عمر۔" اب وہ بے دریغ اس کو مار کر لہولہان کررہا تھا۔ یہ کام اس نے بعد میں کرنا ہی تھا تاکہ الزام میں وزن پڑے۔

"میں نے تیرے سے کبھی دھوکا نہیں کیا۔ تیرا اچھا برا سب قبول کیا۔ تیری بچپن کی ساتھی ہوں۔ مان لے بات۔" وہ چلانے کے دوران التجا کررہی تھی۔ ارسلان نہیں مانا۔ شبیر کونے میں کھڑا لرز رہا تھا۔

مردوں کو سجانے کا بھی رواج ہے۔ جب وہ درد کے مارے نڈھال ہوکر مان گئی تو ارسلان نے اس کا منہ دھلوایا۔ روئی سے اس کے زخم صاف کیے۔

"وہ ویسے بھی دوائی کے اثر میں ہوگا۔ اسے زخموں کا احساس نہیں ہوگا۔ بعد میں پولیس سے کہنا ناصر نے مارا ہے......" وہ اس کو میک اپ کررہا تھا جیسے نعش کو کیا جاتا ہے۔ "پولیس کو وہی بیان دینا جو میں نے کہا ہے۔ میں بچالوں گا۔ ورنہ ساری عمر جیل میں سڑواؤں گا۔" ارسلان اسے سمجھا کر خود ناصر کے گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ شبیر نے نہ جانے کیسے اس کے ہاتھوں میں ایک پرچی تھمادی تھی۔ جب وہ کافی میں دوائی گھول رہی تھی تو اس نے پرچی کھول کر پڑھی۔ اس پر "تعبیر ہوم" کا ایڈریس تھا۔

☆☆☆

وہاں سے بھاگنا آسان نہیں تھا۔ ارسلان نے بندے چھوڑ رکھے تھے۔ جو گاڑی اسپتال کھانا لے کر جارہی تھی وہ اس کی ڈگی میں چھپ کر وہاں سے نکلی تھی۔ ڈرائیور نے جب ڈگی کھولی اور اس کو دیکھا تو ہنگامہ ہوگیا۔ اس لیے وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ وہ کس رخ جارہی تھی اسے معلوم نہ تھا۔ اس کا جسم درد سے چور تھا۔ زخم دوبارہ رسنے لگے تھے۔ وہ راستہ پوچھتی۔ مگر اس کو سمجھانے والے کی آواز سمجھ میں نہ آتی۔ ایک رکشے والا اسے اس علاقے میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے خود اسے "تعبیر ہوم" سے دور روکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ آگے کیا ہے؟ مگر اسے وہاں پہنچنا تھا۔ دروازہ کھٹکانے میں اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اور وہ بیہوش ہوگئی۔

وہ ہوش میں آئی تو احساس ہوا کہ یہ ایک بے سہاروں کو پناہ دینے والا ادارہ ہے۔ بیس سال کی عمر میں بھی وہ بے سہارا تھی۔ مستقبل تاریک تھا ماضی ذلیل۔ وہ اس سے اس کا نام پوچھ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کررودی۔ اب وہ سارے اس سے پوچھ رہے تھے وہ یہاں کیسے آئی۔ کس نے مارا۔ وہ تو ایک نئی شروعات کے لیے آئی تھی۔ ماضی کو کیسے گھسیٹ لاتی۔ اس نے منہ کھول کر حلق پر اشارہ کیا۔

"آں آں۔" اور اشاروں سے سمجھایا کہ وہ بول نہیں سکتی۔

☆☆☆

عروش نے گاڑی میں چابی گھمائی انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ چابی اور انجن کا تال میل ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی وہ گھر کے پورچ میں ہی تھی۔ اس نے کسی دوسرے کو آواز لگانے کے بجائے خود بونٹ کھولا۔ وہ خاموش ہوگئی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

"دکھاؤ میں کردیتا ہوں۔" ارحم اندر سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مدد کرنے باہر آگیا۔

"نہیں بس ہوگیا۔" عروش جھٹک مار کر

اسپارک پلگ سے راکھ اتار رہی تھی۔ یہ مسئلہ گاڑی میں پہلے بھی آچکا تھا۔

"میں تمہیں اسکول ڈراپ کر دیتا ہوں۔ واپسی پہ پلگ چینج کروا دوں گا۔" ارحم نے ایک اور پیشکش کی۔

"وہاں پاس ہی مکینک ہے میں کروالوں گی۔" اس نے بونٹ بند کر کے ہاتھ جھاڑے۔

"اب میں تمہیں برداشت بھی نہیں ہو رہا؟ شادی کے بعد یونہی رہو گی؟" ارحم نے سخت آواز میں کہا۔

"بات برداشت تک پہنچ گئی ہے آپ کو لگتا ہے اب بھی ہماری شادی ہونی چاہیے؟" عروش نے پوچھا۔

"ہماری شادی تو ہمیشہ سے طے تھی۔ اب تو اور کوئی وجہ بھی نہیں رہی انکار کی۔" ارحم نے ایسے جتایا جیسے وہ اب اس کے رحم و کرم پر ہے۔

"شادی اور نکاح جیسے مقدس رشتے کو صرف اس لیے قائم نہیں ہونا چاہیے کہ زندگی میں کوئی اور آپشن نہیں رہا۔ آپ کو ایسا شریک حیات ملنا چاہیے جس کو آپ کی قربت پر فخر ہو۔ نہ کہ مجھ جیسی جو اس لیے آپ سے شادی کرے کیونکہ اس کی دوسری راہیں بند ہوئی ہیں۔" اس نے اتنے سادے لہجے میں کہا کہ ارحم کی ساری سمجھ بوجھ اچھی طرح کھل گئی۔

"تم ایک سراب کا پیچھا کر رہی ہو۔ بدر تمہیں چھوڑ کر جا چکا ہے۔"

"اس نے یہی غلطی کر دی۔ میری بات مان لی۔ دھونس جماتا رہتا تو میری نفرت قائم رہتی۔"

عروش ارحم کو سنا کر گاڑی میں بیٹھی۔ اس بار گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ یہ وہ لڑکی تو نہیں تھی جسے ہر قدم پر ارحم کی ضرورت پڑتی تھی۔ اندر کھڑے حیدر زمان نے بھی سنا۔ وہ ایک بار پھر غلط ثابت ہو رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے عروش کے دل میں بدر کا وجود زندگی بھر ایک سنگ ریزہ بن کر انگار رہنے والا تھا۔

☆☆☆

نئی لڑکی کو نجمہ نے حسینہ نام دیا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتی تھی ورنہ لکھ کر اپنی کہانی سنا دیتی۔ حماد نے اس کی چھان بین پہلے دن سے شروع کروا دی تھی۔ کئی خبریں آرہی تھیں۔ مگر سچ کیا تھا معلوم نہیں۔ حسینہ نے ایک دن بھی بستر پر آرام نہیں کیا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی کمر پر زخم اتنے تھے کہ وہ سیدھا لیٹ نہیں سکتی تھی۔ وہ کمر پکڑے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلتی رہتی۔ کسی بچے کو کھیل میں مدد چاہیے ہوتی کر دیتی۔ کھانا پکانے والی کو سبزی بنا دیتی۔ باہر لان میں پانی لگا دیتی۔ اس کے ٹھیک ہونے تک اس کی باقاعدہ ڈیوٹی لگ چکی تھی۔ ایک بچہ جگنو بھکاریوں کے پاس سے آیا تھا۔ اس کو سڑک پر کئی طرح کے مرض ہو گئے تھے۔ اب "تعبیر ہوم" میں اس کا علاج چل رہا تھا۔ مگر وہ دن رات بے چین رہتا تھا۔ حسینہ اسے سینے سے لگائے پھرتی۔

حماد نے اس دن مالی اور بچوں کے ساتھ مل کر درختوں کے پھل توڑے تھے۔ حسینہ بھی قریب ہی جگنو کو ہاتھ پکڑ کر چلا رہی تھی۔

"پھل جب پک جاتا ہے تو ڈنڈی سے آرام سے اتر آتا ہے۔ اگر زور لگا کر اتارنا پڑے مطلب ابھی اور پکے گا۔" حماد بچوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی مختی تھی۔ اس لیے مخالفت کے باوجود اس کو اس نے پناہ دے رکھی تھی۔

"میں تو پکڑ کر پہچان لیتا ہوں کون سا پک گیا ہے۔" درخت پر چڑھے لڑکے نے بڑک ماری۔ اس ہی اثنا میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام زمین پر آ گرا۔ سارے دیکھنے والے دم بخود تھے۔ لیکن حسینہ نے ایک لمبی چیخ ماری۔ گرنے والا لڑکا ایسی چوٹوں کا عادی تھا۔ گھٹنا سہلا کر پھر اٹھ جاتا۔ سب کی توجہ حسینہ پر ہو گئی۔ حسینہ شرمندہ سی ہو کر جگنو کو اٹھا کر اندر چلی گی۔

"کیا گونگے چلا سکتے ہیں؟" گرنے والے لڑکے نے اٹھنے کے بعد پہلا سوال یہی کیا۔

☆☆☆

"چاندنی.....۔" حماد نے جان کر پکارا۔ حسینہ کپڑے استری کر رہی تھی۔ کرتی رہی۔

"حسینہ"...... حماد نے دوبارہ پکارا۔ اب حسینہ متوجہ ہوئی۔

"پھل لو۔" حماد نے تازہ پھلوں کی ٹوکری اس کے سامنے کی۔

حسینہ نے بائیں ہاتھ سے ایک امرود اٹھایا۔ اس کی خوشبو سونگھی۔ پھر شکریہ کے انداز میں سر جھکایا۔ اور سائیڈ پر ہوگئی۔

حماد ٹوکری لے کر چلا گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ حسینہ لفٹ ہینڈڈ ہے۔

☆☆☆

حیدر زمان کو ڈر تھا کہ ارحم اور عروش کا رشتہ ختم ہونے سے پچھلے رشتے بھی ختم نہ ہو جائیں۔ لیکن آمنہ بیگم کا دل مطمئن تھا۔ اچھا ہی ہوا۔ ارحم کا دل میلا تھا۔ ایسے میں وہ ساری زندگی نہ جانے عروش کے ساتھ کیسا سلوک رکھتا۔ اب جب بچیوں کی شادیاں نہیں ہو رہی تھیں تو آمنہ بیگم نے مشورہ دیا کہ کچھ زیور بیچ کر کاروبار میں لگا لیا جائے۔ ویسے تو "تبسم منزل" ابھی بھی عروش کے نام تھا۔ لیکن جب وہ اتنے اچھے کام کے لیے استعمال ہو رہا تھا تو اس کو بیچنے پر دل آمادہ نہیں ہوا۔ اس روز آمنہ بیگم جیولر سے زیور کا ریٹ لگوا آئی تھیں۔ حیدر زمان تھک کر آفس سے آتے تھے۔ اس روز تو ان کے کندھے بالکل ہی جھکے ہوئے تھے۔ آمنہ نے پانی کا گلاس پکڑایا۔ وہ خاموشی سے پی گئے۔ پھر آمنہ ساتھ بیٹھ کر کاغذ دکھانے لگیں۔

"سونے کی قیمت بچ میں ہواؤں سے باتیں کر رہی ہے۔ زمین کے بھاؤ کا ہو گیا ہے۔ دیکھو میں نے سب کا ریٹ لگوایا ہے۔ اتنی ہی زکوٰۃ دینی پڑتی ہے۔ اچھا ہے کچھ بیچ دیں گے تو بچت ہی ہوگی۔" وہ ایک ایک کر کے بتانے لگیں کہ کتنے دام لگے۔ حیدر زمان کے کندھے جھکے ہی رہے۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے وہ کام ہو گیا ہے۔ سامان پہلے پہنچا دیا گیا ہے اور ہمیں پیمنٹ کے لیے مہلت بھی دے دی ہے۔ اب ہم اپنے منافع میں سے پیمنٹ کر دیں گے۔" حیدر زمان نے خوشی کی خبر انتہائی بھونڈے انداز میں سنائی۔

"یہ کیسے ہوا؟" یقیناً کوئی جھول تھا۔

"سامان سپلائی کرنے والے سے بدر نے سفارش کر دی تھی۔ اتنے سالوں بزنس میں رہنے کے بعد اس نے صرف دشمن نہیں بنائے کئی دوست بھی بنائے ہیں۔ اس کے کہنے پر وہ ہمیں فیور دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔" حیدر زمان نے سمجھایا۔

آمنہ بیگم چپ کی چپ رہ گئیں۔ وہ بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ یہ اچھی خبر ہے کہ بری۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد لائٹ گئی تو اسے یاد آیا کہ یو۔پی۔ایس والا بلب خراب تھا۔ اسے اندھیرے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر اگلا پورا گھنٹہ ضائع ہونے کی کوفت میں وہ ٹھوکریں مارتا ٹہلنے لگا۔ حسینہ تیزی سے ایک کمرے سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ وہ بھی رک گیا۔ ایسے لمحے بار بار آتے تھے جب حسینہ اس کے سامنے آ کر انگلی اٹھا کر گول گھمانے لگتی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ بغیر لفظوں کے بات کیسے بتانی ہے۔ حماد بھی چونکتا ہو کر دیکھنے لگتا۔ اس کی بولتی آنکھیں۔ بار بار کھل کر بند ہوتے لب۔ سمجھنا اس کے لیے بھی مشکل تھا۔

حسینہ نے ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ اور کچن میں چلی گئی۔ پھر دو منٹ بعد ایک نیا بلب لے آئی۔ اور اشاروں سے بتانے لگی کہ پہلے کا پڑا تھا۔ حماد کو بلب بدلنے کی کوئی عجلت نہیں تھی۔ مگر اب وہ اتنی پھرتی سے لائی تھی تو اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے موبائل لائٹ جلا کر اس کو پکڑائی اور خود کرسی پر چڑھ کر بلب بدلنے لگا۔

"یہ پکڑنا۔" اس نے ناکارہ بلب پیچھے ہاتھ کر کے چھوڑا۔ بلب سیدھا زمین پر گرا اور کرچی کرچی

ہو گیا۔ حسینہ آہ کر کے پیچھے ہوئی۔
"کچھ تو نہیں۔" وہ بلب بدل کر اتر گیا۔
حسینہ نے لائٹ آن کر دی۔ روشنی میں نظر آیا کہ اس کے پیر کے انگوٹھے پر ہلکا سا زخم ہے۔ وہ زخم کی پروا کیے بنا ایک کاغذ پر کرچیاں سمیٹنے لگی۔ حماد اسے دیکھتا رہا۔ وہ بول سکتا تھا مگر اس کے سامنے گونگا ہو جاتا تھا۔ حسینہ موٹی کرچیاں سمیٹ کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ آئی۔ اپنے پاؤں پر بینڈ ایج لگا کر وہ ہاتھ میں آٹے کا پیڑا لے آئی تھی۔ اس نے کرچیوں والی جگہ پر آٹے کا پیڑا پھیر کر ان دیکھی ننھی کرچیاں بھی اٹھالیں اور چلی گئی۔ وہ اپنے کام میں واقع اچھی تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں ہر جاب میں انسان دفتر سے سامان گھر لے کر جاتا ہے۔ ٹیچنگ وہ واحد پیشہ ہے جہاں معاملہ الٹا ہے۔ وہ بھی ایک بک شاپ میں آرٹ کا سامان لے رہی تھی۔ جب بک شاپ کے باہر اس کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ کالی جینز، سفید شرٹ اور کالی پی کیپ۔ یہ خواب نہیں ہو سکتا تھا۔
"یاسر۔" اس نے بے اختیار پکارا۔ لیکن وہ جو بھی تھا جانے لگا۔ عروش بھی سب چھوڑ چھاڑ کر اس کے پیچھے دوڑی۔ باہر نکل کر اس نے اور غور سے دیکھا وہ یاسر ہی تھا۔
"یاسر بات سنو۔" اتنے عرصے بعد اس کو یوں خیریت سے دیکھ کر وہ بہت خوش تھی۔ مگر یاسر رک نہیں رہا تھا۔ وہ زور سے چلائی اب کی بار اسے یقین تھا کہ یاسر نے سنا ہے۔ مگر وہ آگے چلتا رہا۔ عروش کے اور اس کے بیچ بہت سے لوگ تھے۔ عروش کو لگا یاسر جان کر انجان بن رہا ہے تو اس میں کوئی مصلحت ہو گی۔ شاید اب بھی اس کو کوئی خطرہ ہو۔ لیکن پہلے بھی کوئی خطرہ عروش کو یاسر سے دور رہنے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ رش چیرتی یاسر کے پیچھے جانے لگی۔ یاسر کی رفتار بھی مناسب تھی۔
تھوڑی ہی دور ایک کھلا پارکنگ ایریا آیا۔ اب درمیان کا رش چھٹ چکا تھا۔ پارکنگ میں ایک کالا اور لال فوڈ ٹرک تھا۔ اس کے ایک طرف بڑی سی کھڑکی تھی اور کھڑکی کا دروازہ ایک کاؤنٹر تھا۔ یاسر اس ٹرک میں سوار ہو گیا۔ اور چند منٹ بعد اس کھڑکی میں نمودار ہوا۔ سامنے لگے رش سے اس نے آرڈر لینا شروع کر دیے۔
عروش کے آنسو خوشی سے بھیگ گئے۔ تمیز دار سلجھا ہوا یاسر ایمانداری اور محنت سے کما رہا تھا۔ وہ قریب گئی اور منظر آنکھوں میں بھرنے لگی۔ یاسر کام میں مگن تھا۔ عروش نے باہر لگے اتا کین مینیو کو دیکھا۔ پھر ٹرک کا چکر کاٹتے ہوئے کسٹمرز کو دیکھنے لگی۔ وہاں ہر طرف ہی خوشی کا ماحول تھا۔ اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ اسی طرح سب دیکھتے وہ ٹرک کی دوسری طرف گئی تو آنکھوں کے ساتھ دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔ دوسری طرف کی کھڑکی میں بدر موجود تھا۔ وہ سفید ٹوپی پہنے مہارت سے کھانا بنا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو بچوں سے کھیلتے ہوئے آتی تھی۔ وہ ٹھیک تھا، وہ خوش تھا۔ وہ ایک آواز دور تھا۔ محبت سے رنگا دل اکسانے لگا کہ دوڑ کر اس کے پاس چلی جائے۔ محبت کے زخم گہرے ہو گئے تھے مگر کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہ اب بھی وہی بدر تھا جس کو اپنانے کے لیے اس کو اپنے گھر والے چھوڑنے پڑتے۔ وہ اب بھی وہی عروش تھی جو دل مار چکی تھی۔ وہ پیچھے ہو گئی۔ منہ موڑ کر اس نے آنسو بہائے پھر مڑ کر دوبارہ اس کو دیکھا۔ پھر واپسی کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہ راستہ بند ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہی ارمان کچلتی چلی گئی۔
ٹرک میں چھین کر اندر پاستا اور ساس مکس کرتے ہوئے بدر نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ وہ واپس جا رہی ہے۔ بدر کی سانسیں کھنچ گئیں۔ وہ جو اپنی خوش قسمتی کے لیے اتنی مشہور تھی کہ پہاڑ کٹ کر اس کو راستہ دیتے تھے۔ اس کا بدر کی بدقسمتی سے پالا پڑ گیا تھا۔
"تم اس کو کیوں لے کر آئے تھے؟" اس نے

یاسر کو کہا۔
"میں سمجھا وہ مان جائیں گی۔" یاسر نے شرمندگی سے سر نیچے کرلیا۔
"مان سکتی ہے منا نہیں سکتی۔" بدر دل کڑا کر کے دوبارہ کھانا پکانے لگا۔
یہ سادہ سا فوڈ ٹرک اس نے اس مختصر سرمایے سے شروع کیا تھا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ صحیح طریقے سے کمایا گیا ہے۔ اس نئے چیلنج نے بدر کی زندگی میں نئی جستجو لوٹا دی تھی۔

☆☆☆

"یہ وہی لڑکی ہے جس کے بارے میں پولیس سے رپورٹس ملی ہیں۔ وہی نین نقشہ اور ویسے ہی بال۔" ہانیہ "تعبیر ہوم" آئی تھی۔ پولیس نے تین دن پہلے ہی شک ظاہر کر دیا تھا مگر حماد کوئی ایکشن نہیں لے رہا تھا۔
"نہیں وہ لڑکی اتنی معصوم نہیں ہو سکتی۔ پولیس کے مطابق وہ بچپن سے فراڈ ہے۔" حماد کو پورا یقین تھا۔
"یہ لفٹ ہینڈڈ ہے؟ قد بھی پانچ فٹ تین انچ ہے۔ باقی تم پولیس کو بلا لو وہ خود ہی تفتیش کر لیں گے۔" ہانیہ نے سمجھایا۔
"میں ایک بے قصور کو پولیس حوالے نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بری حالت میں یہاں آئی تھی۔" حماد کچھ کاغذ اٹھانے کے بہانے نظریں چرانے لگا۔
"یہ ادارہ بچوں کے لیے ہے۔"
"وہ یہاں کا اہم حصہ بن چکی ہے۔"
"ایک بار اس کی شناخت ہو جائے میں باقاعدہ تنخواہ دے کر رکھ لوں گی۔"
"اس کی یہی شناخت ہے کہ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔"
"لیکن وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔" ہانیہ نے اب مالکانہ حقوق سے کہا۔
"پھر میں اسے اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ میری امی اسے پڑھنا لکھنا سکھا دیں گی۔ وہ بتا سکے گی کہ کہاں سے آئی ہے۔" حماد نے جاہلانہ ضد کی۔ ہانیہ اس کی صورت تکتی رہ گئی۔
"تم ہوش میں تو ہو؟"
"میں اسے اپناؤں گا۔ اس کے ہر دکھ کا مداوا کروں گا۔ اس پر اتنا اعتبار کروں گا کہ وہ پچھلے سارے زخم بھول جائے گی۔ اس کا خوشیوں پر حق ہے جو میں اسے دلاؤں گا۔" اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور وہ سب کہہ دیا جو وہ محسوس کر رہا تھا۔
ہانیہ اس کے منہ سے یہ لفظ سننے کو ترس گئی تھی۔ اب نکلے تھے تو کسی اور کے لیے۔ وہ خاموش کھڑی اس کو حال بے حال دیکھتی رہی۔
"تمہارا ذاتی معاملہ ہے میں بول نہیں سکتی۔ مگر اب مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی پہچان یہی تھی کہ وہ صرف نگاہوں سے ہی مردوں کو گرویدہ بنا لیتی ہے۔" ہانیہ نے اس کے سارے ارمان نچوڑ دیے۔

☆☆☆

"سومارہ کے مایوں کے اگلے روز وہ دفتر بھی آیا تھا۔" حیدر زمان عروش کو بتا رہے تھے۔
عروش کو یقین نہیں آیا۔
"وہ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"
"آپ نے کیا کہا؟" یہ سوال آمنہ بیگم نے پوچھا۔
"وہی جو سالوں سے کہتا آیا ہوں کہ میرے پاس اس کے لیے معافی بھی نہیں ہے۔"
"پھر؟" عروش نے پوچھا۔
"پھر اس نے بھی بہت کچھ کہا۔ باتیں اچھی کرتا ہے۔ مجھے لگنے لگا کہ وہ پہلے بھی اتنا غلط نہیں تھا۔" حیدر زمان طنزیہ ہنسے۔
"شاید وہ اتنا غلط نہیں تھا۔ جتنا اسے بنا دیا گیا۔" آمنہ بیگم نے بھی جتایا۔
"وہ سچ میں سب کچھ چھوڑ چکا ہے۔ نیا کام شروع کیا ہے۔ اپنے ہی گھر کو کرائے پر دے کر خود ایکسی میں رہ رہا ہے۔ لیکن مجھ سے اب اس پر اعتبار

نہیں ہوتا۔" حیدر زمان نے بے بسی ظاہر کی۔
"آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں۔ میں اب آپ کو دکھ نہیں دوں گی۔" عروش نے اتنی بار دل پر مصلحت کا خنجر چلایا تھا کہ حساب بھول گیا تھا۔
حیدر زمان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا۔
"مجھے اس پر نہ سہی تم پر بھروسا ہے۔ تم کتنی زندگیاں بدل چکی ہو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" انہوں نے پیار سے کہا۔
"تم اپنے دل سے اپنے لیے فیصلہ کرو۔ ہم دونوں تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔" آمنہ بیگم نے کہا۔
عروش نے بے یقینی سے نظریں اٹھائیں۔ اب فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنے اردگرد وہ جو محسوس کر رہی تھی وہ محبت تھی یا شکاری کا جال۔

☆☆☆

آج "تعبیر ہوم" میں سناٹا تھا۔ زیادہ تر بچے اسکول میں ہورہے بون فائر میں تھے۔ جو وہاں تھے وہ گھر کے دوسری طرف تھے۔ آفس والے حصے میں حماد تھا۔ وہ بھی لائٹ آف کر کے نکل گیا۔ گیٹ پر گیا تو گارڈ روک کر کوئی مسئلہ بتانے لگا۔ اس میں مزید وقت لگ گیا۔ وہ باہر نکلا تو کچھ یاد آ گیا۔ وہ وہیں سے دفتر کی طرف پلٹا۔
"اللہ اللہ اللہ ہو۔ لاالٰہ الا ہو۔" کمرے سے لوری کی آواز آ رہی تھی۔ حماد پہچان نہیں سکا کس کی آواز ہے۔
"آمنہ بی بی کے گلشن میں آئی ہے تازہ بہار۔
پڑھتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم آج درودیوار۔"
آواز اچھی تھی۔ وہ بڑھتا گیا۔ کمرے میں وہ جگنو کو سینے سے لگا کر ٹہلتے ہوئے یہی دو مصرے دہرا رہی تھی۔ پھر اس نے جگنو کو بستر پر لیٹا کر اوپر چادر دے دی۔
"سوہنی۔" حماد نے غضب ناک ہو کر آواز دی۔ وہ ڈر کر سیدھی ہوئی۔
"ناصر محمود کے گھر سے کچھ دن پہلے لاپتا ہوئی تھیں۔ انہوں نے تمہاری گمشدگی کی رپورٹ لکھائی ہے۔" حماد نے اندر آتے ہوئے ایک کرسی کو ٹھوکر ماری..... وہ پیچھے سرکی۔ "تفتیش میں معلوم ہوا تم ایمان کے نام سے پہلے بھی لوگوں کو بے وقوف بنا چکی ہو۔ جیسے مجھے بے وقوف بنا دیا ہے۔" حماد نے بستر کی چادر مٹھی میں پکڑی پھر چادر کھینچ کر اتار دی۔
"تہمینہ نے بہت سال پہلے اخبار کے لیے ایک آرٹیکل لکھا تھا اس میں ایک سگنل پر لوٹنے والی لڑکی چاندنی کا بھی ذکر تھا۔ وہ تو پہلے دن سے تمہاری شکل ملا رہی تھی پتھر تو میری عقل پر تھے۔" یہ کہہ کر حماد بالکل اس کے قریب پہنچا اور اس کو کندھوں سے پکڑ لیا۔
"بولو، تم بول سکتی ہو تو سچ بولو کیا نام ہے تمہارا؟ کیوں آئی ہو؟ یہاں کس کو بہکانا ہے؟" حماد نے اسے جھٹکے سے چھوڑا۔
"میں خود بھٹک گئی تھی۔ سوچا تھا توبہ کر لوں۔ مجھ جیسی لڑکی اور سیدھا راستہ یہ بھٹکنا ہی تو ہے۔" پھر اس نے اپنی ساری کہانی حماد کو سنا دی۔ اپنے ساتھیوں کے نام ان کا ٹھکانہ۔ وہ فراڈ بھی بتائے جن کی پولیس کو بھنک بھی نہ تھی۔ سب بتایا۔ نہیں بتایا تو اپنا نام نہیں بتایا۔

☆☆☆

"وہ لوگ ٹھکانا بدل چکے تھے پھر بھی سب پکڑے گئے ہیں۔ اس ارسلان کے پاس سے شبیر اور دوسرے بچے بھی ملے ہیں۔" حماد نے پولیس کی کارروائی کا خلاصہ سنایا۔
آج وہ پرانے دفتر آیا ہوا تھا۔ یہ خبر "تعبیر" کے اعتبار سے نہایت بڑی تھی۔ سارے نئے پرانے ساتھیوں کو اطلاع مل گئی تھی۔
"بے شک حسینہ اس سب میں خود ایک وکٹم ہے مگر وہ ملزم بھی ہے۔ "تعبیر" کو ان سب جھمیلوں سے دور رکھنا چاہیے۔ اس کا وہاں ہونا دوسری لڑکیوں

اور بچوں کے لیے خطرناک ہے۔" اس بار تہمینہ نے تسلی سے حماد کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ بچوں کے ادارے میں ایک عادی مجرمہ کو نہیں رکھ سکتے تھے۔

"اگر سب کا یہی فیصلہ ہے تو ٹھیک ہے۔ میں کیوں اعتراض کروں گا۔" حماد نے سیدھا کھڑے ہو کر کہا۔

"میں اس کا کوئی اور انتظام کردوں گا۔"

ہانیہ پہلے ہی جانتی تھی وہ کیا انتظام کرنا چاہتا ہے۔

"اس پر بھی کئی کیس ہیں۔ وعدہ معاف گواہ بن کر بھی اسے بری ہونے کے لیے عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑیں گے۔ پھر بھی اگر تم یہ کرنا چاہتے ہو تو "تعبیر" کو چھوڑ دو۔" ہانیہ بھی سنگدل ہو گئی۔

سارے ایک دم سے بولنے لگے۔ کوئی حماد کے حق میں تھا کوئی ہانیہ کے۔ کھل کر الزام لگ رہے تھے۔ بدر جو خبریں سن کر ملنے آیا تھا۔ اسے باہر سے ہی سارا معاملہ سنائی دے گیا۔

"میں اس لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" بدر نے اندر آتے ہی اعلان کیا۔

"اس میں مردوں کو کیا نظر آتا ہے پہلے ایک مرا جا رہا تھا کہاں دوسرا آ گیا۔" ہانیہ حماد کے معاملے میں مطلبی ہو گئی تھی۔

"جب میں "تعبیر" کے لیے ایک سکسس اسٹوری ہو سکتا ہوں تو وہ کیوں نہیں؟ میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں نہ اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ لیکن حالات سے زخمی ہونا مجھے اچھے سے معلوم ہے۔ میں اسے تحفظ دوں گا۔" بدر نے پل بھر میں فیصلہ کر لیا تھا۔

سب نے چونک کر بدر کو دیکھا۔ اور پھر خاموشی سے سب نے گردن موڑ کر پیچھے لنچ روم سے نمودار ہوتی عروش کو دیکھا۔ وہ شبیر کا سن کر صبح سے ہی آئی بیٹھی تھی۔

عروش ایسے غصے سے بدر کو دیکھ رہی تھی جیسے اس نے اس کا حق کسی اور کو دے دیا ہو۔ بدر نے بھی گھبرا کر دونوں ہاتھ اٹھائے۔ جیسے اپنی صفائی دینے لگا ہو۔ مگر عروش شدید دکھی تھی۔ وہ اپنے انگوٹھے میں موجود سبز انگوٹھی زور سے گھما کر اتار رہی تھی۔ اس نے انگوٹھی اتار کر غصے سے بدر کی طرف پھینکی۔ بدر باہر کے دروازے میں کھڑا تھا۔ عروش بدر کو اپنی ناتواں ٹھی سے پرے کر کے چہرہ چھپاتی باہر کو دوڑی۔

وہ امرود کے درختوں کے ساتھ لگی رو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بدر کا ایک پلان تھا۔ اس میں ناکامی ہوئی تو اس نے ایک نیا پلان بنا لیا۔

"جب اپنی فیلنگز چھپا نہیں سکتیں تو کوشش کیوں کر رہی ہو؟"

وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔

"تم آج بھی دھوکے باز ہو۔" آنسوؤں کا ایک نیا سیلاب اس کی آنکھوں سے رواں ہوا۔

بدر اپنے ٹیڑھی مسکراہٹ مسکرایا۔

"قربانیاں دے رہا ہوں تاکہ تمہیں قبول ہو جاؤں۔ مگر تم آج بھی اتنی ہی ضدیلی ہو۔" اس نے جتایا۔

"اب مجھے نفرتوں پر نہیں، محبتوں پر غصہ آتا ہے۔" اس نے اقرار کیا۔

"کس مٹی کے بنے ہو؟ اتنی محنت سے سب حاصل کیا پھر خود ہی گنوا دیا۔" وہ جینز ٹی۔شرٹ میں کم عمر اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔

"بتایا تو تھا میں نے سب حاصل نہیں کیا تھا۔ میں نے تمہیں جو نہیں پایا۔" وہ اس کے نزدیک آ گیا۔ اس کے لرزتے ہاتھ اور غصے سے پھڑپھڑاتی نسیں دیکھنے لگا۔

"آج تک کوئی سید حارث پسند آیا ہے؟"

"بعض منزلیں مشکلوں کے قابل ہوتی ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے مر کر بھی دوبارہ زندہ ہونا پڑے تو سودا برا نہیں۔" اس کا دل چاہ رہا تھا کہ عروش کو تھام کر اس کی بے چینی کو پرسکون کر دے۔

"میں آج بھی وہی عروش ہوں جو دوسروں کی سچائی پر یقین رکھتی تھی۔"

"میں آج بھی وہی بدر ہوں جس کو تم سے تکرار

کرنا بہت پسند ہے۔ جو تمہارے غصے کی قیمت سمجھتا ہے۔ جو بے شمار دولت حاصل کر کے بھی خالی تھا۔ جس کو تم نے راہ دکھا کر ایک نیا مقصد دیا۔" اس نے عروش کا ہاتھ پکڑنے کی ہمت کر ہی لی۔ عروش لحظہ بھر کو کانپی مگر ہاتھ نہیں چھڑایا۔

"وعدہ کرو میری ہر بات نہیں مانو گے۔ میں کہوں بھی تو چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔" وہ پہلے سی ضدی عروش بن گئی۔

بدر نے جواب میں ایک جیب سے ایک گلابی کاغذ نکالا اس پر لکھا تھا۔

Will You be Mine (کیا تم میری ہو گی؟)

وہ کب سے اسے جیب میں لیے پھر رہا تھا۔ عروش نے اس کے کندھے پر اپنا گال ٹکا دیا اور کہا۔

I am Already (میں پہلے سے ہی تمہاری ہوں)

بدر نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ کی رنگ فنگر میں اس ہی کی سبز انگوٹھی پہنا دی۔

"اس کی اصل جگہ یہ ہے۔" بدر مسکرایا۔

"اس سے قیمتی اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔" عروش نے مسکرا کر کہا۔

محبت نے ایک بار پھر پتھر دلوں کو تراش کر اپنا وجود منوا لیا۔

☆☆☆

"ڈیر حماد

میرے ارد گرد ہر چیز یا چرائی ہوئی تھی یہاں ہتھیائی ہوئی۔ صرف ایک اپنا نام تھا جو میں نے کسی اثاثے کی طرح بچا کر رکھا تھا۔ نہ میرا جسم قیمتی تھا نہ میری ادائیں نہ میرے الفاظ۔ وہ سارے میں نے خوب لٹائے ہیں اور ان کی اچھی خاصی قیمت بھی وصول کی ہے۔ میرے سننے میں آیا ہے کہ آپ میرے لیے سب سے لڑ رہے ہیں۔ مجھے آپ کے جذبوں کی قدر ہے لیکن میں ان کے لائق نہیں ہوں۔ میں نے بے شک دوسروں کے کہنے پر کیا لیکن ساری عمر غلط کام کیا۔ یہ سب میری سرشت بن چکی ہے۔ میرے لیے اپنوں سے لڑ کر آپ گھاٹے کا سودا مت کریں۔ اس لیے میں خاموشی سے جا رہی ہوں۔ مجھے اس مشکل وقت میں پناہ دینے کا بہت شکریہ۔

فقط مریم"

وہ خط لکھ کر حماد کی ٹیبل پر چھوڑ آئی تھی۔ یہاں سے نکلنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ کسی نے زبردستی اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے کوئی جھوٹ نہیں گھڑنے پڑے۔ گارڈ نے اسے جانے دیا۔ یہاں وہ قید نہیں تھی۔ اسی لیے "تعبیر ہوم" سے نکلنا اتنا ہی دشوار لگ رہا تھا۔ وہ بس سٹاپ گئی اور ایک ٹکٹ لے کر کونے میں بیٹھ گئی۔ منہ اس نے اچھی طرح چادر سے ڈھک رکھا تھا۔

"کہاں کا ٹکٹ لیا ہے؟" حماد ایک کونے سے نمودار ہوا۔ مریم کا خدشہ سچ ہو گیا۔

"میں تو بہت دیر سے تمہیں ڈھونڈ چکا تھا بس دیکھنا چاہتا تھا کہ کہاں جا رہی ہو۔" حماد کہہ کر اس کے ساتھ آ بیٹھا اور اس کے ہاتھ سے ٹکٹ لیا۔

"بچپن میں ایک گھر میں کام کیا تھا۔ ان نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔ وہاں میں مریم تھی۔ پھر چاندنی، ایمان سوئی نہ جانے کیا کیا بنی۔ ان سے معافی مانگنے جا رہی ہوں۔" مریم نے وضاحت دی۔

"چلو میں بھی چلتا ہوں۔" حماد سکون سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا گیا۔

"بہت سے مریم اور شبیر کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میری خاطر آپ "تعبیر" والوں کو خفا نہیں کر سکتے۔" اس نے سمجھایا۔

"میں "تعبیر" کو نہیں چھوڑ رہا۔ وہ سب میرے ساتھی ہیں۔ جلد مان جائیں گے۔" وہ جانتا تھا۔

"آپ کو کیسے یقین ہے کہ میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہی۔ یہ سب میری کوئی چال نہیں؟"

"جیسے تمہیں یقین ہے کہ میں بھی وقت گزاری نہیں کر رہا۔" وہ مسکرایا۔

"ایسے معاملوں میں دل کو معلوم ہوتا ہے۔" وہ

آگے کو جھک کر چادر سے جھانکتا اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

ہر چیز سیاہ یا سفید نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ سیاہ کو سفید سے کھینچ کر الگ کرنا پڑتا ہے۔ میں یہی کرتا ہوں۔ اس لیے جانتا ہوں۔" وہ جانتا تھا اس ہی لیے اس کٹھن راستے میں ساتھ دینے کو تیار تھا۔

"مجھے جانے دیں۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔

"میں تمہیں روک نہیں سکتا نہ کبھی روکوں گا۔ اتنا تو جان لو تمہارے فیصلے ہمیشہ تمہارے ہوں گے۔ اس لیے بغیر بتائے روپوش ہونے کی کوشش مت کرنا۔"

اس کو تو ابھی اعتبار جیتنا تھا۔ آگے لمبا راستہ تھا۔

مریم اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ وہ آزاد تھی اپنے فیصلے خود لے سکتی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ روئے یا چلائے۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی صرف اتنا بتا دیں کہ میں اس سفر میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں؟" اس نے اجازت مانگی۔

"صرف اس سفر میں؟" اس نے کنفرم کیا۔

"فی الحال۔" حماد کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔" مریم نے اجازت دے دی۔

اور حماد مسکرا کر ٹکٹ لینے چلا گیا۔

☆☆☆

صفیہ بیگم عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ کمرے کے باہر تمام نوجوان نسل سازشی انداز میں منصوبہ بندی میں سرگرداں تھی۔ انہوں نے جائے نماز سمیٹنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سومارہ کی لیڈرشپ میں سب آداب بجالاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"خیریت تو ہے۔ یہ آج میری مزاج پرسی کا خیال کیوں آ گیا؟" صفیہ بیگم نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر گھورا۔

"امی! میں سوچ رہی تھی ہم نے کئی لوگوں کو معاف کر کے بہت غلطی کی۔ وہ صابرا، آپ کی ملازمہ جو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ پھر بھی آپ نے اس کو دوسرا موقع دیا۔" سومارہ نے کہا۔

"لیکن اس کا بچہ بیمار تھا وہ ایک کمزور لمحے میں تھی۔"

صفیہ بیگم نے اپنی الماری کا دروازہ کھولتی ارم کو دیکھا۔

"اور وہ آپ کے چچا کے بیٹے انہوں نے بہنوں کو ایک پیسہ نہیں دیا۔ ساری جائیداد پر خود قبضہ کر لیا۔ یہ تو سیدھی سادی غنڈا گردی تھی۔ پر بہنوں سمیت سارا خاندان ان سے ملتا ہے۔" سومارہ کہہ رہی تھی۔

ارم اب الماری کے اندر معائنہ کر رہی تھی۔

"یہ تم بالوں میں کنڈل ڈال کر سسرال سے میرے خاندان کے کچھ چھپے کھولنے آئی ہو؟" صفیہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں، میں تو صرف یہ بتا رہی تھی کہ معاف کر کے موقع دینے کی روایت کو قائم رکھیں۔" اس نے ماں کو پیار سے سمجھایا۔

"ہاں تو میں تو ہمیشہ سے معاف کرنے کی قائل ہوں۔ خدا بھی اسی سے خوش ہوتا ہے۔" صفیہ بیگم نے ہاتھ نچا کر جتایا۔

"اچھا پھر تو بہت اچھی بات ہے۔ کیونکہ بدر بھائی آج رات کھانے پر آ رہے ہیں۔"

"اور آپ یہ سوٹ پہننا۔" ارم نے جھٹ سے ایک سوٹ بیڈ پر رکھا۔ اس سے پہلے کہ صفیہ کی پرچڑھائی کرتیں سب دوڑ لگا کر کمرے سے باہر بھاگ گئے۔

☆☆☆

عروش نے دروازہ کھولا۔ سامنے بدر تھا جینز اور جیکٹ پہنے وہ خالی ہاتھ آیا تھا۔

"مجھے لگا تھا تم پھول لاؤ گے۔" اس نے روٹھ کر کہا۔

"میں اس سے بھی اچھی چیز لایا ہوں۔" بدر سائیڈ پر ہوا پیچھے یاسر تھا جو اپنے ہاتھ میں ایک ڈونگا لیے کھڑا تھا۔

"میرا بیسٹ سیلر پاستا ہے۔" بدر نے بتایا۔

"لوگ کہتے ہیں میں خوش قسمت ہوں تو صحیح کہتے ہیں۔" وہ مسکرا کر سائیڈ پر ہوئی۔ بدر اور یاسر اندر آ گئے۔ اس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ ہر خوشی اب انہی پتھروں میں پنپ کر جو ہر بنے جا رہی تھی۔

☆☆

صبا حریم

قربانی



مہندی ہال پیلے پھولوں سے سجا ہوا تھا ہر طرف پیلے پھولوں کی لڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسٹیج کو بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا آف وائٹ صوفہ سیٹ ہال کی چم چم کرتی لائٹس میں انتہائی دلکش لگ رہا تھا۔ مہندی ہال میں عورتوں کا الگ انتظام تھا لہٰذا سب لڑکیاں گانا گانے، ناچ گانے اور کچھ سیلفیاں بنانے میں مصروف تھیں تب ہی عظمیٰ بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر مہندی ہال پہنچی تھی۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔'' انیلا نے عظمیٰ کا دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے اسٹیج کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''آپ بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں بھابھی!'' عظمیٰ نے ایک نظر انیلا پر ڈالی جو کہ سلور اور کاپر ڈریس میں بہت نفیس لگ رہی تھی۔

انیلا عظمیٰ کو اسٹیج پر بٹھانے کے بعد نئے آنے والی مہمانوں کا استقبال کرنے میں مصروف ہو گئی تب ہی عظمیٰ کی سب دوستیں اس کے ارد گرد آ کر بیٹھ گئیں۔ کوئی عظمیٰ کے جوڑے کی تعریفوں میں مگن تھی تو باقی عجیب دغریب منہ بنا بنا کر سیلفی لینے لگ گئیں۔ عورتوں کی طرف کے سب انتظامات انیلا ہی کو دیکھنے تھے بڑی بھابھی ہونے کے ناتے اس کی ذمہ داری بھی بڑی تھی۔ لیکن بات صرف اس ذمہ داری کی نہیں تھی بلکہ شادی کے بعد ہی سے انیلا پر ساری ذمہ داری آن پڑی تھی اور آج تک وہ یہ ذمہ داری نبھاتی آئی تھی۔ شادی کو بیس سال گزر چکے تھے انیلا کی دو دیورانیاں بھی آ چکی تھیں لیکن ذمہ داری تھی

کہ انیلا کے کندھوں پر ہی ابھی تک تھی، اور انیلا کی اعلاظرفی تھی، کہ اس نے کبھی کسی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑا تھا۔

خنساء چچی بمشکل چلتے ہوئے انیلا تک آن پہنچیں پان کھانے کی وجہ سے ان کے ہونٹوں کا رنگ لال ہو چکا تھا اور دانت زرد۔

"ارے خنساء چچی، آپ آ گئیں۔ صغیرہ تائی کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ ویسے چچی، آپ اس سرخ جوڑے میں دلہن سے کم نہیں لگ رہیں۔" انیلا نے جب اپنے منفرد انداز میں اپنی چچی ساس کی تعریف کی تو خنساء چچی بھی ذرا شوخ ہو گئیں۔

"ہائے ہائے لڑکی! تم نے ہمیں دیکھا ہی کہاں ہے۔ جوانی میں تو ہم اداکارہ شبنم سے ملتے تھے۔" چچی شرمانے لگیں اور انیلا نے ہنسی کو مشکل سے قابو کیا۔

چچی نے صغیرہ تائی کا پوچھا تو انیلا نے بائیں جانب رکھی میز کی طرف اشارہ کیا جہاں صغیرہ تائی بیٹھی تھیں۔ انیلا کے ہاتھ کے اشارے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی عینک کو ناک پر کھسکاتے ہوئے صغیرہ کی طرف بڑھ گئیں۔ انیلا جانتی تھی کہ اب صغیرہ تائی اور خنساء چچی اگلی صبح تک نہیں اٹھنے والیں۔

لڑکیاں ڈھولکی پروگرام کی تیاری کے لیے گاؤ تکیے اور ڈھولک کو ایسے سیٹ کر رہی تھیں جیسے انٹرنیشنل لیول کا پروگرام ہو۔

☆☆☆

صغیرہ تائی تو خنساء چچی سے اس طرح گلے ملیں جیسے برسوں سے بچھڑی ہوں۔ ابھی ایک ماہ پہلے انیلا نے اپنے نئے گھر کی خوشی میں قرآن خوانی کی تھی تو وہاں بھی دونوں دیورانی جیٹھانی یوں ہی مل بیٹھی تھیں اور پھر چار گھنٹے تک نہ اٹھیں۔

"محسن تو عظمیٰ کی شادی اپنے ماموں کے گھر کرنے کے لیے راضی نہ تھا، یہ تو عظمیٰ تھی جو کاشف کے عشق میں مبتلا تھی ورنہ محسن تو اپنی اکلوتی بہن کے لیے کوئی شہزادہ گلفام ڈھونڈنا چاہتا تھا۔"

"خنساء چچی نے دبی آواز میں آنکھیں جھپک جھپک کر صغیرہ تائی کو نیوز اپ ڈیٹس دینا شروع کر دیں۔ نیوز اپ ڈیٹس دیتے ہوئے یہ خیال نہیں رہتا تھا کہ صغیرہ تائی بھی یہ سب باتیں جانتی ہیں، لیکن وہ سمجھتی تھیں کہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ سب نیوز ان تک پہنچا دیں۔ صغیرہ تائی بھی ان کی باتیں سن کر ایسا ردعمل دیتیں جیسے معلوم ہی نہ ہو کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔"

"ارے بھئی صغیرہ! میں تو اس انیلا کی ہمت پر حیران ہوں اتنی نیک اور سعادت مند بچی ہے۔ جس نے ان جیسوں کے ساتھ گزارہ کر لیا۔ اور وہ بھی محسن جیسے اکھڑ مزاج شوہر کے ساتھ جس نے کبھی اپنی بیوی کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر ترجیح نہیں دی۔ کون بھلا ایسے گزارہ کرتا ہے جیسے انیلا نے کیا۔"

"ہاں بھئی خنساء، بات تو تمہاری سولہ آنے سچی ہے۔ گھر بھی سنبھالا انیلا نے اور ساتھ پانچ بچے بھی اوپر سے محسن نے کبھی انیلا کو پورا جیب خرچ بھی نہیں دیا، بے چاری گلی محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اخراجات پورے کرتی رہی۔" صغیرہ تائی بھی اب انیلا کی دیوانی ہو چکی تھیں۔

حالانکہ جب محسن کی انیلا سے شادی ہوئی تو صغیرہ تائی انیلا کے ہر کام میں نقص نکالتیں اور رقیہ سے کہتیں کہ کیسی بھولے کر آئی ہوا ہے، تو سبزی تک کاٹنی نہیں آتی...... اسے صفائی ٹھیک سے کرنی نہیں آتی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ صغیرہ تائی کی بڑی بیٹی محسن کی ہم عمر تھی لیکن رقیہ نے اسے گھاس تک نہ ڈالی اور خاندان سے باہر شادی کی کیوں کہ انیلا جیسا ہیرا انہیں کہیں اور نظر نہیں آیا تھا۔

صغیرہ تائی پھول مکھانوں کا لفافہ کھول کر خنساء چچی کی پلیٹ میں ڈالنے لگیں۔

"بیچاری پہلے ساس سسر کی خدمتیں کرتی رہی پھر دیوروں کی دو دو بار شادی کی، ساتھ بچے پالے اور اب نند کی شادی کی۔"

لڑکیاں ڈھولکی بجانے لگی تھیں۔ رمشا اور عینی تو اتنا اچھل اچھل کر گانے گا رہی تھیں جیسے میوزک ایوارڈ جیتنا ہو۔ آخر ان کی اکلوتی پھوپھو کی شادی تھی۔ کیٹرنگ والے ٹیبل پر برتن سیٹ کرنے میں مصروف تھے اور انیلا انہیں ساری ہدایات دینے میں مصروف تھی۔

"یہ سعدیہ اور حمنا یہاں مہمان بن کر آئی ہیں جو سارے انتظامات انیلا پر چھوڑ رکھے ہیں۔ ان کی بھی تو نند کی شادی ہے!"

صغیرہ تائی ماتھے پر بل دیے پھول کھاتے چباتے ہوئے سعدیہ اور حمنا کی طرف غصے سے دیکھنے لگیں جو کہ اردگرد سے بے خبر سیلفی بنانے میں مگن تھیں۔ انہیں اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا انیلا جو تھی سب کرنے کو۔

"کیا بتاؤں صغیرہ تجھے، ان دونوں کے کرتوت۔ انیلا نے تو اپنے دونوں دیوروں کی دو دو بار شادی کی۔ بڑے دیور کی شادی کی تو اس نے کچھ دن بعد ہی اپنے تیور دکھانے شروع کر دیے کہ مجھ سے تو یہ گھر کے سینکڑوں کام نہیں ہوتے کام والی رکھ کے دو ورنہ میری طرف سے انکار ہے۔ انکار کیا تھا بھلا مطلب یہی کہ میں تو نہیں رہ سکوں گی۔ لہٰذا اس احمد نے اسے چھتا کیا۔ پھر سے اس کی شادی کی اور اللہ کی کرنی کہ دوسری بار اسے یہ سعدیہ ملی جس نے صاف کہہ دیا کہ الگ گھر لے کر دو گے تو رہوں گی۔ اب احمد تیسری شادی کرنے سے تو رہا لہٰذا الگ گھر سعدیہ کو لے کر ہی دینا پڑا۔ اس گھر کے لیے اچھی خاصی رقم محسن نے ادا کی اور وہ بھی انیلا کی کمیٹی کے پیسوں سے۔"

خنساء چچی نے صغیرہ تائی کے کندھے پہ ہاتھ مارتے انہیں یہ خبر سنائی تو صغیرہ تائی کا منہ حیرت سے کھلا ہی رہا۔

"اور تو اور حسن کے کرتوت دیکھو ذرا، ابھی شادی کو ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ بیوی کے ساتھ مار کٹائی پر اتر آیا ایک بار کبھی دو بار کبھی وہ تو روز یہی کام کرنے لگا بس پھر نوبت طلاق تک آن پہنچی پھر اس کم بخت کی دوسری شادی کی تو یہ پھوہڑ حمنا پلے پڑ گئی اور حق مہر میں دس تولے سونا لکھوایا ہے۔"

خنساء چچی نے منہ صغیرہ تائی کے کان کے پاس لے جا کر دبی آواز میں کہا۔ "اور وہ دس تولے سونا کون سا حسن نے دیا تھا اس میں سے چھ تولے سونا تو محسن نے دیا تھا جو اس نے انیلا کو ڈالا تھا اپنی شادی پر، کچھ یاد آیا۔" خنساء چچی یاد کرواتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر صغیرہ تائی سے کہا۔

"شکر ہے کہ اس وقت اللہ نے میری دعا قبول نہیں کی اور زارا کی شادی محسن سے نہیں ہوئی ورنہ زارا تو کبھی بھی اس گھر میں گزارا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو انیلا ہی تھی اور اس کا حوصلہ تھا ورنہ اور کون ایسا کرتا ہے کہ تن من سب دوسروں کی خوشی کے لیے قربان کر دے۔" صغیرہ تائی دل ہی دل میں انیلا کو کتنی دعائیں دے رہی تھیں۔ آنکھیں ذرا نم ہوئیں تو انیلا کا صاف شفاف عکس نظر آیا۔

"تائی امی اور چچی جان! آپ لوگوں کا کھانا میں آپ کی ٹیبل پر ہی لگوا دوں گی۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔" انیلا نے صغیرہ تائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکراتی نظروں سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے بیٹا......" صغیرہ تائی انہی نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ "تم نے بہت ہمت کے ساتھ یہ سب کیا ہے کتنی ہی ذمہ داریاں نباہ دیں اللہ نے تمہیں اس کے بدلے کتنی نیک اولاد سے نوازا اور اب اتنا پیارا گھر بھی دے دیا ہے۔" صغیرہ تائی کا ہاتھ انیلا کے ہاتھ پر تھا۔

"ذمہ داریاں کسی کی تعریف کی محتاج نہیں ہوتیں تائی امی۔ ذمہ داریاں تو نبھائی جاتی ہیں امانت داری اور خیر خواہی کے ساتھ اور صلہ دینے والی ذات تو اللہ کی ہے میں آپ لوگوں کے لیے کھانا لگواتی ہوں۔" انیلا ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔

☆☆

میمونہ صدف

سپاس گزار

بارہویں اور آخری قسط

ڈاکٹر منصور صد حیرت سے کتنی دیر اسے دیکھتے رہے۔ ان کی زندگی میں وہ پہلی ڈاکٹر تھی، پہلی ماں تھی جو اپنے بچے کا آپریشن خود کرنا چاہتی تھی۔ بچوں کو ذرا کچھ ہو تو مائیں کانپ اٹھتی ہیں کجا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں ہی اوزار تھام کر اپنے ہی وجود کے حصے کو کاٹ پیٹ ڈالیں اور وہ بھی اس کا دل۔

"اٹس امپاسبل۔ ڈاکٹر رطابہ آپ یہ نہیں کر سکتیں۔" "بٹ وائے؟ آئی ایم اے ہارٹ سرجن۔"

"لیکن اس سے پہلے آپ ایک ماں ہیں۔ او۔ ٹی میں کوئی عام پیشنٹ نہیں، آپ کا اپنا بیٹا ہوگا۔ ہاؤ کین یو ڈو دس؟"

"جانتی ہوں۔ تب ہی کہہ رہی ہوں کہ اس کی سرجری میں ہی کروں گی۔" ڈاکٹر منصور نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"ہی از یور اون سن (وہ آپ کا اپنا بیٹا ہے۔)" وہ اسے احساس دلانا چاہ رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کس کے بارے میں کہہ رہی ہے۔

"سو واٹ؟" وہ ایسے بولی کہ ڈاکٹر منصور کو اس کی ذہنی حالت پہ شبہ ہونے لگا۔

"آئی ایم سوری۔ شاید میں غلط کہہ گیا۔ مجھے تو آپ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ از ہی یور اون سن؟" رطابہ نے کچھ بری شکل بنا کر انہیں دیکھا۔

"لیگلی اور پروفیشنلی یہ پاسبل نہیں ہے رطابہ۔ ایک سرجن اپنے ہی بلڈ ریلیشن کی سرجری نہیں کر سکتا۔ آپ خود سوچیں کہ او ٹی میں آپ کا بچہ پڑا ہو تو کیا آپ اتنی کمپوزڈ ہوں گی کہ اس کی سرجری کر سکیں؟ آپ کو لگتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے آپ (چیرنے والا آلہ) scalpel تھام کر اپنے ہی بیٹے کو incision (چیرا) دے سکیں گی۔" انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا بات کر رہی ہے۔

"میں کر لوں گی سر۔"

ڈاکٹر منصور نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"انسان ہو انسان ہی بن کر دکھاؤ۔ خواہ مخواہ کی سپر ایلین مت بنو کہ اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر بھی تم ایک نارمل ڈاکٹر کی طرح بی ہیو کر سکتی ہو۔ یہ سالوں کی میڈیکل ہسٹری میں نہیں ہوا اور تم کرو گی۔؟"

"میں نے کہا نا کہ میں اس پہ اتنے عرصہ سوچتی رہی ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ لیا ہے۔ میں سب جانتی ہوں کہ او ٹی میں سرجری کے وقت کیا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر منصور نے نفی میں سر ہلایا۔

"ناٹ پاسبل۔ آپ اپنے کولیگ کو اسسٹ کرنا چاہیں تو ٹھیک ہے لیکن آپ یہ خود نہیں کر سکتیں۔"

"ڈاکٹر منصور! مجھے کسی پہ ٹرسٹ نہیں ہے سوائے اپنے۔ میں کسی کے سپرد اپنا بچہ نہیں کر سکتی آپ جانتے ہیں۔"

"ڈاکٹر ثمر از دی بیسٹ سرجن۔ یونو ہم۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں کوئی ڈاؤٹ ہونا چاہیے۔"

"بٹ سر! جب میں خود ایک اچھی سرجن ہوں تو۔"

"ایک ٹیچر جتنا بھی اچھا ٹیچر ہو، اپنے بچے کو اسکول پھر بھی بھیجتا ہی ہے۔ اسے گھر نہیں بٹھا دیتا۔ نہ ہی ساری عمر اسے خود پڑھا سکتا ہے۔ ہر انسان چاہے وہ کتنا ہی ماہر کیوں نا ہو، کتنا ہی علم والا کیوں نا ہو لیکن رطابہ وہ ہر سچویشن کو خود ڈیل نہیں کر سکتا۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔ یہ ایسی سچویشن نہیں ہے کہ اسے آپ خود ہینڈل کریں۔"

"بٹ سر۔" ڈاکٹر منصور نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

"لیف از ایف۔ آپ چاہیں تو ڈاکٹر ثمر کو اسسٹ کر سکتی ہیں لیکن خود سرجری نہیں کر سکتیں۔ میں تو آپ کی سوچ پہ حیران ہوں کہ آپ کے ذہن

ناولٹ



نے یہ فیصلہ لے بھی کیسے لیا۔ " وہ بات کو وہیں ختم کر کے چلے گئے۔ ان کے ساتھی کو لگ اگر رطابہ کو سائیکو پیتھ کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس کا دماغ عام انسان کا دماغ نہیں تھا۔ اسے درست ہونے کی اشد ضرورت تھی۔

رطابہ مٹھیاں بھینچ کر انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

" ابھی کیا ضرورت ہے ذکی کا آپریٹ کروانے کی۔ وہ تھوڑا بڑا ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔" رطابہ کمرے میں سونے کے لیے آئی تو دانش نے اپنا لیپ ٹاپ اسی وقت بند کرتے ہوئے پوچھا۔

" ایج کے ساتھ پرابلمز بڑھ جاتی ہیں۔ ابھی اسے کچھ ہوا نہیں لیکن وقت کے ساتھ بھی کچھ نہیں ہوگا اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"

" پندرہ کا تو ہو جائے۔" دانش کا دل نہیں مان رہا تھا۔

" میں نے کچھ مہینوں کے بچوں کی سرجری کی ہوئی ہے۔ وہ تو پھر دس سال کا ہے۔" وہ ہاتھوں پہ کریم کا مساج کرتے ہوئے آئینے کے سامنے سے اٹھی۔

" بہتر ہوگا کہ تم عین موقع پہ یہ باتیں کرنے کے بجائے ذکی کو مثبتی طور پہ تیار کرو سرجری کے لیے کیوں کہ میں سب ارینج کر چکی ہوں۔ دس دن بعد اس کی سرجری ہے اور تم یہاں یہ فضول ڈسکشن کر رہے ہو۔ میں ہارٹ سرجن ہوں اور میں بہتر جانتی ہوں کہ اس کی سرجری کب کرنا بہتر ہے۔ ڈاکٹر ثمر بس دو مہینے کے لیے ہی یہاں ہیں پھر وہ کینیڈا موو کر رہے ہیں۔ میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتی کیوں کہ میری نظر میں ان کے علاوہ کوئی ڈاکٹر اس قابل نہیں ہے جو میرے بیٹے کی سرجری کر سکے۔" اس نے سر جھٹکا اور موبائل پہ کچھ سرچ کرنے لگی اور ساتھ ساتھ اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے سر دائیں بائیں سمجھنے کے سے انداز میں ہلانے لگی۔

دانش خاموشی سے اٹھا اور اپنا لیپ ٹاپ الماری میں رکھ کر واپس بستر پہ لیٹ گیا۔ ایک نظر رطابہ کو دیکھا جو کسی کیس اسٹڈی میں منہمک تھی اور رخ موڑ کر سو گیا۔

☆☆☆

دانش اور فاطمہ روز ذکی کو بٹھا کر ہمت دلاتے کہ اسے بہادر بننا ہے کیوں کہ اس کے دل کا آپریشن ہے۔ لیکن وہ بہت عام سے انداز میں سب سنتا، جیسے اسے اس بات سے فرق ہی نہیں پڑتا کہ اس کے دل کا آپریشن ہے۔ جیسے بات کسی تیسرے چوتھے انسان کی ہو جس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کے چہرے پہ کوئی تفکر نہیں تھا۔ لہجے میں خوف نہیں تھا۔ انداز بھی بالکل معمول کا ہی ہوتا۔ روزانہ اسی قسم کے جملے سن سن کر وہ بے زاری سے سر ہلا دیتا تھا۔

" تم ڈرے ہوئے ہو؟" آپریشن سے ایک دن پہلے دن فاطمہ نے اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

" کیوں مجھے ڈرے ہوئے ہونا چاہیے؟"

" میں تمہاری جگہ ہوتی تو بہت ڈری ہوئی ہوتی۔ ڈر تو لگتا ہے آخر اتنی بڑی سرجری ہے۔" فاطمہ اس کا بیگ پیک کر رہی تھی جو ہسپتال جانا تھا۔ اسے کل دوپہر تک ہسپتال میں داخل ہو جانا تھا۔

" جان بہت پیاری ہے آپ کو۔" وہ بستر پہ ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ ہاتھوں کے کٹوروں پہ چہرہ ٹکا رکھا تھا اور کہنیاں اپنے گھٹنوں پہ ٹکیں۔ فاطمہ مسکرا دی۔

" جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے ذکی۔"

وہ خاموشی سے خالہ کو دیکھتا رہا۔

" مجھے نہیں ہے۔"

فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے۔

" پتا نہیں کیوں۔"

فاطمہ اس کا بیگ بند کر کے اس کے پاس چلی آئی۔

" زیور بابا کہتے ہیں کہ ڈر کر نہیں بہادری سے جینا چاہیے۔ بزدل بندہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔ اس لیے مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا کہ میرا آپریشن ہے۔" فاطمہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یو آر آ بریو بوائے۔"

"میں سوچتا ہوں کہ جتنا ہم اس زندگی کے لیے ڈرتے ہیں، اُس زندگی کے لیے کیوں نہیں ڈرتے۔؟" فاطمہ گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"ذکی! یہ سب تمہاری سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ تم ابھی بچے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"حضرت علیؓ بچے تھے۔ نو سال کے۔ تب اپنا دین چھوڑ کر قبول کیا تھا اسلام۔ اللہ کے نبیؐ نے تو انہیں نہیں کہا ہوگا کہ تم ابھی اس معاملے میں مت پڑو۔ تم بچے ہو۔ بچہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ کیا بچوں نے مرنا نہیں ہوتا یا ان کی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔؟"

"اس سب کے لیے زندگی پڑی ہے بیٹا۔ ابھی تم چھوٹے ہو۔" اس نے فاطمہ کو اچنبھے سے دیکھا۔

"آپ کو کیا گارنٹی ہے کہ زندگی ابھی بہت پڑی ہے۔؟" فاطمہ بالکل ساکت رہ گئی۔ اسے اذکار کی باتوں سے وحشت ہونے لگی۔ وہ ایسی باتیں کبھی نہیں کرتا تھا۔

"ایسی باتیں مت کرو ذکی۔" اس نے جھرجھری لی۔

"ہمیں ایسی ہی باتیں سوچنی اور کرنی چاہییں۔ کیا موت کو یاد کرنا غلط بات ہے۔؟ ہم یہ کام چھوڑ چکے ہیں نا خالہ اسی لیے ہمارا ایمان کمزور پڑ گیا ہے اور دنیا پیاری ہوگئی ہے۔"

فاطمہ بالکل چپ رہ گئی۔ جو بھی تھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس بات پہ وہ اس بچے کو نہیں جھٹلا سکتی تھی۔

اسی وقت رطابہ اندر آئی تھی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھی۔

"ہاؤ از مور ال ینگ بوائے؟"

وہ اس کے دوسری طرف آکر بیٹھ گئی۔

"پرفیکٹ۔" اذکار نے جیسے کسی روبوٹ کی طرح جواب دیا۔ وہ جب سے ہسپتال سے لوٹا تھا، ماں سے بات کم کرتا تھا۔

"آج میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔"

حیرت سے اس نے ماں کو دیکھا۔ "میں رات کو خراٹے لیتا ہوں۔"

جب سے وہ اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے رطابہ نے اذکار اور احبا کے کمرے الگ کر دیے تھے۔ جب کبھی اس نے ماں کے کمرے میں سونے کی خواہش کا اظہار کیا وہ اسے یہی کہہ کر ٹال دیتی کہ تم خراٹے لیتے ہو اور میں رات کو سو نہیں سکتی۔

"میں گزارا کر لوں گی۔" وہ مسکرا دی۔ اذکار کے لیے یہ ناقابل یقین بات تھی کہ کسی بات پہ اس کی ماں یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ وہ گزارا کر لے گی۔

"رات میں لائٹ بھی جلا کر سوتا ہوں۔" وہ جانتا تھا کہ رطابہ کو کمرے میں روشنی سے مسئلہ ہوتا ہے۔

"اٹس او کے۔" اس نے ماں کو دیکھا۔ کاش کہ وہ عام حالات میں بھی اتنی ہی اولاد کے لیے برداشت کرنے والی ماں ہوتی تو اسے ماں سے کوئی شکوہ نہ ہوتا۔

"لگتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔" وہ طنزیہ مسکرا دیا۔ رطابہ چونکی۔

"کس بات کا ڈر؟"

"یہی کہ میں او۔ٹی سے واپس نہیں آؤں گا۔"

"ذکی۔" فاطمہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ جس بات کو وہ سوچتے ڈر رہی تھی وہ منہ سے نکال رہا تھا۔

رطابہ کچھ شاکڈ سی رہ گئی۔

"مجھے پتا ہے کہ تم بالکل صحیح سلامت ٹھیک ہو کر واپس آؤ گے۔ یہ کوئی اتنی مشکل سرجری نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مشکل سرجریز ہم کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو معمول ہے۔"

"آپ تو اتنی شیور ہیں جیسے آپ نے میری زندگی کی گارنٹی لے لی ہو۔ ویسے ڈاکٹرز تو علاج کرتے ہیں، زندگی نہیں دیتے۔ اتنی شیورٹی بھی اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی کم لکھی ہو تو ہلکا سا بخار بھی ڈاکٹرز کی سمجھ میں نہیں آتا اور لکھی ہو تو دماغ کو کھول کھال کر درست کر دیتے ہیں۔"

فاطمہ نے اسے بغور دیکھا۔ وہ بالکل بھی پہلا جیسا اذکار نہیں تھا۔ معصوم اور سادہ سا بچہ جو چھوٹی

چھوٹی باتوں پہ روہانسا ہو جاتا تھا۔ اس کے مقابل تو کوئی بڑا تجربے کار بابا بیٹھا تھا، ایسا انسان جس نے زندگی کو بے خوف ہو کر جی لیا ہو۔ وہ اتنی ہمت اور بہادری کیسے دکھا رہا تھا فاطمہ حیران تھی۔

"آج تم اخبا کے ساتھ سو جاؤ۔ میں یہاں سوؤں گی۔" رطابہ نے ذکی کی بات کو نظر انداز کر کے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

فاطمہ نے آہستگی سے سر ہلایا اور جانے لگی تو ذکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ فاطمہ نے مڑ کر دیکھا۔ ذکی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے ہاتھ پہ بوسا دیا۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

فاطمہ کا دل بھر آگیا۔ اس نے جلدی سے ذکی کو گلے لگا لیا اور اس کا سر نرمی سے چومنے لگی۔ وہ اس کا اپنا بچہ نہیں تھا، اس بہن کا بچہ تھا جو اسے کبھی بہن سمجھتی ہی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا دل کٹ رہا تھا کیونکہ وہ اسے بے حد پیارا تھا۔

اس کے چہرے پہ بوسہ دے کر وہ تیزی سے کمرے سے چلی گئی۔ اگر وہ مزید کھڑی رہتی تو اس کے آنسو بہنے لگتے اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔

اذکار کچھ دیر بند دروازے کے پیچھے غائب ہو جانے والی خالہ کو ہی دیکھتا رہا اور پھر اپنے تکیے پہ جا کر لیٹ گیا۔

کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ ان دونوں کے درمیان اجنبیت حائل تھی۔ رطابہ چت لیٹے چھت کو دیکھتے اذکار کو دیکھ رہی تھی۔

"ذکی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اسے لگا کہ وہ پریشان ہے۔ رطابہ بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ وہ چھت کو دیکھتا رہا اور رطابہ اسے۔

"ایک بات کہوں ماما۔" رطابہ نے سر ہلایا۔

"جو ہوا وہ ہوا ماما۔ میں جانتا ہوں کہ زیور بابا آپ کو پسند نہیں ہیں لیکن انہوں نے کبھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اب وہ کبھی اس گھر میں واپس نہیں آئیں گے لیکن اگر ہو سکے تو ان سے معافی مانگ لیتا کیونکہ آپ نے ان کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔"

"کیا اس وقت ہم ہماری بات نہیں کر سکتے ذکی؟" رطابہ نے چڑ کر اسے ٹوک دیا۔

"کچھ باتیں امانت ہوتی ہیں ماما۔ کہہ دینی چاہئیں۔" رطابہ اتنے مشکل جملے اس کے منہ سے سن کر بالکل حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

"تم نے کہاں سے یہ سب سیکھا ہے ذکی؟"

"پتا نہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ کوئی دماغ میں ڈال دیتا ہے۔"

وہ بالکل گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"یہ جو مختلف سوچیں، مختلف آئیڈیاز آتے ہیں ہمارے دماغ میں، یہ سب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ یہ میں نے ایک لیکچر میں سنا تھا۔"

رطابہ اس کے بالوں میں ہاتھ چلانے لگی۔ وہ بہت وقت بعد اس دن اس سے بالکل عام انداز سے بات کر رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ میں کبھی تم دونوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکی کیونکہ میرا پروفیشن ہی ایسا تھا لیکن میں نے کبھی تم لوگوں کا برا نہیں چاہا......" وہ خاموش تھا۔ "کیا میں ایک بری ماں ہوں ذکی؟" وہ کافی دیر چپ رہا حتی کہ وہ آگے ہو کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"آپ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔" اس کے سوال پہ وہ ایسا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا جو اسے برا لگے۔

"آئی نو۔ لیکن میں تم سے اپنی مدرہڈ کا پوچھ رہی ہوں۔"

"اگر آپ کی ایک اولاد رہ جائے تو آپ کو اس کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے کہ آپ کیسی مام ہیں۔" رطابہ نے اسے بے چینی سے دیکھا۔

"میری دو اولادیں ہیں ذکی۔"

"دو سے ایک ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے۔"

رطابہ پتھرائی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ماں کی نظروں سے گھبرا کر اس نے پوچھا۔

"میری سرجری ڈاکٹر ثمر کر رہے ہیں؟"

رطابہ نے سر ہلایا۔ وہ اسے بتاتے بتاتے رک گئی کہ وہ ڈاکٹر ثمر کو اسسٹ کرے گی۔

"سو جاؤ۔ تاکہ نیند پوری ہو سکے۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔

"میں نے اوٹی میں جا کر سونا ہی تو ہے۔"

رطابہ بس اسے دیکھنے لگی۔ نجانے کیوں اس کا دل کچھ بھاری سا ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر بعد اذکار سو چکا تھا لیکن وہ جاگتی رہی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ مسلسل کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا حالانکہ آرام کی ضرورت اسے تھی کہ اس نے کل ایک آپریشن کرنا تھا وہ بھی اپنے بیٹے کا لیکن اس کا دماغ ایک خودکار مشین کی طرح چل رہا تھا۔

ڈاکٹر ثمر سرجری کر رہے تھے اور وہ انہیں اسسٹ کر رہی تھی، یہ بات اس گھر میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کے بعد ہی اذکار باہر نکلا تھا۔ فاطمہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ زیور بابا سے ملنے گیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے دانش سے اجازت لی تھی۔ رطابہ بھی وہیں تھی لیکن اس نے اذکار کو جانے سے منع نہیں کیا تھا۔ رات کا بوجھل پن ہنوز طاری تھا۔

"میں کچھ دیر بابا کے پاس اکیلے بیٹھنا چاہتا ہوں۔" فاطمہ سر ہلاتی واپس اندر چلی گئی۔

"آج میرا آپریشن ہے لیکن میں بالکل بھی ڈر نہیں رہا۔ میں نے بہادر بننا سیکھ لیا ہے۔ اب میں روتا نہیں ہوں۔" زیور بابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو ان کے ہاتھوں کی لرزش واضح تھی۔

"میں نے کچھ دن پہلے خواب میں دیکھا تھا بابا کہ آپ اور میں ایک بہت پیارے باغ میں بیٹھے تھے اور آپ مجھے بتا رہے تھے کہ وہ بہت خاص باغ ہے۔ بابا کیا وہ باغ جنت تھا؟"

زیور بابا بس اسے دیکھتے رہے۔

"مجھے خواب میں لگا تھا کہ وہ جنت ہے۔"

"جنت کو کوئی آنکھ تصور نہیں کر سکتی بیٹا۔" بابا نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹا لیا۔ اذکار نے سر ہلایا۔

"میں آپ کو کچھ کہنا چاہتا ہوں بابا۔ میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کیونکہ سب مجھے ڈانٹیں گے لیکن آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ کو بھی نہ بتاتا اگر ڈر ہوتا کہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ مجھے بہت عرصے سے ایسا لگتا ہے کہ میں آپریشن تھیٹر سے واپس نہیں آ سکوں گا۔ پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگتا ہے۔"

زیور بابا گنگ سے اسے دیکھنے لگے۔ ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسی بات وہ چھوٹا بچہ کیوں کر رہا تھا وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ تو دن رات اس کی صحت یابی کی دعا کرتے تھے۔

"میں نے ایک لیکچر میں سنا تھا بابا، کہ جب والدین نیک ہوتے ہیں تو ان کی خیر ان کی اولاد تک جاتی ہے اور اگر والدین گناہ گار ہوں تو ان کے گناہوں کا عذاب ان کی اولاد تک جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں بیمار اس لیے ہوا ہوں کہ ماما نجھ سکیں کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے یہ بیماری مجھ پہ آئی ہے۔"

بابا کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"ایسا نہیں سوچتے۔ یہ بس ایک آزمائش ہے۔" بابا نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو ضبط کیا۔

"آپ نے تو ماما کو بد دعا نہیں دی ہوگی بابا، لیکن اللہ تو منصف ہے نا جو سب دیکھتا ہے۔" بابا نے ذکی کے سر پہ ہاتھ دھرا۔ ان کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ زندگی کی کچھ بدصورتیوں نے اس بچے کو کیسا قلب سلیم عطا کر دیا تھا جو ایک عام انسان بڑھاپے تک بھی نہیں پا سکتا۔

"میری ایک بات مانیں گے آپ۔" بابا اسی طرح اسے دیکھ رہے تھے۔

"اگر کبھی ماما نے آپ سے معافی مانگنے آئیں تو انہیں معاف کر کے گھر چلے جایئے گا۔ آپ کو یوں یہاں بیٹھے دیکھنے سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔"

ان کا سر پہ دھرا ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں گر گیا۔ بابا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ انہوں نے

سوچ رکھا تھا کہ جب اذکار ہسپتال سے واپس لوٹے گا تو وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جائیں گے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے کہاں جانا تھا لیکن انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

"ذکی بابا! آپ کو بے فکر ہو کر ہسپتال جانا چاہیے۔ یہ باتیں واپسی پہ بھی ہو سکتی ہیں۔"

"واپسی کا یقین نہیں ہے مجھے۔ اسی لیے سب کہہ دینا چاہتا ہوں......" اس کا چہرہ یک دم مرجھا گیا ہے۔ "میری ماما کو معاف کر دیں بابا، چاہے وہ معافی مانگنے آئیں یا نہیں۔ میں ان کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر سے ہاتھ جوڑ دیے۔ کیا کبھی کسی اولاد نے اپنی ماں کے لیے اتنی شدت سے معافی مانگی ہوگی؟

زیور بابا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ رو رہے تھے لیکن ذکی خاموش تھا۔ وہ پہلے بات بات پہ رو دیتا تھا لیکن جب سے وہ ہسپتال سے آیا تھا ایک عجب طرح کا بدلاؤ آیا تھا کہ وہ اب روتا نہیں تھا۔

کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اپنے ہاتھ ان سے چھڑا کر وہ ان کے گلے لگا۔

☆☆☆

ہسپتال کے کاریڈور میں وہیل چیئر پہ بیٹھا وہ ننھا بچہ زندگی کے چند پل گزرنے کے بعد اندر ایک ایسے بستر پہ لیٹا ہوگا جس پہ اس کا جسم زندگی اور موت کے مابین حائل ہوگا۔

نانا نانی، ماموں مامی، چاچو چاچی اور کرنل پاپا سب مل کر جا چکے تھے۔ صرف دانش اور فاطمہ وہاں اس کے ساتھ موجود تھے جس کی وہیل چیئر ایک میل نرس کاریڈور میں آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا اور مخصوص لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پہ کچھ گھبراہٹ تھی کہ وہ ننھا بچہ تھا اور زندگی کو دور ہوتے، موت کو قریب محسوس کر رہا تھا۔ زندگی بھلے پیاری ہو نہ ہو لیکن موت کی اپنی ایک سختی ہوتی ہے جو انسان کو پریشان رکھتی ہے۔

آپریشن تھیٹر کے قریب پہنچ کر دانش یک دم اس سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خاموش آنسو جو لبوں سے سسکی کو بلند ہونے سے پہلے ہی دبا دیتے ہیں۔ وہ باپ تھا لیکن کمزور پڑ کر بیٹے کو کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ باپ کے یوں والہانہ گلے لگنے پہ اذکار کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

فاطمہ بار بار آستین کو چہرے تک لے جا کر آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اس کی زبان پہ ورد جاری تھا۔ بھلے وہ ڈاکٹر تھی لیکن خود کو عام انسان ہی سمجھتی تھی۔ اس نے بھی بہن کی طرح بھی اپنے آپ کو زندگی بانٹنے والا فرشتہ نہیں سمجھا تھا۔

"مضبوط رہنا اور بالکل ڈرنا نہیں۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اس سے الگ ہو کر انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

فاطمہ کی طرف اس نے دیکھا تو وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پہ سجا کر اس سے گلے ملی۔ اس کے چہرے پہ پیار کیا۔

"ذکی! تم بہت بہادر اور نیک بچے ہو۔ اللہ تمہاری ضرور حفاظت کریں گے۔ تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔"

اذکار مسکرا دیا۔

"خالہ! میری ماما کا خیال رکھیے گا۔"

فاطمہ کا چہرہ پھیکا پڑا۔ "تم ٹھیک ہو کر خود ان کا خیال رکھنا۔ ویسے بھی اب تم ایک جوان بیٹے کا روپ دھارنے لگے ہو جو ماں کا سہارا ہوتے ہیں۔" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"میرا ایک کام کرنا ہے آپ نے۔ میری الماری میں ایک کاغذ پڑا ہے، آپ والا۔ اس میں کچھ پیسے تھے جو میں نے چیرٹی کے لیے جمع کیے تھے۔ وہ سارے پیسے ماما کو دینا کہ وہ زیور بابا کو اپنے ہاتھوں سے دے دیں۔" فاطمہ کا دل مزید بھر آگیا۔ اس نے اذکار کا ہاتھ تھپکا۔

تب ہی اوٹی ڈریس میں رطابہ باہر آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میل نرس مزید تھا۔

"ذکی چلو بیٹا۔" ابھی وہ واش نہیں ہوئی تھی۔ (

آپریشن کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی)۔
دانش اور فاطمہ کی جذباتیت دیکھ کر اس نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔ میل اسٹاف کو اشارہ کیا جو اسے اندر لے جانے لگے۔
اذکار نے مڑ کر انہیں دیکھا اور ہاتھ ہلا دیا۔ پھر وہ دروازے کی اوٹ میں گم ہو گیا۔
"بچے کا مورال ہائی کرنا چاہیے آپ دونوں کو۔ نہ کہ اسے پریشان کریں۔ یہاں اس کے ساتھ اسے بیک اپ کرنے کے لیے چھوڑا تھا۔ اگر رونا دھونا ہی تھا تو اسے اکیلے چھوڑ دیتے۔"
اسے اوٹی ڈریس میں دیکھ کر دانش نے بے چینی سے پوچھا۔
"تم آج بھی سرجری کے لیے جا رہی ہو۔ ذکی کو تمہاری ضرورت ہے۔"
"اسی کے لیے ہی جا رہی ہوں۔" دانش الجھا۔
"ڈاکٹر ثمر کو میں اسسٹ کروں گی سرجری میں۔"
کچھ سنبھل کر اس نے اعتماد سے کہا تو فاطمہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دانش بالکل گنگ سا اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک سرجن کا شوہر تھا اور ڈاکٹرز کے شوہر بیویوں کے ساتھ رہ کر اتنا تو سمجھ جاتے ہیں کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔
"یو کانٹ ڈو دس۔"
"آئی کین۔ میں اس کی سرجری خود کرنا چاہتی تھی یہ تو ڈاکٹر منصور نے پرمیشن نہیں دی اور ڈاکٹر ثمر کو ہائر کر لیا۔"
بے یقینی سے وہ دونوں اس کی شکل دیکھنے لگے۔
"اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ایک سمپل سی سرجری ہے اور ایسی سرجریز ہم دن میں کئی بار کرتے ہیں۔" باہر سے تسلی دیتے ہوئے نجانے کیوں اس کا اپنا دل پل بھر کے لیے زور سے دھڑکا تھا۔
وہ واپس لوٹ گئی تھی۔ ابھی اسے واش ہونا تھا اور ایک بار اکیلے میں ذکی سے ملنا تھا۔ وہ پہلے سیدھی ذکی سے ملنے چلی گئی۔
میل اسٹاف اسے بیڈ پہ شفٹ کر چکے تھے۔
"میں یہیں ہوں ذکی، تمہارے پاس۔ میرے بیٹے کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" اس کا ہاتھ تھام کر اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ دو آنسو یک دم ذکی کی آنکھوں میں چمکے اور اس نے بہت امید سے ماں کو دیکھا۔ جیسے یہ اللہ کی طرف سے تسلی تھی جو ماں کے منہ سے دلائی جا رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ اسے ماں کی بات کا یقین آ گیا تھا۔ رطابہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ذکی نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔
رطابہ اس سے قریب ہوئی تو اس نے ماں کا چہرہ چوم لیا۔ دو آنسو اب گالوں سے ہوتے بالوں میں جذب ہو گئے۔ نجانے کتنے وقت بعد اس نے یوں ماں کے منہ کو چوما تھا۔ آخری بار کا اسے یاد ہی نہیں تھا۔ رطابہ نے بھی اس کے ماتھے کو چوما اور جلدی سے پلٹ گئی۔ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر وہ خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ابھی ایک کٹھن مرحلے سے گزرنا تھا۔
"بابا! اخبا کا خیال رکھنا پلیز۔" رطابہ سے واپس مڑ کر اسے دیکھا نہیں گیا اور وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔
ارد گرد سرجری کے پروسیجر کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ کچھ دیر میں اینستھیٹک (بے ہوش کرنے والا ڈاکٹر) بھی وہیں آ چکے تھے۔
اذکار نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔
"اللہ میں آپ کے باغ کا پھول ہوں پھر بھی مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں مجھے معاف کر دیں۔ بیشک میں نہیں جانتا کہ میں یہاں سے اٹھ پاؤں گا یا نہیں۔ بس مجھے سب غلطیوں پہ معاف کر دیں۔ اس وقت میں جس احساس سے گزر رہا ہوں وہ بس آپ جانتے ہیں۔"
اینستھیٹک اس سے ہلکے پھلکے سوال کر رہا تھا تا کہ اس کا دھیان بٹا رہے۔
"اللہ جی، میرا دل کہتا ہے کہ میں اس بے ہوشی سے کبھی جاگ نہیں سکوں گا۔ اگر یہ میرا آخری وقت ہے تو میں معافی مانگتا ہوں اور اگر اس کے بعد بھی میں زندہ رہا تو ساری زندگی بس شکر ادا کروں گا۔"
تب تک ڈاکٹر ثمر بھی واش ہو کر اوٹی میں آ چکے

تھے۔ اس سے مسکرا کر بات کرتے وہ اس کا حوصلہ بلند کررہے تھے۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں ان کی بات سن رہا تھا۔

"اگر میری زندگی ہے تو مجھے اس صحت سے بہتر صحت دینا اور اگر زندگی ختم ہے تو موت آسان کرنا۔" انستھک اپنا کام کرچکا تھا۔ ذکی کا دماغ سن ہونے لگا تھا۔ آخری منظر جو اسے یاد رہا تھا کہ اس نے ماں کو اوٹی ڈریس میں ملبوس خود پہ جھکتے دیکھا تھا اور پھر وہ اپنے ہوش کھو چکا تھا۔

☆☆☆

فاطمہ اور دانش وہیں ایک کاریڈور میں بیٹھے تھے جب ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو فاطمہ اٹھ کر ہسپتال کے پریئر ایریا (نماز پڑھنے کی جگہ) کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھیں بار بار بھرا رہی تھیں۔ دل نجانے کیوں بری طرح ڈرا ہوا تھا۔ شاید وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی اگر ذکی کے جملے اس کے ذہن میں گردش نہ کررہے ہوتے۔

"خالہ! میری ماما کا خیال رکھیے گا۔" وہ کاریڈور میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اردگرد کون آرہا تھا کون جارہا تھا اسے ہوش نہیں تھا۔ اس کا سارا ارتکاز انہی جملوں پہ تھا۔ وہ پریئر ایریا کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ اسے کسی نے پکارا۔

"آئینور۔" وہ چونکی اور مڑ کر آواز کی سمت دیکھا تو پتھرا گئی۔ اس کے سامنے ریچل کھڑی تھی۔ وقت بالکل نہیں گزرا تھا۔ وہ ہوبہو ویسی ہی تھی جیسے کالج میں ہوا کرتی تھی۔ وقت تو آئینور پہ بھی نہیں گزرا تھا لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ اور میچور دکھائی دینے لگی تھی۔

"کیسی ہو یار۔؟ کہاں ہوتی ہو۔؟ اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں۔" پانچ سال پہلے کا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا تو اندر ایک ٹیس اٹھی۔ وہ بھول چکی تھی لیکن درد ابھی باقی تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ یہیں اسی شہر میں ہوتی ہوں۔"

"شہر میں تو ہو۔ آئی مین یور جاب۔؟" آئینور کچھ کہنے لگی تو اس سے پہلے ہی ریچل بول پڑی۔

"اوہاں۔ تمہارے بھانجے کی سرجری ہے نا آج؟" فاطمہ نے کچھ اچنبھے سے سر ہلایا کہ وہ کیسے جانتی تھی۔

"میرے ہزبینڈ اس ہاسپٹل کے ڈائریکٹر ہیں اور ڈاکٹر رطابہ ہماری بہت ہی قابل ڈاکٹر ہیں۔ ان کے بیٹے کی سرجری کا سب کو پتا ہے۔" اس نے خود ہی وضاحت دی۔

"بٹ ڈانٹ وری۔ ڈاکٹر ثمراز دی بیسٹ ڈاکٹر ان دا ٹاؤن۔ وہ بالکل ٹھیک ہوکر آئے گا۔"

آئینور نے سر ہلا کر زیر لب "ان شاء اللہ" کہا۔

"میں چلتی ہوں۔" آئینور مزید اس سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"چلی جانا۔ پلیز دو منٹ میری بات سن لو۔ کچھ امپارٹنٹ ہے۔" بے زاری صورت لیے فاطمہ نے وقت دیکھا۔

"جلدی کہو ریچل۔ مجھے نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے اور پھر مجھے واپس اندر جانا ہے۔" اوٹی ہسپتال کی دوسری عمارت میں تھا اور پریئر ہال دوسری۔ ریچل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"تم اب تک ویسی ہی ہو آئینور۔ ویسی ہی پیور اور ڈفرنٹ۔ سب سے الگ۔ تب ہی تو اس نے مجھے ایک نظر نہیں دیکھا اور اب تک وہ تمہیں ہی ڈھونڈ رہا ہے۔ تمہاری جیسی اسے کوئی ملی ہی نہیں پھر۔" ریچل کے لہجے میں حسرت تھی۔ فاطمہ چونکی۔

"میں عباد کی بات کررہی ہوں۔" فاطمہ کے چہرے پہ ایک سایہ لہرایا۔

"میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ریچل۔ بہتر ہے کہ ہم اس بات کو یہیں ختم کردیں۔ تم سے مل کر اچھا لگا۔"

ریچل نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا جو قریباً مڑ چکی تھی۔ فاطمہ کچھ حیران ہوئی۔ ریچل کے چہرے پہ اضطراب کی سی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں موہوم سی امید تھی۔

"وہ تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کررہا ہے

آئینور۔ اس کے ساتھ ایسا مت کرو۔ پچھلے آٹھ مہینے سے وہ تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کہاں کہاں اس نے خاک نہیں چھانی۔ جو کچھ بھی کالج میں ہوا تھا وہ سب میرا اور سمیرا کا کیا دھرا تھا۔ تم دونوں کے درمیان جو بھی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی وہ ہم نے پیدا کی تھی کیوں کہ میں تمہیں اس سے دور کرنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ، جو تمہیں چاہتا ہے، تمہیں حاصل بھی کر پائے۔ میں تم دونوں کو ایک ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے جیلسی ہوتی تھی کہ میں تم سے زیادہ خوب صورت ہو کر بھی کیوں اس کی نظروں میں نہیں ہوں۔ کیا کمی تھی مجھ میں بھلا۔ اور ایسا تم میں کیا تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ تم تو بھی کسی سے بات کرنا تک گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اتنی روڈ، عجیب اور نان سوشل تھیں۔ میں یہ تو دیکھ ہی نہیں سکی کہ وہ تمہارے اندر کا حسن دیکھ چکا تھا تو اس کے لیے میرا ظاہری حسن کیا خاک معنی رکھتا۔ اور سمیرا۔ اس نے اپنا کوئی پرانا بدلا لینا تھا عباد سے اسی لیے اس نے مجھے آگے کر دیا، مجھے مہرہ بنا دیا اور میں بخوشی بن بھی گئی کیوں کہ ہم دونوں کا ایک ہی مقصد تھا۔ تم دونوں کو الگ کرنا۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ عباد سے بدلا لینے کے لیے سب کر رہی تھی اور میں اپنی محبت میں ایسا کرنے پہ مجبور ہو گئی۔"

آئینور بک دک سی اسے سن رہی تھی۔ یہ سب اس کے لیے نیا تھا۔ سمیرا اس کی دوست ہو کر اس کے ساتھ یہ کر سکتی تھی اسے اندازہ نہیں تھا۔ ہاں وہ خود غرض سی لڑکی تھی، کسی حد تک بدتمیز اور منہ پھٹ بھی تھی لیکن ایسی چال چلے گی یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

"ہم نے مل کر اس کی نظروں میں تمہارا کردار مشکوک بنایا اور اسے تمہاری نظروں سے گرایا۔ ویسا کچھ بھی نہیں تھا جو ہم نے لاسٹ وائیوا والے دن کہا تھا۔ عباد تو کبھی تمہارے بارے میں ایک لفظ کسی سے نہیں کہتا تھا کیوں کہ وہ تمہیں اتنا معتبر سمجھتا تھا۔ وہ تو اس بات سے ڈرتا تھا کہ کسی کے سامنے تمہارا ذکر کرنا بھی کہیں تمہیں بدنام نہ کر دے۔ اس کی نظروں میں بس تمہارے لیے میں نے دو ہی تو جذبے دیکھے تھے، ایک محبت اور دوسرا احترام کا۔ اور یہ دو جذبے میں اپنے لیے اس کی نظروں میں چاہتی تھی جو مجھے کبھی دکھائی نہیں دیے۔ اس دن تمہارا اس سے دل برا کرنے کے لیے وہ سب ہم نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارے ہزبینڈ کا ہمیں نہیں پتا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ جب وہ تمہیں لینے آنے لگا تو ہمیں موقع مل گیا تمہیں برا ثابت کرنے کا۔ اسی لیے ہم نے اسے جان بوجھ کر تمہارا بوائے فرینڈ بنا دیا تاکہ عباد تمہیں عام لڑکی سمجھ کر دھتکار دے۔ یہ سب ہم نے کیا تھا آئینور۔ سمیرا اور میں نے۔ عباد بے قصور تھا۔ وہ تم سے پہلے ہی محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے حتیٰ کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتا تھا کہ تم شادی شدہ نہیں ہو پھر بھی وہ تمہیں ایک امید لیے ڈھونڈ رہا ہے۔"

آئینور بالکل گم صم کھڑی سب سنتی رہی پھر اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک گہری سانس لی اور آنکھیں موند کر کھولیں۔

"اگر میری تربیت ایسی نہ ہوتی تو اس وقت یہ کاریڈور تماچے کی آواز سے گونج اٹھتا۔"

ریچل آئینور کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ لیکن وہ اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا، ایک تھپڑ تو بنتا ہی تھا۔

"مگر میں ایسا کچھ نہیں کروں گی کیونکہ دوسروں کو ذلیل کرنے کی گھٹیا حرکت میں نے کبھی سیکھی ہی نہیں ہے۔"

وہ آگے بڑھنے لگی تو ریچل جلدی سے سامنے آگئی۔

"عباد تمہارا منتظر ہے آئینور۔ اس نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ کب سے وہ تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہے۔ کوئی جگہ اس نے چھوڑی نہیں جہاں سے تمہارا سراغ مل سکے۔"

"وہ سب پیچھے رہ چکا ہے۔" اس نے ریچل کو دیکھے بنا بس سامنے کی کھلی ہوادار کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب سچ میں اس کے بارے میں بھی نہیں سوچتی تھی جس نے اسے بری طرح رد کیا تھا۔

"وہ اب بھی آگے نہیں بڑھا۔ وہیں کھڑا ہے

جہاں پہلے تھا۔"

"لیکن میں آگے بڑھ چکی ہوں۔" آئینور نے اسے دیکھ کر بہت مضبوط لہجے میں جتایا۔ ریچل طنزیہ مسکرائی۔

"تم بھی آگے نہیں بڑھی ہو۔ تم اگر آگے بڑھی ہوتی تو تمہاری ڈائیوارس نہ ہوئی ہوتی یا تم آج سنگل نہ ہوتیں۔ مان لو آئینور، کہ تم بھی وہیں کھڑی ہو۔" اس نے چونک کر ریچل کو دیکھا۔

"میری ڈائیوارس؟"

"مجھے ڈاکٹر رطابہ نے بتایا تھا سب کچھ۔"

فاطمہ کا چہرہ پھیکا پڑا۔ اس کی کزن ہر جگہ اس کی عزت نفس کو مجروح کرنا اپنا فرض جو سمجھتی تھی۔ کم از کم اس لڑکی کے سامنے اس کی عزت رکھ لیتی۔ کاش کہ وہ اس رطابہ کا کچھ کر سکتی۔ مگر دنیا میں کوئی انسان ایسا پیدا ہی نہیں ہوا تھا جو اس کا کچھ بگاڑ سکتا۔ بعض انسان لاعلاج ہوتے ہیں۔ ان کا علاج اللہ کے ہاتھ ہی سے ہونا ہوتا ہے۔ رطابہ انہی میں سے ایک تھی۔

"تم دونوں کا ساتھ قسمت میں ہے آئینور۔ تب ہی تو اتنے سال گزرنے کے بعد بھی تم دونوں سنگل ہو۔ قدرت تم دونوں کو ملانا چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ تمہیں یہاں لے آئی جہاں میں تھی۔ ہمارا ملنا طے تھا کیونکہ مجھے ہی تم دونوں کو ملانے کا وسیلہ بننا تھا۔"

"اور اس سب سے تمہارا کیا فائدہ ہے؟ کیوں کہ شاید تم کوئی کام بھی فائدے کے بنا تو کرتی نہیں ہو۔"

"ہاں کیوں کہ میں اب عباد کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ جس سے محبت کرتے ہیں اس سے چھینا نہیں جاتا۔ اسے دیا جاتا ہے۔ یوں بھی میں اپنی لائف میں مطمئن ہوں۔ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ایک سیٹلڈ لائف گزار رہی ہوں۔ تو جس کا دل میں نے برباد کیا، اسے بھی خوش ہونے کا پورا حق ہے۔ میں اسے اس کی خوشی لوٹانا چاہتی ہوں آئینور جو کہ بس تم ہو۔ یقین کرو وہ تم سے جتنی محبت کرتا ہے، وہ میں نے دیکھی ہے۔ اس کی گواہ میں ہوں۔"

فاطمہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ ریچل نے اسے روکا نہیں تھا۔ بس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے لگا تھا کہ اس کی اتنی لمبی دلیلوں، وضاحتوں اور تقریروں نے کہیں نا کہیں برف پگھلائی ضرور ہے۔

نماز میں دعا مانگتے، ہاتھ پھیلاتے اذکار کی زندگی کی دعا کے ساتھ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ زندگی میں جب جب اس کی ذات پہ بات آئی تھی، اللہ نے وقت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ بات کرنے والا ہی غلط تھا۔ آج ریچل اور عباد غلط ثابت ہوئے تھے اور سال پہلے شمشاد۔ جب خود ہمدان نے اسے آ کر بتایا تھا کہ اسے ٹھکرا کر جس لڑکی سے شمشاد نے شادی کی تھی وہ اسے چھوڑ گئی ہے۔

"میں نے ہی ایک بار سوال کیا تھا نا اللہ آپ سے کہ کیا میں بری ہوں جو سب مجھے تھوک جاتے ہیں۔ اس وقت آپ خاموش تھے لیکن آج آپ نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ آپ نے مجھے سرخرو کر دیا ہے۔ آپ نے مجھے میری نظروں میں معتبر کر دیا ہے۔ مجھے یہ بتانے کے لیے شکریہ کہ میری زندگی میں، میری کوئی جدوجہد بھی ناکام نہیں رہی۔ مجھے یہ بتانے کا شکریہ کہ اللہ ہمیشہ سچے اور مخلص لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے پھر بھلے دنیا کے چلن کیا ہی ہوں۔ میں آج سپاس گزار ہوں اللہ کہ زندگی میں بھلا کتنا ہی تھکی ہوں، لڑی ہوں، جلی ہوں مگر آپ نے مجھے تھامے رکھا ہے، چھوڑا نہیں ہے۔ آپ ہمیشہ میرا سہارا بنے رہے ہیں اور میں جس مقام پہ ہوں وہ سب آپ کا عطا کیا ہے۔ آپ ساتھ نہ دیتے تو آج آئینور فاطمہ گل بھی اس جگہ نہ ہوتی جہاں ہے۔ یہ سب کچھ جو مجھے حاصل ہے، ڈگری، عزت، نوکری، عزت نفس یہ سب آپ کا دیا ہوا ہے۔ میرے دل میں بس شکر اور احساس ہے لیکن اس کو ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بس یہ آنسو ہیں جو آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔"

پریئر ہال میں وہ اکیلی تھی اور اس کے ساتھ بس اس کا اللہ تھا۔ وہ اللہ جس کے لیے ایک سپاس گزار کے دل

کا احساس اور آنسو ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

جب ڈاکٹر ثمر نے ذکی کے سینے پہ پہلا چیرا دیا تو رطابہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

(آپ کو لگتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے آپ (چیرنے والا آلہ) scalpel تھام کر اپنے ہی بیٹے کے incision (چیرا) دے سکیں گی۔) ڈاکٹر منصور کی آواز کے ساتھ ہی اس کا سر اذکار کے جسم سے ابلنے والے خون کو دیکھ کر بری طرح بے قابو ہوا۔

ڈاکٹر ثمر اب electrocautery سے اذکار کے خون کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ (الیکٹرو کاٹری ایک ایسا آلہ ہے جو دوران آپریشن خون کی نالیوں کو جلا کر سیل کرنے کے کام آتا ہے تاکہ خون کا بہاؤ روکا جا سکے)

اس کا سر چکرانے لگا تھا لیکن وہ کھڑی رہی۔ اس نے بار بار آنکھیں میچیں اور گہری سانسیں لیں۔

''یہ ایک پیشنٹ ہے رطابہ اور بس۔'' اس نے خود کو دل میں تسلی دی۔

اذکار کی sternotomy کی جا رہی تھی۔ (ایک تکنیک جس کے ذریعے سینے کی ہڈی کو کاٹا جاتا ہے تاکہ دل تک رسائی ممکن ہو سکے)۔ اس سے مزید کھڑا رہنا جیسے دوبھر ہوا اور وہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔ اس کی جگہ ڈاکٹر امبر آگے بڑھیں۔ احتیاطی تدبیر کے طور پہ ڈاکٹر منصور نے ڈاکٹر امبر کو بھی اسسٹ کرنے کے لیے کہا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ رطابہ ابھی یہ بات کر رہی ہے کہ وہ اسسٹ کرے گی لیکن بعد میں ایسا ممکن نہیں رہے گا۔ اس نے ایک طرف ہوتے گہرے سانس لیے۔

''مجھے اس وقت ایک ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ اگر میں اس سرجری کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی تو میری اتنی قابلیت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔ زور سے آنکھیں میچیں اور دو تین بار گہرے سانس لے کر وہ واپس اپنی جگہ آ کر کھڑی ہوگئی۔

سامنے اذکار کا دل دھڑکتا دکھائی دے رہا تھا اور پہلی بار رطابہ کو محسوس ہوا کہ یہ دل کیا ہوتا ہے۔ جو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ جسم کا وہ حصہ کہ یہ ٹھیک ہو تو سب ٹھیک ہوتا ہے اور یہ خراب ہو تو سب خراب ہو جاتا ہے۔ جان لو کہ یہ دل ہے۔ جان لو کہ یہ دل ہے۔

ڈاکٹر ثمر sutures کے ذریعے اس حصے پہ stitches لگا رہے تھے اور وہ انہیں اسسٹ کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش واضح تھی۔ ڈاکٹر ثمر نے اسے منع بھی کیا لیکن وہ کھڑی رہی۔ stitches لگانے کے دوران ہی heart arrset ہو گیا اور مانیٹر پہ چلتی پلس ریٹ بالکل سپاٹ ہو گیا (ایسی حالت جس میں دل خون کو پمپ کرنا بند کر دیتا ہے)۔ دل کا دھڑکنا بند ہو گیا تو رطابہ کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ وہ ایک بار پھر ڈاکٹر سے ماں بن گئی تھی۔ سامنے پڑا مریض ایک عام مریض سے پھر اس کا بیٹا بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ واضح تھی۔ اس کے ہاتھوں میں تھامے forceps کانپ رہے تھے۔

''ڈاکٹر امبر پلیز ریپلیس ڈاکٹر رطابہ۔'' ڈاکٹر ثمر نے اسے ایک طرف کرنا چاہا۔

''آئی ایم فائن سر۔'' اس نے ایک گہرا سانس لے خود کو جلد ہی کمپوز کیا۔ تب ہی مانیٹر پہ اس کا پلس ریٹ بحال ہونا شروع ہوا۔

''manual ventilation please'' ڈاکٹر ثمر کے اشارے پہ ایک اسسٹنٹ نے ایک بیگ کی طرح کا تھیلا ہاتھ میں تھام کر پمپ کرنا شروع کیا جس کا مقصد سانس کے عمل کو تیز کرنا تھا۔ اس کے دل نے پھر سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ رطابہ کی جان میں جان آئی۔

سکر لگا کر اندر جمع خون کا اخراج ممکن بنایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ٹانکے لگا کر پھر سے زخم کو بند کیا جا رہا تھا۔ آخری ٹانکوں کو کھینچ کر اس کا سینہ کسی بیگ کی طرح بند کر دیا گیا اور آخری ٹانکے لگائے جانے لگے۔

قریب دس منٹ کے بعد ہی یک دم اذکار کی

سانسیں اکھڑنے لگ گئی تھیں۔

"ہی از سنکنگ۔" ڈاکٹر ثمر نے کارڈیک مانیٹر کو دیکھا جہاں پلس ریٹ یک دم بہت کم ہو گئی تھی۔ اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ رطابہ ساکت ہوئی۔

"سی پی آر۔" ڈاکٹر ثمر نے اسٹاف سے کہا اور ذکی کو سی پی آر دیا جانے لگا۔ اس کا جسم سی پی آر کی وجہ سے ہلتا لیکن پلس ریٹ نہیں بڑھ رہا تھا۔

"ونس مور۔ (ایک دفعہ پھر)" اسے وقفے وقفے سے سی پی آر دیا جا رہا تھا لیکن اس کا پلس ریٹ بہتر ہونے کے بجائے اسی پہ رک گیا۔

رطابہ بس پتھرائی نظروں سے مانیٹر کو دیکھ رہی تھی جہاں زندگی کی لائن سپاٹ ہو گئی تھی اور ایک ٹون کی سپاٹ آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔

قریباً دس منٹ تک اسے وقفے وقفے سے سی پی آر دیا جاتا رہا لیکن لائن ویسی ہی سپاٹ رہی۔ رطابہ کی نظریں مونیٹر اور ذکی کے درمیان گیند کی طرح گھوم رہی تھیں۔

ڈاکٹر ثمر نے دائیں بائیں سر ہلایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو ڈاکٹر امبر پیچھے ہٹ گئی۔

"ہی از ایکسپائر (یہ مر چکا ہے)۔" رطابہ نے بے یقینی سے ڈاکٹر ثمر کو دیکھا۔ پھر اذکار کو۔ پھر سامنے مانیٹر کو۔ سب کچھ جامد تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔

"ذکی۔ ذکی آنکھیں کھولو۔" اس نے اذکار کا ہاتھ تھاما۔ اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ یک دم جیسے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ رطابہ کسی خواب کی صورت اذکار کو دیکھ رہی تھی جو بیڈ پہ پڑا اسے کہہ رہا تھا۔

"کچھ لوگ ہماری زندگی بہتر بنانے کے لیے ہم سے الگ کیے جاتے ہیں ماما۔ اس لیے میں جا رہا ہوں۔ بس آپ سمجھ جائیں کہ میں کیوں جا رہا ہوں۔"

کسی نے پیچھے سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا اور یک دم روشنی غائب ہو گئی۔ رطابہ نے اذکار کو دیکھا جو بالکل ساکت پڑا تھا۔

"ہی از نو مور۔" ڈاکٹر امبر کی مری مری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس نے مجھے بات کی ہے ابھی۔ ذکی! تم کیا کہہ رہے تھے ابھی؟" اس نے اذکار کا بازو ہلایا۔

"ڈاکٹر رطابہ۔ ہی از نو مور۔" ڈاکٹر امبر نے پیچھے سے اسے کندھے سے تھام کر پیچھے کیا۔

"ڈاکٹر ثمر! اس نے ابھی مجھ سے بات کی ہے۔ اس نے مجھ سے اچھا کی بات کی ہے۔ بلیوی ڈاکٹر۔ وہ زندہ ہے۔"

"ہم اسے سی پی آر دے کر دیکھ چکے ہیں ڈاکٹر رطابہ۔ ہی از نو مور۔" ڈاکٹر ثمر نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ ڈاکٹر امبر کو اشارہ کیا جو رطابہ کو زبردستی وہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھیں۔

"اس نے ابھی مجھ سے بات کی ہے ڈاکٹر۔ بالکل ابھی۔" وہ امبر کو پرے دھکیل کر میل اسٹاف کی طرف لپکی جو چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

"تم نے دیکھا نا ابھی۔ دیکھا نا کہ اس نے مجھ سے بات کی ہے؟"

میل اسٹاف نے ترحم بھری نظروں سے رطابہ کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تم نے دیکھا۔ ذکی نے مجھ سے بات کی ہے۔ دیکھا تم نے؟" وہ ایک اور اسٹاف سے ہذیانی انداز میں پوچھ رہی تھی۔ اس نے دکھ سے سر نفی میں ہلا دیا۔

"تم سب کو کیوں نظر نہیں آیا۔ ذکی نے ابھی مجھ سے بات کی ہے۔" وہ چلائی۔

"ڈاکٹر رطابہ۔ اس نے آپ سے بات نہیں کی۔ وہ جا چکا ہے۔ وہ اب کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ آپ ایک ڈاکٹر ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔" ڈاکٹر ثمر نے کچھ سختی سے رطابہ کو شانے سے جھنجوڑا۔ وہ بے یقینی سے ڈاکٹر ثمر کو دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر ثمر کا دل پگھلا۔ وہ اس وقت ایک ماں تھی۔ خدا کی قسم وہ ایک پیارا بیٹا کھو دینے والی ماں تھی جس کی ایسی ہی حالت ہونا تھی۔

"رطابہ۔ذکی از۔نومور۔" وہ بہت نرمی سے ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہے تھے اور رطابہ وہیں سے تیزی سے مڑی، ذکی کا ہاتھ تھام کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

ڈاکٹر ثمر باہر نکل گئے۔اوٹی سے باہر ہی فاطمہ اور دانش سے ان کا سامنا ہوا۔ان کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ دونوں کا دل کانپ گیا تھا۔ انہوں نے دانش کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "آپریشن کے دوران ہی۔" انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیسے جملہ مکمل کریں۔ "he had a cardiac failure..." فاطمہ نے پاس کی دیوار کا سہارا لیا اور خود کو لڑھکنے سے بچایا۔

"مطلب؟" دانش نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہی از ایکسپائرڈ۔"

دانش کھلے منہ سے ڈاکٹر ثمر کی شکل دیکھنے لگا۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے پوری کوشش کی لیکن" ان کا سر جھک گیا۔

"آپ لوگ تو۔آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ عام سی سرجری ہے۔پھر کیسے؟" دانش کے منہ سے بے ربط جملے اور آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہنے لگے۔

"زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" دانش کا کندھا تھپک کر وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ دونوں تیزی سے اوٹی کی طرف بھاگے۔ کسی نے انہیں نہیں روکا۔یہ وقت روکنے کا نہیں تھا۔

اندر رطابہ بے یقین سی اذکار کا ہاتھ تھامے اسے پکار رہی تھی۔

"بولو نا ذکی۔بات کرو مجھ سے۔ تم نے ابھی مجھ سے بات کی تھی نا۔ذکی؟" دانش اور فاطمہ اذکار کو دیکھتے ہی وہیں تھم گئے۔شاکڈ تھا۔بہت بڑا شاکڈ تھا۔ان کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔

"یہ کیسے جا سکتا ہے؟ تم تو کہتی تھیں کہ تم اور ڈاکٹر بیسٹ ڈاکٹرز ہو۔یہ کیا کیا تم لوگوں نے؟" دانش مجنون کی سی کیفیت میں اذکار کا چہرہ ٹٹول کر رطابہ سے کہنے لگا۔

"یہ کہیں نہیں گیا۔اس نے مجھ سے ابھی بات کی ہے۔کوئی یقین نہیں کر رہا۔اس نے مجھ سے بات کی ہے ابھی دانش۔یہ زندہ ہے۔اس کا دل بند نہیں ہوا۔ میں نے اسی لیے کہا تھا کہ مجھے اس کی سرجری کرنے دیں۔میں اپنے بچے کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

"کہاں گیا تمہارا علم اور وہ بڑا ہونے کے دعوے۔؟ تم نے میرا بیٹا مار دیا۔" رطابہ نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دانش کو دیکھا۔

"میں نے مار دیا؟" رطابہ کے ہاتھ سے اذکار کا ہاتھ چھوٹا۔

"ہاں تم نے مارا ہے میرا بیٹا۔ تم نے مارا ہے ذکی کو۔تمہارے بڑے بولوں نے، تمہارے تکبر نے، تمہارے زعم نے۔تمہارے گناہوں نے ہمارا بچہ ہم سے چھین لیا۔تمہارے ناشکرے پن نے رطابہ۔"

"دانش بھائی پلیز۔یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔" روتے ہوئے فاطمہ نے دانش کو کہا۔

"میرا بچہ، میرا معصوم بچہ چلا گیا صرف اس عورت کی وجہ سے۔یہ عورت کہتی تھی کہ آئی ایم بیسٹ ہارٹ سرجن ان دا ٹاؤن۔اور اپنے بچے کو نہیں بچا سکی۔"

رطابہ اپنی جگہ سے اٹھی۔وہ ساکت پتلیوں سے دانش کو دیکھ رہی تھی۔

"میرے بچے کا دل بند ہو گیا۔اسی عورت کے ہاتھوں میرے بچے کا دل بند ہو گیا۔"

وہ الٹے قدم باہر کی طرف بڑھتی گئی۔

"میرا ذکی چلا گیا۔" دانش اب دھاڑیں مار کر اذکار سے لپٹا ہوا تھا۔

وہ مرے قدموں سے دروازے سے باہر نکلی تھی۔چہرے کا ماسک اترا ہوا تھا اور آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ ان ہاتھوں نے پچھلے کئی سالوں میں ہزاروں جسموں کو چیرا تھا، ہزاروں دلوں کی مرمت کی تھی لیکن کبھی کسی ایک کا بھی دل بند نہیں ہوا تھا۔آج انہی ہاتھوں

سے ایک دل بند ہوا تھا اور وہ دل اس کے اپنے بیٹے کا تھا

"لگتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس بات کا ڈر؟"

"یہی کہ میں او۔ٹی سے واپس نہیں آؤں گا۔" اس نے مڑ کر او ٹی کو دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور ذکی اندر رہ گیا تھا۔

اس نے پھر سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

"آپ تو اتنی شیور ہیں جیسے آپ نے میری زندگی کی گارنٹی لے لی ہو۔ ویسے ڈاکٹرز تو علاج کرتے ہیں، زندگی نہیں دیتے۔ اتنی شیورٹی بھی اچھی نہیں ہے۔"

وہ وہیں او ٹی کی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی اور روتے ہوئے یک دم حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔ گھٹن جو بہت بڑھ گئی تھی اسے نکالنا تھا۔ دل تنگ پڑ رہا تھا، اب کیسے ٹھیک ہونا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ دل کی طبیب اپنا دل ٹھیک کرنا نہیں جانتی تھی۔ یہی اس کے علم کی محدودیت تھی۔

"ذکی۔" وہ حلق کے بل چلا رہی تھی۔ کتنی نرسیں اور ڈاکٹرز اس کی طرف بھاگے تھے جو زمین پہ بیٹھی ہوئی چلاتے ہوئے اپنے ہاتھ زمین ہی مار رہی تھی۔ فاطمہ اندر سے روتی ہوئی اس کی چیخیں سن کر باہر نکلی تھی۔

"باجی۔ باجی سنبھالو خود کو۔" وہ روتے ہوئے اس کے سامنے زمین پہ دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں بیسٹ ڈاکٹر ان دا ٹاؤن ہوں۔ میرا بچہ کیسے دل کے بند ہونے سے مر سکتا ہے۔ اس کا دل کیسے بند ہو سکتا ہے؟" وہ ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔ تمام نرسیں اور ڈاکٹرز اس کے گرد جمع تھے۔

"اس کا دل نہیں بند ہو سکتا۔ میرے ہاتھوں کبھی کسی کا دل بند نہیں ہوا۔ میرے بیٹے کا دل کیسے بند ہو سکتا ہے؟ وہ نہیں جا سکتا۔ وہ نہیں مر سکتا۔"

وہ چیخ رہی تھی۔ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔

فاطمہ نے اسے اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اسے پرے دھکیل رہی تھی۔

"اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں مر سکتا۔" وہ اٹھی اور اپنے آفس کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ فاطمہ نے روتے ہوئے گھر فون کر کے بتا دیا۔

☆☆☆

ایمبولنس کرنل نواز سدھو کے گھر کے سامنے رک رہی تھی۔ کالونی کی مسجد میں اعلان کیا جا رہا تھا کرنل نواز سدھو کے پوتے کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایمبولنس سے اترتے اسٹریچر پہ لیٹا وجود دور سے زیور بابا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دیوانہ وار مخالف سمت میں بھاگ پڑے۔

ماتم کی فضا میں بس ایک وجود خاموش تھا اور وہ رطابہ کا تھا۔ وہ ساکت اور پتھرائی نظروں سے بس اذکار کو دیکھتی جاتی تھی۔ کتنوں نے اسے رلانے کی کوشش کی لیکن وہ بس خالی نظروں سے بیٹے کو دیکھتی رہی۔

جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ وہ تب بھی خاموش تھی۔ اس نے اسی خاموشی سے اس پرنور چہرے کو چوما، کئی بار چوما اور اسکے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے الوداع کیا۔

جنازہ گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ بیٹا باپ، دادا، چاچا، ماموں اور نانا کے کاندھوں پہ سوار تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور وہ خالی نظروں سے بس اسے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ ماں کی کوکھ جیسے بھری ہوتی ہے ویسے خالی بھی ہو سکتی ہے۔ اسی سوچ سے اس نے لپک کر اخیا کو خود سے بھینچ لیا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی اکلوتی رہ جانے والی اولاد کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بار بار وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو ذکی کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔ وہ خواب تھا یا خیال۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ کا مرحلہ تھا کہ نہیں۔ اس کی میڈیکل سائنس

میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں تھی کہ کوئی انسان جس کا دل رک گیا ہو وہ کیسے بے ہوشی سے ہوش میں آ کر کلام کر سکتا ہے۔

☆☆☆

"آئینور آنٹی۔ باہر کوئی آپ کو بلا رہا ہے۔" جنازے کے بعد ایک بچے نے آ کر اسے مخاطب کیا۔

"باہر کہاں؟" وہ عابدہ کے ساتھ مہمانوں کو چائے پیش کر رہی تھی۔

"باہر گیٹ پہ کوئی انکل ہیں بلیک شلوار قمیص میں۔"

اس نے چائے عابدہ کے حوالے کی اور تیزی سے باہر کی طرف نکلی۔ گیٹ پہ کوئی کھڑا تھا لیکن اس کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ابھی مرد جنازہ پڑھ کر واپس نہیں لوٹے تھے۔ وہ محتاط سی ہو کر اس تک پہنچی۔

"جی کہیے۔" اجنبی مڑا اور آئینور فاطمہ گل پتھر کی ہو گئی۔ اس کے سامنے سموئیل عباد کھڑا تھا۔

"کیسی ہو؟"

وہ کتنی دیر بے یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی۔

"ٹھ۔ ٹھیک۔ آپ یہاں کیسے؟" بڑی دقت ہوئی اسے ایک جملہ مکمل کرتے۔

"جنازے میں آیا تھا۔ آئی ایم سوری فار اذکار۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟ مطلب آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟" اسے یقین تھا رنجل نے ہی اسے بتایا ہوگا۔

"کیا ہم کچھ دیر کہیں اور جا کر بات کر سکتے ہیں؟"

وہ کچھ دیر گومگو کی کیفیت میں رہی پھر اسے ایک منٹ کہہ کر اندر گئی تا کہ کسی کو بتا سکے کہ وہ کچھ دیر میں آتی ہے۔ وہ باہر آئی تو عباد گیٹ پہ ہی کھڑا تھا۔ دونوں سامنے والے پارک کی طرف خاموشی سے چلتے چلے گئے۔ پارک میں پہنچ کر وہ ایک ہی بینچ کے دو کناروں پہ بیٹھ گئے۔ کتنی دیر خاموشی سے گزر گئے۔ پھر سموئیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ آخر کسی کو تو بات کرنا تھی۔ سو اس نے پہلی کی۔

"میں کرنل سدھو کے پوتے کا جنازہ پڑھنے آیا تھا۔ یہیں سامنے والی لین میں میرا گھر ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہاں تم مجھے مل جاؤ گی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر یاد آیا کہ رنجل نے بتایا تھا کہ تمہارا بھانجا بیمار ہے۔ ان فیکٹ میں ایک بار پہلے بھی آیا تھا تو مجھے اذما نے بتایا تھا کہ اس کا بھائی بیمار ہے اور ہسپتال میں ہے۔ سب وہیں گئے ہیں۔ لیکن میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ تمہارا بھانجا ہوگا......" اس نے وقفہ لیا۔ "میں نے بہت ڈھونڈا ہے تمہیں آئینور۔ اور تم ملی بھی تو اس جگہ۔ اس موقع پہ۔"

"کیوں ڈھونڈا؟"

عباد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ فاطمہ کے سخت تاثرات سے پھیکا پڑا۔

"وہ بابا جی۔ ان کو کھانا تم دیتی تھیں نا۔ ان کے پاس وہ تمہارے ہاتھ کا بنایا کاغذ، وہ دیکھا تھا میں نے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ تمہارا ہی دیا ہوا ہے۔ لیکن وہ کچھ پوچھنے پہ بتاتے ہی نہیں تھے کہ تم کہاں مل سکتی ہو۔"

"بتایا نہیں کیوں ڈھونڈ رہے تھے مجھے؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"تم نے اسپیشلائزیشن کر لیا۔؟" وہ اس کے سوال کو ٹالنا چاہتا تھا۔

"نہیں کیا۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔ "تمہیں تو پیڈز میں جانے کا بہت شوق تھا۔"

"بندے کو علم اتنا حاصل کرنا چاہیے جتنا وہ سنبھال سکے کیوں کہ اکثر عاجزی کم پڑ جاتی ہے اور علم انسان سے سنبھالا نہیں جاتا۔ پھر علم تکبر کے ملاپ سے چھلکنے لگتا ہے۔ ایسے علم سے جہالت بھلی ہے۔" اس کے سامنے اس کی بہن مثال تھی اور وہ ویسا بننے سے ڈرتی تھی۔

"کہاں جاب کرتی ہو؟"

"کیا میرا انٹرویو کرنے کے لیے مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟"

وہ کچھ کھسیا کر اٹھا اور سر نفی میں ہلایا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

وہ نیچے جھکا اور اس کے سامنے گھاس پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ہاتھ ہوا میں بلند کیے اور پھر اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"معافی مانگنے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا۔"

اس کے بندھے ہاتھ دیکھ کر وہ پلکیں تک نہیں جھپک سکی۔ اس کا منہ کھلنے کا کھلا رہ گیا۔

"جو کچھ بھی میں نے کیا اس کی معافی آئینور۔ تم وہ بالکل بھی ڈیزرو نہیں کرتی تھیں جو میں نے کیا، جو میں نے کہا۔ اس کا احساس ابھی نہیں، بہت پہلے سے مجھے تھا لیکن تمہیں کیسے کہتا، کیسے بتاتا۔ تم تو نجانے کہاں چھپ گئی تھیں۔ میں تمہاری پہلے بھی بہت عزت کرتا تھا اور اب اور بھی زیادہ کرتا ہوں۔ جو بھی بکواس کی، دل سے بالکل نہیں کی۔ بس دماغ میں بھر دیا گیا اور میں بکتا چلا گیا۔ انسان ہوں، شیطان کے وار سے نہیں بچ سکا اور ہمزاد (غصے کے شدید حملے) کا شکار ہو گیا۔ اللہ گواہ ہے کہ اگر زمین پھٹ سکتی تو میں اس وقت پشیمانی سے اس میں دھنس چکا ہوتا۔"

آئینور بالکل سانس روکے اسے سن رہی تھی۔ پہلی بار کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنوں پہ گرا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ اس وقت اللہ نے اسے اس کے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے کہ ہر مرد اسے تھوک دیتا ہے۔ ہاں وہ اللہ کی نظر میں ایسی لڑکی تھی جس کے سامنے ایک مرد گھٹنوں کے بل گرا ہوا اس کو عزت کے مقام پہ بٹھا کر اس سے معافی مانگ رہا تھا۔

"میں ایسا کیا کہوں کہ ان الفاظ کا مداوا ہو سکے اور تم میری معافی قبول کر لو۔"

اس کی آنکھوں میں کوئی پانی نہیں تھا لیکن لہجہ گھو گیر تھا۔ اپنی مردانہ انا پہ پیر رکھ کر کسی لڑکی کے سامنے اپنے کیے کی معافی مانگنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور سموئیل عباد نے یہ مشکل ترین کام کر دیا تھا۔ تو کیا ایک مشکل کام آئینور فاطمہ گل نہیں کر سکتی تھی۔ اسے معاف کرنے کا۔ اپنا ظرف بڑا کرنے کا؟

"عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی انسان نہ ہمیں ذلیل کر سکتا ہے نہ ہماری عزت بڑھا سکتا ہے۔ وہ سب میرے مقدر میں تھا اور یہ سب بھی میرے مقدر میں تھا کہ اللہ نے مجھے معتبر کرنا تھا۔ کسی بھی قسم کے مداوے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ کے ظاہر پہ معاملہ کر کے آپ کی بات کا اعتبار کر لیا ہے۔"

عباد نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر آپ کی معافی تلافی ہو گئی ہو تو مجھے اجازت دیں۔ گھر پہ بہت مہمان ہیں۔" آئینور اٹھی۔

"کیا ہم پھر ملیں گے؟" اس وقت اسے روکنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ آئینور نے مڑ کر دیکھا۔

"اللہ نے چاہا تو۔" وہ مضبوط قدم جماتے ہوئے پارک سے نکلتی چلی گئی۔

"اللہ نے یونہی تو تمہیں کہیں اور سے توڑ کر پانچ سال بعد مجھ سے نہیں جوڑا آئینور۔ کچھ تو اس کے ارادے ہیں اور مجھے اس کے ارادوں پہ بڑا یقین ہے۔" وہ اب اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

پچھلے چار مہینے سے وہ بس گھر کے اندر باہر چکر لگاتی رہتی۔ اسے ڈپریشن کا بری طرح دورہ پڑا تھا۔ اس نے ہسپتال جانا چھوڑ دیا تھا۔ ہسپتال والوں نے کتنی ہی بار اسے کالز کیں، ڈاکٹر منصور گھر بھی آئے لیکن اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔

"میں اپنے بچے کو نہیں بچا سکی۔ اب میں کبھی سرجری نہیں کر سکوں گی۔" اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"رطابہ، ہم ڈاکٹرز مریض کا علاج کرتے ہیں، اسے صحت اور زندگی دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ کام

اللہ کے ہیں۔ تم اللہ کے کاموں کا ذمہ خود کیوں اٹھانا چاہتی ہو۔۔؟ تمہیں یہ بات سمجھنا چاہیے کہ وہ اتنی ہی زندگی لکھوا کر لایا تھا۔ تم اسے امریکا بھی لے جاتیں تو بھی اس نے زبردست میڈیکل ٹریٹمنٹ لے کر بھی نہیں بچنا تھا۔"

"میں اب کوئی سرجری نہیں کر سکتی۔ او ٹی میں جاؤں گی تو وہ میرے سامنے آ جائے گا۔ مجھ سے پوچھا گا کہ کیسی ہارٹ سرجن ہوں جو اسے نہیں بچا سکی۔ میں اسے کیا جواب دوں گی؟"

"وہ جا چکا ہے۔" اس نے ڈاکٹر منصور کو دیکھا اور رونے لگی۔

"مگر مجھ سے اس نے بات کی تھی نا وہ ہیں۔ وہ پھر سے مجھ سے بات کرے گا تو میں کیا جواب دوں گی؟" اپنے شعبے کی ذہین ڈاکٹر کو اس حال میں دیکھ کر انہیں افسوس ہوا۔ ڈاکٹر منصور نے جانے سے پہلے دانش سے کہا تھا کہ وہ اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھائے۔ دانش اس معاملے میں بالکل بے حس ہو چکا تھا۔

وہ بے چینی سے گھر کے اندر باہر چکر لگاتی رہتی۔ اس لفافے کو دیکھتی جو فاطمہ نے یہ کہہ کر اسے دیا تھا کہ یہ ذکی نے اسے دینے کو کہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے زیور بابا کو دے اور زیور بابا وہ تو اس دن کے بعد سے اسے کبھی دکھے ہی نہیں۔ وہ بار بار عابدہ سے زیور بابا کا پوچھتی لیکن اسے ایک ہی جواب ملتا۔

"چھوٹی بی بی! وہ ذکی بابا کی وفات والے دن کے بعد سے کہیں چلے گئے ہیں۔ جس کے لیے روز باہر آتے تھے جب وہ چلا گیا تو وہ یہاں آ کر کیا کریں گے۔" عابدہ رونے لگتی اور رطابہ اونچی آواز میں اس سے بھی اونچا اونچا روتی تو عابدہ اس کی ایسی حالت دیکھ کر ڈر جاتی۔ روزانہ وہی منظر ایک خواب کی صورت اس کی نظروں میں گھومتا تھا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ جو بے ہوشی سے ہوش میں آ ہی نہیں سکا تھا اس نے کیسے رطابہ سے بات کی تھی۔ کیا اس نے جاگتے میں خواب دیکھا تھا یا

شاید جب وہ اس سے سرجری سے پہلے ملی تھی یہ باتیں اس نے تب کی تھیں۔ اس کا ذہن صدمے سے دوچار ہو کر سرجری سے پہلے اور بعد کے وقت کا امتیاز بھول کر اسے گڈمڈ کر رہا تھا۔ جو باتیں اس نے پہلے کی تھیں وہ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے سرجری کے بعد کی تھیں۔ جب یاد نہ آتا تو وہ رونے لگتی۔ اپنے دماغ کو کوستی اور سر کے بال نوچتی۔ دانش کو لگتا تھا کہ وہ اس دنیا میں مکافات کا شکار ہو چکی ہے۔

ذکی نے کہا تھا کہ وہ اس کی زندگی سے اس لیے جا رہا ہے تاکہ اس کی زندگی بہتر ہو۔ لیکن اس کی زندگی تو بدتر ہو چکی تھی۔ اس کی تمام ڈگریاں اس کے منہ پہ مار کر اسے اس کی اوقات دکھا دی گئی تھی۔ سارا تکبر، تعلم مٹی ہو گیا تھا۔ اس کا ذہین ترین ذہن بیمار ہو چکا تھا۔

اس دن وہ عجب بے چینی کا شکار کالونی سے باہر نکل گئی تاکہ زیور بابا کو ڈھونڈ سکے۔ ذکی نے کہا تھا کہ اسے زیور بابا سے معافی مانگنا چاہیے کیوں کہ اس نے ان کے ساتھ برا کیا ہے۔ ذہن میں ایک سوال ابھرتا تھا کیا اسے زیور بابا کی ہائے لگی ہے۔ کالونی سے بہت دور اسے فٹ پاتھ پہ بیٹھے ایک بزرگ پہ زیور بابا کا گمان ہوا تھا۔ وہ ان کی طرف لپکی۔ قریب جانے پہ پتا چلا کہ وہ زیور بابا نہیں تھے۔ وہ وہیں قریب میں بیٹھ کر رونے لگی۔

"بیٹا: کیوں رو رہی ہو۔؟" بابا اٹھ کر اس کے پاس آئے۔

"میرا بیٹا مر گیا۔ میری نوکری ختم ہو گئی۔ میں دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سکون ختم ہو گیا زندگی سے۔ ہر نعمت تھی زندگی میں، اب جیسے کچھ بھی نہیں رہا۔" وہ روتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی یوں بلک بلک کر نہیں روتی تھی، اسے تو لوگوں کو رلانے میں کمال حاصل تھا اور جب سے ذکی گیا تھا وہ بات بات پہ ایسے ہی روتی تھی۔

"نعمت ہمیشہ ہی تو نہیں رہتی ہے بیٹا۔ نعمتوں

کا زوال بھی ہوتا ہے۔ دن لوگوں کے درمیان اللہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی تنگی کبھی خوش حالی۔ کبھی صحت کبھی بیماری۔ انسان زندگی میں امتحان کے لیے آیا ہے بیٹا ۔بس ہر انسان کا امتحان فرق ہے۔ ہر انسان کا جہاد فرق ہے لیکن حالت امتحان میں ہر کوئی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا لیکن تمہیں اس سے سیکھنا ہوگا۔ "اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور مڑنے لگے۔

"مجھے کسی کی بد دعا لگی ہے۔ کسی کے ساتھ بہت برا کیا تھا میں نے۔"

"کسی کے ساتھ زیادتی کا احساس ہے تو اللہ کے بندے سے معافی مانگ لو۔ اللہ معاف کر دے گا ۔"

"اللہ کا بندہ ہی تو کھو گیا ہے۔" وہ سر ہاتھوں پہ گرا کر رونے لگی۔

"اس کی طرف سے صدقہ کر دو۔ دل اللہ صاف کر دے گا۔" رطابہ نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر وہی لفافہ انہیں دینا چاہا جو اس کے موبائل کے کور میں تھا۔

"میں بھکاری نہیں ہوں بیٹا۔ یونہی راہ میں بیٹھ جاتا ہوں۔ اللہ کے بندوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا ہوں۔ جاؤ بیٹا، اور اللہ سے معافی مانگ کر زندگی کو پھر سے شروع کرو۔ بس اللہ کے بندے کا دل نہ توڑنا۔ دل میں تو اللہ بستا ہے، اسے توڑا نہیں کرتے ۔" رطابہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ ہسپتال سے نکلی تو پارکنگ میں ہی سموئیل اسے اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا دکھائی دیا ۔آئینور کو دیکھتے ہی اس نے ہاتھ ہلایا۔ وہ اس کی طرف چلی آئی۔

"کافی دیر سے ویٹ کر رہا تھا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ تم یہاں جاب کرتی ہو۔ جب تمہیں ڈھونڈ لیا تو ہسپتال ڈھونڈنا کچھ مشکل نہیں تھا۔"

آئینور نے دل میں آیا سوال دبا دیا۔

"کہیں چلیں؟" آئینور نے سر نفی میں ہلایا۔ عباد کو یہی امید تھی کہ وہ منع کر دے گی۔ وہ مسکرا دیا۔

"میں یہیں بات کر لیتا ہوں۔ نو پرابلم۔ کیا گاڑی میں بھی نہیں بیٹھ سکتے؟" آئینور نے ہونٹ پھیلا کر سر پھر سے نفی میں ہلایا۔ سموئیل پھر مسکرا دیا ۔وہ ویسی کی ویسی ہی تھی۔

"اٹس اوکے۔ میں یہیں کھڑے ہو کر بات کر لوں گا۔ ویسے شاید ہی کسی لڑکے نے کبھی کسی لڑکی کو ہسپتال کی کار پارکنگ میں پروپوز کیا ہوگا۔" آخری جملہ اس نے کان کھجاتے ہوئے ذرا ہولے سے کہا تھا لیکن اتنا اونچا ضرور کہا تھا کہ وہ سن سکے۔

"عباد! اس سے پہلے آپ کچھ کہیں میں یہ کلیئر کر دینا چاہتی ہوں کہ میں ایک لوئر مڈل کلاس فیملی سے ہوں۔ ہمارا کوئی کمپیریزن نہیں ہے۔ آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے لیے بہت محنت کی ہے۔ میں آپ سب کی طرح سونے کا نوالا لے کر پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے بہت سفر کیا ہے تب اس جگہ پہنچی ہوں......"

"کیا میں نے آپ کا بائیو ڈیٹا یا فیملی بیک گراؤنڈ؟" اس نے آئینور کی بات کاٹ دی۔ "آئینور! اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ یہ جان کر کہ تم ایک سیلف میڈ لڑکی ہو مجھے برا لگے گا تو ایسا کچھ نہیں ہے ۔تمہارے ان ہاتھوں کو دیکھ کر میں جانتا تھا کہ تم نے زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ تمہارے بتائے بنا بھی اتنا جانتا تھا میں تمہیں آئینور۔ تمہاری یہی خودی اور وقار ہے جو تمہیں دوسروں سے الگ کرتا ہے۔ تب ہی تو اتنے عرصے جھک مارتا رہا لیکن ایک بھی تم جیسی نہیں ملی اور نہ ہی کبھی ملے گی۔ آئینور فاطمہ گل تو بس ایک ہی ہے۔" اس کے منہ سے یہ سب سن کر آئینور سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

"کیا آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا نکاح ہوا تھا اور پھر......" اس نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"ہاں۔ یہ جانتے ہوئے بھی۔ سب جانتے

ہوئے بھی تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ تم جیسی اور کوئی مل نہیں سکی۔"

وہ کتنی دیر خاموش کھڑی رہی تو اسے پھر سے پوچھنا پڑا۔

"کچھ کہو گی نہیں؟"

وہ بہت کنفیوز ہو چکی تھی۔ اس سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ رکھتی تھی جسے وہ بھانپ گیا۔

"جواب کے بنا جانے نہیں دوں گا۔" وہ اس کے سامنے رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوئیل کو ایک نظر دیکھا اور پھر نظر پھیر لی۔

"کیا مجھے ساری زندگی عباد ہی کہنا ہوگا یا سوئیل کہنے کی اجازت ہوگی؟" وہ اس کے پیارے سے، انوکھے سے اقرار پہ ہنس دیا۔

"سوئیل کہو، عباد کہو یا کچھ کہو۔ جو بھی کہو قبول ہے۔ بس تم مجھے قبول کر لو۔"

وہ کھل کر مسکرا دیا تو وہ جھینپ گئی اور تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ آگے بڑھتی ہوئی آئینور کے چہرے پہ بھی ایک عرصے بعد ایک پیاری سی مسکان تھی۔

☆☆☆

اور کچھ دل جو پتھر ہوا کرتے ہیں جب زلزلے آئیں تو وہ لڑھک کر گر جاتے ہیں اور شق ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسا دل رطابہ کا تھا۔

ایک بار وہ گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے اس سڑک پہ اس بھکارن سے ٹکرائی تھی اور چپکے سے اس کے پاس وہ لفافہ چھوڑ گئی تھی جو ذکی نے زیور بابا کے لیے چھوڑا تھا۔ آج وہ اسے زیور بابا کی طرف سے ایک صدقے کا لفافہ دینے آئی تھی۔ ایسا لفافہ وہ ہر مہینے زیور بابا کی طرف سے دیتی تھی کہ شاید اس ایک نیکی سے وہ جہاں کہیں بھی ہوں، اس کی طرف سے دل صاف کر چکے ہوں، اسے معاف کر چکے ہوں کہ دل کو اللہ پھیرتا ہے اور اللہ اس کی نیت جانتے تھے۔

"اس دن بھی تم تھیں نا جو یہ رکھ کر گئی تھی؟"

بھکارن نے لفافہ دیکھ کر اس سے پوچھا تو رطابہ نے سر ہلا دیا۔

"آپ اتنی اچھی انگلش کیسے بولتی ہیں؟ پڑھی لکھی ہیں؟"

"کالج میں پڑھاتی تھی۔ ۲۰۰۵ کے زلزلے میں سب ختم ہو گیا۔ یہ ہاتھ معذور ہو گیا تو کام کاج کرنے سے بھی گئی۔ ذہن بھی کام کرنا چھوڑ گیا۔ گھر بار، خاندان سب ختم ہو گیا تو یونہی بے سہارا بچے گود لے لیے کہ ایک نیا خاندان بنا لوں۔ اب یہاں وہاں گھومتی ہوں۔ کام مل جائے تو کر لیتی ہوں۔ کوئی کچھ دے دے تو اللہ کا لاکھ شکر کرتی ہوں۔ پہلے اتنا کچھ تھا تو شکر بھی نہیں کیا۔ اب سب چھن گیا تو قدر آ گئی کہ کیا کچھ تھا میرے پاس جواب نہ رہا۔ اب قدر آ گئی ہے۔ قدر آ گئی ہے تو سوچتی ہوں نعمتیں بھی پھر سے آ ہی جائیں گی۔" وہ ساتھ ساتھ بھنے دانے کھا رہی تھی۔ اس دن اس کے ساتھ بچے نہیں تھے۔

"انسان کو بس ہر حال میں اللہ کا شکر گزار بننا چاہیے کیوں کہ یہ جو بھی بہاریں ہیں یہ اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ ہمارا کوئی کمال نہیں۔ وہ چاہے تو چھین لے اور چاہے تو نواز دے۔ انسان کی اوقات ایک ٹکے کی بھی نہیں ہے۔" رطابہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

زندگی کی حقیقتیں انسان کو اکثر ان لوگوں سے سیکھنے کو ملتی ہیں جن کے پاس بڑی ڈگریاں نہیں ہوتیں، جسم پہ اعلا لباس بھی نہیں ہوتا لیکن انہوں نے زندگی سے جنگ کی ہوتی ہے اور اسی جنگ میں بہت کچھ پایا ہوتا ہے۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ میرے لیے بھی دعا کیجیے گا کہ میں بھی یہ گر سیکھ سکوں۔ میں بھی سپاس گزار بن سکوں۔"

اپنی آنکھوں کی نمی ٹشو سے پونچھ کر وہ سامنے دکان میں چلی گئی۔ اسے اذما کے لیے بہت کچھ لے کر گھر جانا تھا۔ کل سے اسے ہسپتال واپس جانا تھا اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا تھا۔

☆☆

نیہا ملک

نکتہ چینی

نفاست سے صاف کیے گئے کچن پر آخری نظر ڈال کر اس نے شیلف پر رکھا چائے کا کپ اٹھایا اور لائٹ بند کر کے لاؤنج میں داخل ہوا جہاں اس کے والد رحیم صاحب اخبار کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ چائے کا کپ رحیم صاحب کے پاس رکھی ٹیبل پر رکھ کر وہ سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

رحیم صاحب نے اخبار سے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا جہاں وہ دنیا جہاں کی مسکینیت چہرے پر سجائے بیٹھا انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

کیوں برخوردار ایسی گندی شکل کیوں بنائی ہوئی ہے؟

رحیم صاحب نے اخبار لپیٹ کر میز پر رکھا اور چائے کا کپ اٹھا کر وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے جہاں چہرے کے زاویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''آج کچن صاف کرنے کی باری سعد کی تھی، لیکن وہ ذلیل آدمی اپنے ٹیسٹ کا بہانہ کر کے کمرا لاک کر کے بیٹھ گیا اور میں اپنے آفس کا اتنا ضروری کام چھوڑ کر زنانی بن کر پورا کچن صاف کر کے آیا ہوں۔'' حماد نے غصے سے اپنی دکھ بھری داستان رحیم صاحب کے گوش گزار کی۔

''اللہ بخشے تمہاری ماں کو۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی تو سارا گھر اسی نے سنبھالا ہوا ہوتا۔ بڑا سلیقہ تھا تمہاری ماں میں۔ پورا خاندان تمہاری ماں کے سلیقے کی تعریفیں کرتا نہیں تھکتا تھا۔ خیر تم لوگ بھی کچھ کم نہیں ہو سلیقے مندی میں۔ اس دن تمہاری پھپھو بھی کہہ گئی تھیں کہ'' ارے او رحیم، آج کل کی لڑکیوں سے زیادہ سلیقہ تو تمہارے لڑکوں میں ہے۔''

اپنی بیوی کو یاد کرتے رحیم صاحب نے آنکھ میں آئے آنسوؤں کو رومال سے صاف کیا۔

''بس ابا، اب بہت ہوا۔ آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔ میں اور سعد مزید اب گھر میں عورتوں والی زندگی نہیں گزار سکتے۔ بھائی جان خود تو صبح کے نکلے رات میں گھر آتے ہیں، پیچھے میں اور سعد ہی رہ جاتے ہیں سارے کام کرنے کے لیے۔ اس لیے اس گھر میں کسی عورت کا ہونا لازم و ملزوم ہو گیا ہے۔ یا تو آپ بھائی جان کی شادی کروا دیں یا خود کر لیں۔ اگر یہ دونوں کام نہیں ہو سکتے تو میں خود شادی کر کے کسی کو لے آتا ہوں۔'' حماد آج آر یا پار کرنے کا فیصلہ کر میدان میں اترا تھا۔

''استغفر اللہ! شرم نہیں آتی تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے اس عمر میں میں شادی کرتا ہوا اچھا لگوں گا کیا......! اور جہاں تک بات ہے تمہاری تو پتر جی، تم سے بڑا تمہارا بھائی احد بیٹھا ہوا ہے اس لیے اپنا نام اس شادی والی لسٹ سے تو تم خارج ہی سمجھو۔ اور میں تو خود چاہتا ہوں کہ اب احد کی شادی ہو جائے تاکہ ہمارے گھر میں بھی کچھ رونق آئے لیکن وہ نافرمان سنے تو تب نا......!'' رحیم صاحب کی شکل پر بھی بے چارگی در آئی تھی۔

''بہت افسوس ہوا۔ اللہ جنت میں جگہ دے بہت ہی اچھے انسان تھے ویسے۔''

لاؤنج میں داخل ہوتے احد نے بلند آواز میں کہا اور حماد کے برابر میں گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔

"کس کی بات کر رہے ہیں بھائی؟"

اوپر ریلنگ سے نیچے جھانکتے سعد نے پوچھا اور سعد کو دیکھ کر حماد نے دانت پیسے۔

"یہ بات تو میں خود ان دونوں سے پوچھنے والا تھا۔ ایسی افسردہ شکل بنائے بیٹھے ہیں تو میں سمجھا کوئی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔"

احد نے سعد کو جواب دیتے ساتھ انہیں دیکھا جواب غصے سے اسے گھور رہے تھے۔

"ایسی نافرمان اولاد کے پیدا ہونے پر انسان عموماً افسردہ ہی پایا جاتا ہے پتر جی۔ اور بہت مان لی تمہاری بات اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ ورنہ ہم لے جا رہے ہیں خالہ شمیم کی بیٹی کے لیے تمہارا رشتہ۔

"شمیم خالہ کی بیٹی رخسانہ..... انہیں ابا، ہم آپ کو یہ ظلم ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔ قسم سے پچھلی مرتبہ جب میں ان کے گھر گیا تھا تو میرا بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ صوفے کے کشن کچھ زمین پر اور کچھ صوفے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ناشتے کے گندے برتن سنک میں پڑے اپنی قسمت پر رو رہے تھے اور وہ صاحبزادی منہ پر ماسک لگائے بدروح بن کر پورے گھر میں گھوم رہی تھیں۔"

رحیم صاحب کی بات کاٹ کر حماد چیخ ہی تو پڑا تھا لیکن پھر ان کی پڑنے والی تیز گھوری نے اس کے چلتے منہ کو لگام لگائی تھی۔

"احد پتر! اٹھائیس کے ہونے والے ہو تم۔ تمہارے پیچھے میرے دو اور صاحب زادے بھی امیدوار بن کر لائن میں کھڑے ہیں۔"

رحیم صاحب کی بات سن کر احد ہاتھ صوفے کی پشت پر پھیلا تا پر سوچ انداز میں چھت کو دیکھنے لگا اور سب کی پر امید نظریں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔

"میرے آفس میں میری ایک کولیگ ہے رانیہ۔ میں ایک دو دن میں اس کا پتا دے دوں گا۔ آپ لوگ اس کے گھر جا کر رشتہ کی بات کر آیئے گا۔ اگر وہ لوگ راضی ہو گئے تو ٹھیک ورنہ جہاں آپ کو مناسب لگے وہاں میری شادی کر دیجیے گا۔"

احد بات مکمل کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور پیچھے ان تینوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ رحیم صاحب بھی اپنے کمرے میں چلے گئے



تھے۔ حماد چائے کا کپ اٹھا کر کچن میں جا رہا تھا جب سعد نے اوپر سے ہانک لگائی۔

"بھائی جان! وہ اس کونے میں تھوڑی مٹی نظر آ رہی ہے اگر ہو سکے تو ذرا جھاڑو لگا دیجیے گا۔"

سعد کی بات حماد کے سر پر لگی اور تلووں پر بجھی۔ پیر سے جوتی اتار کر اس نے کھینچ کر سعد کی جانب پھینکی۔ لیکن بھلا ہو اس کی قسمت کا کہ وہ بروقت اپنے کمرے میں گھس گیا اور حماد اس کو کوستا ہوا کچن میں چلا گیا۔

☆☆☆

پھر ٹھیک دو روز بعد ہی حماد صاحب اپنے صاحبزادوں کے ساتھ احد کا رشتہ رانیہ کے گھر لے کر چلے گئے تھے۔ احد جیسا قابل اور شریف انسان رانیہ کے والدین کو اپنی بیٹی کے لیے بہت پسند آیا تھا۔ پھر کیا تھا چٹ منگنی اور پٹ شادی والا معاملہ ہوا مختصر یہ کہ کل رات رانیہ احد کی بیوی، رحیم صاحب کی بہو اور حماد اور سعد کی بھابھی بن کر گھر میں آ چکی تھی۔

آج حماد اور سعد جلدی اٹھ کر کچن میں سب گھر والوں کے لیے ناشتا تیار کر رہے تھے۔ حماد کٹنگ بورڈ پر نفاست سے پیاز کاٹ رہا تھا اور سعد ملک شیک کے لیے پھلوں کو دھو رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے جب رانیہ بھی کچن میں داخل ہو ہوگئی۔

"ناشتا بنا رہے ہیں آپ دونوں؟ لائیں میں بھی آپ لوگوں کی مدد کر دیتی ہوں!"

"نہیں بھابھی! آپ رہنے دیں ہم کر لیں گے۔ آج آپ کا پہلا دن ہے سسرال میں۔ بعد میں تو پھر آپ نے ہی سنبھالنا ہے یہ گھر۔" حماد نے سہولت سے انکار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ دونوں کو ایسے کام کرتے دیکھ مجھے اچھا نہیں لگ رہا اس لیے تھوڑی بہت مدد کروا دیتی ہوں۔"

ان دونوں کے نہ نہ کرنے پر بھی رانیہ نے زبردستی چھری اور پیاز حماد سے چھین لیے تھے۔ حماد دونوں چیزیں رانیہ کے حوالے کرتا چولہے پر چائے کا پانی رکھنے لگا۔ چینی اور پتی ڈال کر وہ جیسے ہی مڑا تو حیران رہ گیا۔

سامنے ہی رانیہ کٹنگ بورڈ پر بڑی ہی بے دردی سے پیاز کو کاٹ کم اور اس کا قتل زیادہ کر رہی تھی۔ اور اطراف میں چھلکے بکھرے ہوئے تھے جو حماد جیسے نفاست پسند انسان کی طبیعت پر کافی گراں گزرے تھے۔

اس نے سعد کا کندھا ہلا کر رانیہ کی جانب متوجہ کیا۔ جواب چھوٹے بڑے سائز میں کاٹی گئی پیاز کا جائزہ لے رہی تھی۔

سعد جلدی سے جا کر چھلکے سمیٹنے لگا جو تھوڑے زمین پر بھی گرے ہوئے تھے۔

"بھابھی! آپ نے کھانا بنانا کہاں سے سیکھا، آنٹی سے یا خود ہی اپنی کوشش سے؟"

چھلکے سمیٹنے کے ساتھ ہی بدتمیزی نکال کر سعد نے پوچھا اور اس کے سوال کا مقصد حماد اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"مجھے بھی ٹائم ہی نہیں ملا پراپر کھانا بنانا سیکھنے کا۔ پہلے کالج پھر یونیورسٹی پھر جاب ابھی...... چکروں کی وجہ سے بھی فرصت ہی نہ ملی۔ لیکن پھر بھی اتوار کے اتوار امی زبردستی کچن میں کھینچ لیتی تھیں اس لیے اب تو کافی کچھ بنا لیتی ہوں۔" مسکراتے ہوئے بتاتے ساتھ ہی رانیہ اب دوسرے پیاز کو حلال کر رہی تھی۔

"بھابھی! اسے تھوڑا باریک اور ایک جیسے سائز میں کاٹیے۔"

نا چاہتے ہوئے بھی حماد کی دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ پکنے کے بعد تو یہ ایک جیسے ہی ہو جائیں گے دیور جی۔"

رانیہ کی بات سن کر حماد نے زبردستی اپنے ہونٹوں کو کھینچ کر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر رانیہ کے ارے ارے کرنے کے باوجود انہوں نے اسے کچن سے نکال کر ہی دم لیا اور سکون کا سانس لیتے دونوں دوبارہ سے ناشتا بنانے میں مصروف ہو

گئے تھے (نفاست کے ساتھ)۔

☆☆☆

رانیہ اور احد کی شادی کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور آج سے گھر کے کاموں کی ذمہ داری رانیہ کو دے دی گئی تھی جسے بہت ہی خوش اسلوبی سے اس نے قبول کی تھی۔ ابھی بھی وہ کچن میں سب کے لیے چائے بنا رہی تھی اور باقی سب لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"یہ لیجیے گرما گرم چائے حاضر ہے۔"

رانیہ نے مسکرا کر کہتے چائے کی ٹرے ٹیبل پر لا کر رکھی لیکن کپ میں سے ذرا سی چائے چھلک کر ٹیبل پر گر گئی جسے فوراً ہی حماد نے ٹشو باکس سے دو تین ٹشو نکال کر صاف کیا اور پھر انہیں پھینک کر سکون سے بیٹھا۔ اس کی یہ حرکت رانیہ نے اچنبے سے دیکھی لیکن بولی کچھ نہیں۔

لیکن کچھ ہی دنوں میں رانیہ کو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اس کو دونوں دیوروں میں نکتہ چینی کی عادت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

حماد آفس سے آ کر لاؤنج میں کی گئی صفائی پر ایک تنقیدی نظر لازمی ڈالتا، اگر کسی کونے میں ذرا سی بھی دھول بھی نظر آ جاتی تو وہ یا تو خود فوراً صاف کر دیتا یا رانیہ کو بول دیتا اور وہ صبر کے گھونٹ بھر کر رہ جاتی۔

کچن میں کام کرتے وقت اگر وہ کوئی چیز اٹھا کر اسے واپس اس کی جگہ پر رکھنے کے بجائے کسی اور جگہ پر رکھ دیتی تو سعد فوراً ٹوک دیتا۔

غرض یہ کہ شادی کے تین ہفتوں بعد ہی وہ روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھی اور ان دونوں کی رحیم صاحب کے ہاتھوں عدالت لگ چکی تھی۔

☆☆☆

"تم دونوں گدھوں میں نا جانے کب عقل آئے گی۔ ماں اور بہن کے نہ ہونے کے نتیجے میں تم دونوں تو عورتوں سے بھی دو ہاتھ آگے چلے گئے ہو۔ اللہ کی پناہ، وہ بے چاری بچی کیا سوچتی ہوگی کہ دیوروں کی شکلوں میں اسے ساس اور نند مل گئی ہیں۔ اپنی یہ نکتہ چینی والی عادت اب ختم کر دو۔ احد گیا ہے رانیہ بیٹی کو لینے وہ آئے تو تم دونوں نے معافی مانگنی ہے اس سے اور آئندہ اگر تم دونوں کی طرف سے کوئی شکایت آئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

حماد صاحب کی باتوں نے انہیں اچھا خاصا شرمندہ کر دیا تھا اور دونوں گردنیں جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

ابھی حماد صاحب مزید کچھ کہتے کہ احد رانیہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

"معافی مانگوں نالائقوں!"

حماد صاحب کے کہنے کی دیر تھی کہ دونوں بھابھی کہتے ہوئے رانیہ کی طرف بڑھ گئے اور اس سے معافی مانگنے لگے۔

رانیہ کو شروع سے ہی اپنے یہ دونوں دیور بہت پسند تھے لیکن بس وہ ان کی اس نکتہ چینی والی عادت سے نالاں رہتی تھی۔ ان کی معافی مانگنے کی دیر تھی کہ اس نے خوش دلی سے دونوں کو معاف کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن حماد پانی پینے کے لیے کچن میں داخل ہوا تو سامنے ہی رانیہ کام کرتی نظر آئی۔

"بھابھی! کیا بنا رہی ہیں آپ؟" پانی کا گلاس بھرتے ہوئے حماد نے سوال کیا۔

"احد کے لیے ملک شیک بنا رہی ہوں۔ تم بھی پیو گے؟" رانیہ نے سیب کے چھلکے اتارتے ہوئے جواب کے ساتھ سوال بھی کر لیا۔

"جی میرے لیے بھی بنا دیں اور بھابھی یہ چھلکے ہاتھ کے ہاتھ پھینک دیں۔"

حماد نے فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈسٹ بن رانیہ کے قریب رکھ دیا لیکن رانیہ کی پڑنے والی گھوری پر وہ خجل ہو گیا تھا۔

"اب تھوڑا ٹائم تو لگے گا نا عادت بدلنے میں۔"

وہ منمنا کر رہ گیا اور اس کی منمناہٹ سن کر رانیہ نے مسکراہٹ دبائی اور اپنے ملک شیک کی جانب متوجہ ہو گئی۔

☆☆

سفیعہ مرزا

تیری باندی کی سنائیں تیری بانہیں شاہا

سورج سفر کرتا کرتا ہریالی سے لہلہاتی بستی کے قرب وجوار میں آرہا تھا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنی کچی سڑک کے آخری دہانے پر شان وشوکت سے قائم سفید رنگ کی عمارت، جو شاہ فیملی کے فارم ہاؤس کی حیثیت سے جانی جاتی تھی کی کھڑکیوں پر کرنوں نے دستک دینا شروع کردی تھی۔ مرغ کی بانگ اب چڑیوں کی چہچہاہٹ میں بدل گئی تھی۔

یہ فارم ہاؤس کا بیڈ روم تھا۔ جس کی کھڑکیوں پر پڑنے والی کرنیں اندر سے آتی سسکیاں سن رہی تھیں۔

وہ نسوانی سسکیاں ابھرتی اور ڈوبتی رہی تھیں۔ اندرونی منظر سے قطع نظر بیرونی منظر اتنا ہی آباد اور چمک دار تھا جتنا کہ اندرونی منظر ویران۔

سورج فارم ہاؤس کو مکمل طور پر چمکانے لگا۔ صبح ہو رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ بنگلے کے وسیع وعریض لان میں رفاقت شاہ سفید کلف زدہ سوٹ میں ٹھاٹھ سے بیٹھے تھے۔ دائیں طرف گن مین چوکنا تھا۔ حق نواز اور رب نواز دونوں سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں ان کے



فرماں برداری خادمین تھے۔ ملازم چائے کے کپ لیے حاضر ہوا اور کپ ٹیبل پر چن کر رخصت ہو گیا۔

"بس انتظامات کچھ ایسے ہوں کہ اواب شاہ یہاں آکر خوش ہو جائے ۔ اس کا جی باغ باغ ہو جائے اپنے بابا کی شہرت کا سن کر۔" وہ چائے کی چسکی لگا کر بولے۔ ان کے وجود میں سفید کلف زدہ سوٹ سے زیادہ کلف لگی ہوئی تھی۔

"جی سائیں! آپ فکر ہی نہ کرو۔" حق نواز نے مودبانہ کہا۔

"جو حکم سرکار کا۔" رب نواز نے بھی چاپلوسی کی۔

"ہاہاہا......" فخر و غرور سے قہقہہ لگا کر رفاقت

ناولٹ



شاہ بقیہ چائے حلق میں اتارنے لگے۔

"سائیں! اواب بابو کو یقین ہی نہیں آئے گا کہ یہ وہ ہی گاؤں ہے جسے وہ چھ سال پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔" حق نواز نے کہا۔

"سائیں! میں تو کہتا ہوں وہ جو پرائمری اسکول بند پڑا ہے نا اس کی عمارت کا حلیہ بدل کر وہاں استانیاں بلوا کے کلاسیں کھول دی جائیں۔ اواب بابو بہت خوش ہوں گے کہ گاؤں کی بچیاں تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں۔" رب نواز نے حق نواز سے سبقت لے جانے کی کوشش میں آئیڈیا پیش کیا۔

"ہاں رب نواز! بات تو تو نے سولہ آنے ٹھیک کہی۔" رقابت شاہ متاثر ہونے لگے۔

"سائیں! سوچ کیا رہے ہیں؟ حکم کریں غلام کو۔" رب نواز بولا۔

"تو پھر دیر کیسی، تم آج ہی شہر جاؤ اور ای ڈی او صاحب سے پتا کرو کہ اسکول کا اسٹاف حاضری پر کیوں نہیں آرہا؟"

"جو حکم سائیں کا۔" سینے پر ہاتھ رکھے اس نے ادب سے کہا ہے۔

"ڈرائیور کو ساتھ لے جانا۔ بسوں ویگنوں میں کھپنا نہیں پڑے گا۔" وہ سخاوت سے بولے۔

☆☆☆

"نوری! اے نوری۔" زلیخا نوراں کے اوپر سے کمبل کھینچ کر بولی۔ "اری اٹھ کمبخت۔ دیکھ دن کتنا چڑھ آیا ہے۔ ری نوری!"

زلیخا صحن میں بچھی چارپائی پر سے بستر اکٹھے کر رہی تھی۔ ایک دوسری چارپائی پر سترہ سالہ بیٹی نوراں سو رہی تھی۔ وہ اپنی لمبی چٹیا گردن پر لپیٹے سورج کی کرنوں سے بے خبر گہری نیند میں تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا اور اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چٹیا سے نکلے کچھ بالوں نے اس کے ماتھے پر گھونسلہ سا بنا رکھا تھا۔ دودھیا بدن پر میلا کچیلا لباس زیب تن تھا۔

"ارے سوئی رہنے دے بے چاری کو۔ تھک جاتی ہے کام کاج سے۔" مرید دین دودھ کی بالٹیاں لیے اندر داخل ہوا۔

"بک گیا دودھ؟" زلیخا نے کمبل کاندھے پر دھر کر کمرے کی جانب جاتے پوچھا۔

"ہاں بھئی...... سارے کا سارا۔" وہ بان کی ٹوٹی چارپائی پر سوئی نوراں کے قریب بیٹھ کر نقدی گننے لگا۔

"تو پھر مجھے کچھ روپے دے چھوڑ۔ میں اپنی دھی کے لیے بازار سے جوڑا خرید لاؤں گی۔" وہ بھی پاس آبیٹھی تھی۔

"ری نوری! اٹھ جا، کیا دن چڑھ آیا ہے۔ کام پر بھی جانا ہے۔ اور پھانی (صفائی) بھی کرنے والی پڑی ہے گھر کی۔" وہ پھر سے نوراں کی طرف متوجہ ہوئی۔

نوراں آنکھیں ملتی ہوئی جمائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ پاس بیٹھے مرید دین کو دیکھ کر وہ جلدی سے سر پر دوپٹا اوڑھنے لگی۔

"میری دھی رانی!" مرید دین نے اسے پچکارا۔

"ابا! لسی لاؤں تمہارے لیے؟" وہ ادب سے دیہاتی لہجے میں بولی۔ مرید دین نے سر ہلایا تھا۔ نوراں صحن کے کنارے پر بنے چھپر کے نیچے کچن سے لسی لینے اٹھی۔

☆☆☆

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ شاہ بنگلے پر پھیکی ہوتی شام کی دھوپ پھیلی تھی۔ لاؤنج میں آمنہ بیگم دیوان پر براجمان تھی۔ زلیخاں آمنہ بیگم کے کندھے دبا رہی تھی۔ ان کے ہاتھ تسبیح پھیر رہے تھے۔ نوراں جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

"زلیخا! آج کام ختم کر کے تو میرے پاس آنا۔ تجھے اواب شاہ کے کمرے کی چابیاں دوں گی اس کے کمرے کی اچھی طرح صفائی کر دینا۔ دیکھنا کہیں کوئی گرد نظر نہ آئے کمرے میں۔"

"جی اچھا بی بی جی!" زلیخاں نے آمنہ بیگم کو مودبانہ جواب دیا۔

"بی بی جی! چند لمحے توقف کے بعد زلیخا پھر بولی۔

"بول؟" آمنہ بیگم تسبیح میں مگن تھیں۔

"آج ہی آنا ہے اواب سائیں نے؟" زلیخا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ بس یہ سمجھو کہ آج کل میں ہی جب اسے چھٹی مل گئی وہ فوراً آجائے گا۔" وہ محبت سے بیٹے کا تذکرہ کرنے لگیں۔

"کتنے بدل گئے ہوں گے جی...... جب وہ گئے تھے جی، مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے، آپ کتنا روئی تھیں۔" وہ ماضی دہرا رہی تھی۔

"ہاں دیکھ لو چھ سات سال پر لگا کر اڑ گئے۔ ادھر وہ بھی ہم سب کی جدائی میں دن گن گن کر کاٹ رہا ہے۔ ادھر ہم بے حال ہو رہے ہیں۔ اس کے بابا تو اتنے فکر مند ہیں اس کے بارے میں کہ بس اسے گاؤں کا ماحول پسند آجائے۔ کہیں کوئی گندگی نہ ہو۔ امریکا والے بہت صفائی رکھتے ہیں نا۔"

"بی بی جی! امریکا میں بھی پنڈ ہوتے ہیں کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ارے پگلی! ہوتے ہی ہوں گے میں بھلا گئی ہوں کیا؟ ایسا کر تو جا کے لسی بنا لا میرے لیے۔"

وہ اس کی باتوں سے اکتا کر ہنستے ہوئے بولیں۔

☆☆☆

زلیخا اور نوراں اواب شاہ کا بیڈ روم صاف کر رہی تھیں نوراں سفید ماربل کے فرش پر لیٹ کر پوچا لگا رہی تھی۔ دوپٹا اس نے جسم پر اچھی طرح اوڑھا ہوا تھا۔ زلیخاں کھڑکیوں کے شیشے جھاڑ رہی تھی۔

"بہت اچھا بچہ ہے ان کا۔" زلیخا اواب شاہ کو سراہنے لگی۔

"اے اماں! تجھے کچھ جیادہ (زیادہ) ہی بھا گیا۔ سویرے تو اس کے گیت گا رہی ہے۔" نوراں چڑ کر بولی۔

"ری نوری! جو اچھا ہو سب اس کے گیت گاتے ہیں۔ تو جھاڑو لگا باہر سے میں دیکھوں کوئی برتن تو نی دھونے والا۔"

وہ کہتے ہوئے باہر چلی گئی تھی۔ نوراں کمرے کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ شاہانہ انداز میں سیٹ کیا ہوا کمرا وہ بہت رشک سے دیکھ رہی تھی۔

کمرا صاف کرنے کے بعد وہ اواب شاہ کی اسٹڈی کی طرف آگئی تھی۔ زلیخا برتن دھو کر اس کے ساتھ لگ گئی۔ زلیخا نے دیواریں صاف کیں اور نوراں کتابوں کی الماریاں جھاڑنے لگی۔

"اماں...... یہ انگریجی (انگریزی) لکھی ہے؟"

"میں تو جیسے سولہ جماعتیں پڑھی ہوں۔ مجھے کیا کھبر۔ بڑا پڑھا کو ہے اواب سائیں، ولایت بھی پڑھنے گیا ہے۔ یہ اسی کی کتابیں ہیں۔ رکھ دے...... خراب نہ کر۔"

زلیخا نے تنبیہ کی۔ وہ ہنوز صفحے پلٹ رہی تھی۔

"کتنا مشکل ہوگا نا پڑھنا۔ ادھر پنڈ میں تو کوئی کڑی نی پڑھتی۔" کتاب دیکھتے وہ اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔

"اے...... کیا کر رہی ہے؟ رکھ ادھر اس کو۔" پیچھے سے فائق شاہ مونچھوں کو تاؤ دیتے کاٹن کے شلوار قمیص میں، سیاہ چپل پاؤں میں گھسیٹتا اندر آیا تھا۔

نوراں یکدم گھبرا گئی تھی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے جلدی سے کتاب اٹھا کر واپس رکھی تھی اور جھاڑ پونچھ شروع کر دی۔ وہ خوف سے کانپ بھی رہی تھی۔ فائق شاہ کی نظریں اس کے کپکپاتے وجود پر بھٹک رہی تھیں۔

"اے...... تو کیا کر رہی ہے؟ سردائی بنوا کے لا میرے لیے۔" اس نے زلیخا کو حاکمانہ انداز میں کمرے سے نکالا۔ نوراں مزید خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"کیا کر رہی ہے؟" وہ اس کے نسبتاً قریب

آتے بولا۔ اپنے رعب کی وجہ سے وہ گھبرائی ہوئی نوراں کو دیکھ کر اور محظوظ ہوا۔

''وہ جی...... صفائی (صفائی) کر رہی تھی۔''

''پیلا رنگ بڑا پسند ہے تجھے؟'' وہ چند قدم مزید آگے بڑھا اور اس کے سوٹ کا جائزہ لے کر بولا۔

''جی...... نہیں جی!'' وہ کانپ رہی تھی۔ اور کام تیزی سے نپٹا رہی تھی تاکہ باہر جا سکے۔

''آٹھ دن سے یہی جوڑا پہنا ہے اس لیے کہہ رہا ہوں سورج مکھی!'' وہ اس کے دامن کے کنارے کو چھو کر بولا، وہ گھبرا کر دور ہٹی۔ اتنے میں زلیخا سردائی لے آئی۔

''لیں صاحب جی!''

''بڑی تیز گام گڈی ہے تو، پانچ منٹ میں سردائی لے آئی۔'' وہ گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

زلیخا چند لمحے انتظار کے بعد گلاس پاس ٹیبل پر رکھ کر نوراں کو چلنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئی۔ نوراں بھی تیزی سے اس کی اوٹ میں باہر آ گئی تھی۔ وہ گلاس ہونٹوں سے لگائے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

رفاقت شاہ رب نواز اور حق نواز کے ہمراہ اسکول کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسکول کی عمارت کافی بوسیدہ اور خستہ تھی۔ اس کے مین گیٹ سے کتے اندر آ جا رہے تھے۔ اطراف میں کھیت تھے۔

وہ تینوں گاؤں کی ٹوٹی سڑک پر کھڑی جیپ کے قریب کھڑے تبصرہ کر رہے تھے۔

''ہاں! بس ٹھیک ہے۔ کل سے کلاسیں شروع کرواؤ۔ بچیوں کو آمادہ کرو۔ کچھ عورتوں کو کے گھروں میں بھیجو تاکہ وہ انہیں بچیوں کی پڑھائی پر آمادہ کریں۔''

''جی سائیں۔ جیسے آپ کا حکم۔'' حق نواز نے تائید کی۔

''سائیں! تنخواہ وغیرہ کا حساب کتاب؟'' رب نواز نے پوچھا۔

''ہاں ہاں...... جب تک گورنمنٹ اسکول کے متعلق بات نہیں بنتی تب تک تنخواہیں میں خود بھروں گا۔ آخر اواب شاہ کے لیے کچھ نہ کچھ تو خرچ کرنا پڑے گا نا۔ میرا ہونہار پتر۔'' وہ گردن کو مزید اکڑا کر بولے۔

''جی سائیں بے شک۔'' دونوں چیلوں نے چاپلوسی کی۔

''تو کل شہر جا کر ای ڈی او صاحب سے پھر مل۔'' بتا کر کیوں معاملہ لٹکایا ہوا ہے۔ وہ کہہ کر سگریٹ کے کش لگانے لگے۔ ''مجھے بھی کل شہر جانا ہے۔ رب نواز کل آ رہا ہے۔''

دوسرے دن پوری حویلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اواب شاہ پڑھائی مکمل کر کے اپنے ملک میں واپس آ رہا تھا۔

''جب میرا اواب شاہ اس زمین پر قدم رکھے تو اس کے بازو پر یہ تعویذ باندھ دیجیے گا۔ اللہ اسے اپنے امان میں رکھے۔''

آمنہ بیگم نے تعویذ چوم کر رفاقت شاہ کی طرف بڑھایا۔ جو اس وقت اواب شاہ کو لینے ایئرپورٹ شہر جا رہے تھے۔

''آمنہ بیگم فکر مت کرو۔ سب خیر ہو گی۔ مٹھائی کا آرڈر دیا ہے ہمارے آنے سے پہلے پورے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کروا دینا۔'' رفاقت شاہ بہت مسرور لگ رہے تھے۔

''آپ تو کل دوپہر کو ہی واپس آئیں گے نا؟''

''ہاں ظاہر ہے رات ایک بجے کی فلائٹ ہے۔'' وہ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھتے تھے۔

''خیر سے جایئے خیر سے آیئے۔'' وہ گاڑی کی طرف دیکھنے لگیں۔

رفاقت شاہ ڈرائیور اور گن مین کے ہمراہ گیٹ سے نکل چکے تھے۔ گاڑی دھول اڑاتی شہر کی جانب

روانہ ہوگئی۔ چوکیدار نے شاہ بنگلے کا قد آور سیاہ آہنی گیٹ بند کردیا تھا۔ آمنہ بیگم آنکھیں چندھیاتی دھوپ میں روش پر چلتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھیں۔

☆☆☆

"چلے گئے بابا سائیں؟" فائق شاہ نے آئینے کے آگے اپنا روپ دیکھتے ہوئے بالوں میں معمول سے زیادہ تیل گھساتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چلے گئے۔" آمنہ بیگم لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈرائیور کو بھیج دیتے۔ خود کیوں اتنے تردد میں پڑے، آنا تو اس نے گھر ہی تھا نا۔" وہ دیہاتی لہجے میں اپنے اکھڑ مزاج سے بولا۔

"ارے، میرا تو اپنا بس نہیں چلتا اڑ کے ایئرپورٹ پہنچ جاؤں۔ رات ایک بجے جب وہ اس پاک سرزمین پر قدم رکھے تو اس کی ڈھیروں بلائیں لوں۔" وہ محبت سے کہہ رہی تھیں۔

"لے...... اماں تو بھی کھسکی ہوئی ہے، بابا سائیں کی طرح۔" وہ طنزیہ کہتا بالوں کی لٹیں ماتھے پر بکھیر کر باہر نکل گیا۔

آمنہ بیگم اس کی گستاخیوں پر ہمیشہ کی طرح سر جھٹک کر اداب کو یاد کرنے لگ گئیں۔

"بی بی جی...... اب ہم کو جانا ہے جی...... سارا کام کھتم (ختم) ہوگیا۔ صفائی بھی۔ کپڑے بھی...... برتن بھی۔" زلیخا تندہی سے انہیں بتا کر جانے کی تیاری میں تھی۔ نوراں بھی سہمی سی اس کے دائیں طرف کھڑی تھی۔

آمنہ بیگم لان کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے چائے پی رہی تھیں۔

"چلو ٹھیک ہے جاؤ۔"

وہ دونوں ماں بیٹی لان سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ کی طرف جارہی تھیں۔ مغرب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔

گیٹ کے بغلی دروازے سے زلیخا نے قدم باہر رکھا تو فائق شاہ نوراں کے سامنے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم گیٹ کے اندر رکھتا نوراں تیزی سے زلیخا کا پیچھا کرتی سہمی ہوئی باہر نکلی اور اس کے پیچھے تیز تیز چلتی گئی۔

☆☆☆

آج تو بہت تھک گئی میں نوری! گھر جا کے میرے کو دبا کے سونا۔" وہ دیہاتی لہجے میں گفتگو کرتی جارہی تھیں۔

"تیرے کو کس نے کہا تھا آج ای کام عبیر؟" نوراں لاپروا انداز میں اپنی لمبے پراندے کی چٹیا کو گھماتی جارہی تھی۔

"ری پگلی...... آمنہ بی بی کو کھوس (خوش) بھی کرنا تھا ناں...... اداب سائیں کی کھاطر (خاطر) وہ چاہتی تھیں گھر تاروں طرح چمکے۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے وضاحت کر کے بولی۔

"امریکا میں بہت صفائی ہوگی نا......" نوراں نے تصور میں امریکا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"رات کو آجائے گا نا ان کا پتر؟" وہ دونوں کھیت کے قریب سے اپنے گھر کو جانے والی پگڈنڈی پر ہولیں۔

"ہاں آجائے گا۔" زلیخا نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا۔

اتنے میں عقب سے ان پر کئی چار آنکھیں کھیتوں سے نکل کر ان کے سامنے آگئیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔

"ہائے میں مرگئی۔"

"اماں!"

زلیخا اور نوراں بیک وقت چیخیں۔

اتنے میں جیپ تیزی سے بریک لگاتے رکی۔ دو گن بردار نے نوراں، زلیخا کو جیپ کی پچھلی سیٹوں پر پھینکا اور چھلانگ لگا کر اگلی سیٹوں پر سوار ہوتے جیپ بھگا لے گئے۔ نوراں اور زلیخا کی چیخ و پکار ہوائی فائرنگ میں دب گئی تھی کہیں۔

پھر ان دونوں تینوں نے نوراں اور زلیخا کو

فارم ہاؤس پھینکا تھا۔ ان کے ہاتھ پیچھے کو باندھ دیے گئے تھے، وہ بے چارگی سے بندھے منہ کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ہاتھ پاؤں چھڑوانے کی کوشش میں تھیں کہ اتنے میں گن مین نوراں کو بالوں سے گھسیٹتا باہر لے گیا۔ دونوں پھٹی ہوئی آنکھوں اور پھنسی ہوئی چیخ وپکار سے ایک دوسرے کو دور جاتا دیکھ رہی تھیں۔

نوراں کو جس کمرے میں لے جایا گیا تھا وہاں ہر چیز پیلی معلوم ہوتی تھی کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی ماسوائے کینڈل اسٹینڈ پر لگی موم بتیوں کے جو بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا تھے۔

فائق شاہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ہولے ہولے اس کے بندھے ہاتھ کھولے پھر پاؤں کی رسی کھولی تھی نوراں نے ہاتھ کھلتے ہی اپنے جسم کو ڈھانپنا چاہا تھا۔ نوراں کی دودھیا رنگت فائق شاہ کے اندر کے وحشی کو بری طرح جگا رہی تھی۔

صبح جب ہوئی تو تھی۔ فارم ہاؤس کے بیڈ روم کی کھڑکی سے صبح کی سفید روشنی اندر آرہی تھی۔ بیڈ کی پائنتی سے لگی نوراں کارپٹ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی خاموشی کی فضا اس کی سسکیوں کو سن رہی تھی۔

☆☆☆

آدھی رات ہونے کو آئی تھی مرید دین جلے پاؤں کی مانند صحن کے چکر کر کاٹ رہا تھا۔ سناٹا تھا چاروں اور۔

"جانے کدھر پھنس گئی ہیں یہ ماں بیٹی، آدھی رات ہوتی ہے اور گھر نی پہنچی۔" وہ خود کلامی کر رہا تھا۔

آسمان پر تیزی سے جہاز کے گرنے کی آواز نے اسے چونکایا۔

"ہوسکتا ہے اواب سائیں کے آنے کی وجہ سے کم جیادہ ہو تو پھضول میں فکر کرتا ہے مریدا!" جہاز نے اس کا دھیان دوسری طرف لگا دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مطمئن کرتا۔ چارپائی پر لیٹ گیا اور جانے کس وقت نیند نے اسے آگھیرا۔

صبح مرید دین کے کچے صحن میں دھوپ کی کرنیں پھیلیں تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ پاؤں میں جوتا گھسیٹتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر قریب کی خالی چارپائیوں پر پڑی۔

"ارے...... ابھی تک نی آئیں جلیخاں اور نوری؟" وہ خود کلامی کرتے ہوئے تیزی سے جوتا پہنتے ہوئے پریشان ہو کر دروازے کی طرف لپکا۔

☆☆☆

شاہ بنگلے میں آج پر رونق دوپہر تھی۔ لنچ ہو رہا تھا۔ سب فیملی ممبرز خوش گوار موڈ میں کھانا کھا رہے تھے۔

"اواب! سوہنے پتر! یہ کھیر تو لونا میں نے خود بنائی ہے تیرے لیے۔" آمنہ بیگم کھیر اواب کی طرف بڑھا کر بولیں۔

"اونو...... اٹس نو ہیوی، آئی ڈونٹ لائک اٹ۔" وہ کھیر کو دیکھ کر بولا۔

"پتر! ہمیں انگریزی کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی کر کے سنا دیا کر، بھئی، ہم سب تو امریکا سے نہیں آئے نا۔" رفاقت شاہ نے لاڈ سے کہا۔

"یہ بھی کوئی شاہ جدی پشتی امریکی تو نہیں ہے ادھر سے ہی گیا ہے نا!" فائق نے اسے خاطر میں نہ لانے والے انداز میں رفاقت شاہ سے کہا۔ اواب خاموش ہو گیا۔

"اماں جان! پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ مجھے کھیر پسند نہیں ہے۔" اس نے پھر سے آمنہ بیگم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تمہیں جو کھانا ہو بتا دینا میں تمہارے کھانے کے لیے وہی کچھ بنوا دیا کروں گی خاص طور پر۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔

اتنے میں مرید دین ہانپتا ہوا اندر آیا۔ وہ بہت پریشان دکھ رہا تھا۔

"بیگم صایا (صاحبہ)! وہ...... وہ...... جلیخا اور

نوراں ابھی تک گھر نئی (نہیں) آئی......ان کو چھٹی نی ملی کیا؟" وہ دیہاتی انداز میں آمنہ بیگم سے مخاطب تھا۔

"مریددین...... وہ...... وہ تو شاید چھٹی کر گئی تھیں۔" آمنہ بیگم نے تشویش سے جواب دیا۔

"پر...... بیگم صاب...... گھر نی آئیں وہ...... کدھر چلی گئیں۔" وہ با آواز بلند گویا تھا۔ اواب شاہ نے اس کے خستہ حلیے کو سر تا پا دیکھا۔

مریددین کی آواز بلند ہوتی دیکھ کر فائق شاہ اپنی کرسی پیچھے دھکیلتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تھا۔ سب کی نظریں فائق شاہ پر تھیں۔

"تجھے تمیز نہیں ہے گھر کے اندر آنے کی؟ دفع ہو جا باہر۔" اس نے مریددین کو گریبان سے کھینچ کر بچا۔

"جو بات ہے جا کے ملازموں سے پوچھ لو باہر۔" رفاقت شاہ نے فائق شاہ کے غصے کو دیکھتے ہوئے مریددن کو باہر جانے کو کہا۔

مریدین کے چہرے پر فائق شاہ کی بے عزتی سے زیادہ نوراں اور زلیخا کی فکر جھلک رہی تھی۔ وہ ہاتھ باندھے سیدھا ہوا تھا۔

"جا دفع ہو باہر۔" فائق پھر سے دھاڑا۔

مریددن آنکھوں میں آنسو لیے باہر نکلا تھا۔

گھر پہنچا تو نوراں اور زلیخا گھر لوٹ چکی تھیں۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر کیا ستم ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

"عجت واپس دو...... انصاف دو۔"

"نہیں تو بنگلے کو آگ لگا دیں گے۔"

"مریددین اپنی دھی کے ساتھ جل مرے گا۔"

چند آوازیں کھڑکی کے اس پار ہجوم بتا رہی تھیں۔ گیارہ بج رہے تھے صبح کے چڑھتے سورج نے اواب شاہ کو بیدار نہیں کیا تھا۔ مگر اس ہجوم اور ہنگامے نے اس کی نیند توڑ دی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ مگر شور و غل کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کچھ دیر بعد باہر سے ہونے والے پتھراؤ سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ چند کرچیاں اواب کے سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کے ارد گرد گری تھیں۔ وہ پریشانی سے اٹھ گیا۔

"یہ شور کیسا ہے اماں جان؟" وہ ٹراؤزر شرٹ میں آنکھیں ملتا ہوا لاؤنج میں اترنے والی سیڑھیوں سے آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں بیٹا...... بس وہ...... یونہی گاؤں کے لوگوں کو شوق چڑھا ہے ہنگامے کا۔" وہ معاملہ چھپانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ہنگامہ...... لیکن کیوں؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نوراں کی عجت سارے گاؤں کی عجت ہے۔" باہر سے ایک اور آواز ان دونوں کے کانوں میں پڑی تھی۔ اواب نے آمنہ بیگم کو دیکھا۔ انہوں نے نظریں چرالیں۔

"بس یونہی جب تک ان کے جائز ناجائز مطالبات پورے ہوتے ہیں یہ خوش ہیں ورنہ...... یہی کچھ کرتے ہیں۔ تمہارے لیے ناشتا لگواتی ہوں۔ تم نہا دھو لو۔" آمنہ بیگم کہتے ہوئے کچن میں جانے لگیں۔

اواب انہیں دیکھتا رہا اور باہر سے آنے والی آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"بند کرو یہ ظلم۔"

"مزارعے کی عجت پورے گاؤں کی عجت ہے۔"

☆☆☆

شاہ بنگلے میں ڈنر ہو رہا تھا۔

"بابا جان! یہ مریددینؒ والے معاملے کا نوٹس لیا آپ نے؟" اواب شاہ نے چاول پلیٹ میں نکالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے سوال پر میز پر بیٹھے تمام لوگوں کو چپ لگ گئی تھی۔

"ہاں...... ہاں مجھے معلوم ہے۔ ارے بابا لے لوں گا۔ نوٹس ووٹس بھی۔ تم بتاؤ تمہیں گاؤں کیسا لگا؟ خوش ہوئے اپنے بابا کی ترقی دیکھ کر؟" رفاقت

شاہ نے موضوع بدلا۔

وہ آج اسے تمام گاؤں میں کی گئی نام نہاد تبدیلیاں دکھا کر لوٹے تھے۔ جو خاص اس کی آمد سے قبل کی گئی تھیں۔ پورا خاندان اواب شاہ کی ذہانت سے متاثر تھا۔ سب اس امریکی بابو کا بے صبری سے انتظار کررہے تھے اور رفاقت شاہ کی گردن میں کلف مزید بھر گیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اواب شاہ کو گاؤں میں کوئی کمی بیشی نظر آئے۔

جی...... جی بالکل...... اگر یہی صورت حال رہی تو گاؤں بہت جلد ترقی کرجائے گا۔ بابا جان...... مجھے تو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی کنویں اور اسکول...... تھکی ہوئی فصلیں...... اور تو اور صحت کا جدید مرکز آپ نے کمال کردیا بابا جان۔" رفاقت شاہ اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

"بابا جان تو ہمیشہ ہی اعلا رہے ہیں۔" فائق شاہ نے چپاتی کا نوالہ بناتے ہوئے خوشامد کی۔

رفاقت شاہ نے جاگیردارانہ قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆☆

"میں تو جیتے جی مارا گیا صاب...... ماڑی عجت لقمے بنا بنا کے کھا گیا وہ شاہوں کا پتر...... گریب جندگی بھی کوئی جندگی ہے۔"

مرید دین آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ زلیخا بھی سسک رہی تھی۔

اواب شاہ ابھی اس منظر کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا جب وہ مرید دین کا دروازہ کھٹکھٹا تھا نوراں دروازے کے پاس تھی۔ مرید دین نے دروازہ کھولا تو اواب شاہ پر نظر پڑتے ہی وہ چیختی چلاتی کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

اواب شاہ آنکھوں سے سن گلاسز اتارتے ہوئے اجازت طلب کرکے اندر داخل ہوا تھا۔ نوراں کی ہذیانی کیفیت کو وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس ذہنی کرائسز سے گزر رہی ہوگی۔ اس سے زیادہ اسے شاک معاملہ جان کر لگا تھا۔ کہ فائق شاہ اس کی غیر موجودگی میں کیا گل کھلا رہا تھا۔ اور گھر والے سب جاننے کے باوجود بھی اس پر پردہ پوشی کررہے تھے۔ اور کوئی مرید دین کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ حالانکہ وہ تو بنگلے کا بہت پرانا ملازم تھا۔ جبکہ بابا جان تو بہت انصاف پسند آدمی تھے۔ وہ تو گاؤں والوں سے بہت مخلص تھے۔ وہ تو حقوق کی فراہمی کے لیے دن رات کوشاں تھے۔ اور اماں جان...... وہ بھی اصل معاملہ نہیں بتارہی تھیں۔ بابا کے تمام ملازمین اواب شاہ سے معاملہ چھپا رہے تھے کیوں؟ کیا وہ سب اواب پر فائق شاہ کی حقیقت نہیں کھولنا چاہتے تھے؟ مگر فائق شاہ سے اتنی ہمدردی کیوں؟ اتنے بڑے گناہ اور ظلم کے باوجود؟ اماں جان تو صوم صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ وہ بھی فائق شاہ سے نالاں نہیں تھیں۔ شاہ بنگلے کے لوگوں کے لیے تو جیسے یہ معاملہ...... یہ معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

"صاب! اس دن سے نوراں کی بری حالت ہے صاب...... نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ بکھار میں تپ رہی ہے۔"

اواب نے ٹوٹے پھوٹے مکان کے اس بوسیدہ کمرے کو دیکھا جہاں سے نوراں کے کپکپانے کی آوازیں بخوبی سنا رہی دے رہے تھیں۔ وہ بان کی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھا مرید دین کی دادرسی کررہا تھا۔

"یہ کچھ رقم لو مرید دین...... تمہاری بیٹی کے علاج کے کام آئے گی۔" اس نے نوٹوں کو اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"نہ صاب...... نہ، مارے کو عجت کا سودا نہیں چاہیے صاب۔ مارے کو انصاپھ (انصاف) چاہیے صاب!" مرید دین اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا تھا۔

"ارے نہیں مرید دین...... میں کوئی سودا نہیں کررہا۔ یہ تو صرف تمہاری بیٹی کے علاج معالجے کے لیے ہیں۔"

وہ شرمندگی سے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور اس کے بندھے ہاتھوں کو تھام لیا۔ زلیخا

پھٹی آنکھوں سے اتنے سارے پیسوں کو دیکھ رہی تھی۔

"صاب! علاج کرا کے کیا کریں گے؟" بھلا ہے کہ ہم سب کو موت آجائے۔ انصاپھ تو نہیں ملنے کا۔"

"ارے نہیں نہیں ...... تم فکر مت کرو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا اور تمہارے لیے جو ہو سکا کروں گا۔ بابا جان سے بات کروں گا وہ یقیناً میری بات دھیان سے سنیں گے۔ یو ڈونٹ وری۔" وہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ اس کی گاڑی زناٹے سے نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔

اور گاڑی کی آواز نوراں کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ خوف سے پھر چیخنے چلانے لگی تھی۔ اسے فائق کے آدمیوں کے اغوا کا منظر یاد آنے لگا تھا۔ وہ پھر سے بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ زلیخا اسے نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

"بابا جان! پہلے گاؤں کی بیٹیوں کو عزت تو دے لیجیے پھر جوان کا بنیادی حق ہے پھر تعلیم بھی دے لیجیے گا۔"

رات کے کھانے کا وقت تھا اور اواب کی باتوں نے شاہ فیملی کے تمام ممبرز کو چپ سی لگا دی تھی۔ بابا جان مسلسل حال ہی میں کھولے جانے والے پرائمری اسکول کی تمہید باندھے جا رہے تھے۔

"دیکھو اواب پتر! یہ ہمارا اور گاؤں والوں کا مسئلہ ہے۔ تمہیں اس معاملے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" رفاقت شاہ نے دوٹوک انداز میں ہاتھ کھڑا کیا۔

"تو دو مہینے کی چھٹی پر آیا ہے۔ چھٹی گزار اور جا ولایت۔ تجھے کیا معلوم کہ ان کمی کمینوں سے کیسے نپٹنا ہے۔" فائق شاہ بھی اپنے فطری اجڈ لہجے میں نخوت سے بولا۔

"فائق! تم نے گناہ کیا ہے، ظلم کیا ہے۔ اور اس پر ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ تمہیں نوراں سے شادی کر لینی چاہیے۔" وہ اس کے رویے پر مزید شاکڈ تھا۔

اواب شاہ کے آخری جملے پر آمنہ بیگم کے حلق سے "ہائے" برآمد ہوئی تھی۔ فائق شاہ بل کھا کر رہ گیا تھا اور رفاقت شاہ، وہ تو تقریباً کرسی سے اچھلنے کو تھے۔

"تیرا دماغ تو ٹھیک ہے کیا؟ بڑا آیا گاؤں والوں کا حمایتی۔ ارے! یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔ تیرا کیا خیال ہے؟ جو کمی کمین اٹھ کر زیادتی کا دعویٰ کرے گا۔ اس کی بیٹی کو ہم شاہ بنگلے کی بہو بنا کر لے آئیں گے؟ ارے وہ فائق شاہ ہے...... شاہ بنگلے کا لاڈلا، سید ہے، کسی سیدانی سے شادی کرے گا۔ کمیوں کی لڑکی سے نہیں۔" رفاقت شاہ اواب پر برس رہے تھے۔

فائق شاہ نے اپنے سفید کاٹن کے کلف زدہ سوٹ کے کالر کو ذرا مزید تاؤ دیا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے اواب کے تیوروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ آمنہ بیگم نے ماحول کی ناخوشگواری کے علاج کے طور پر آیۃ الکرسی کا ورد زیر لب شروع کر دیا تھا۔ رات کا کھانا سب کو منہ چڑھا رہا تھا۔

"بابا جان! اگر یہ سید زادہ کمی کمین کی لڑکی سے رات کے اندھیرے میں ناجائز تعلق قائم کرنا ٹھیک سمجھتا ہے تو پھر دن کی روشنی میں جائز نکاح کرنا ٹھیک کیوں نہیں سمجھتا؟ آپ سب لوگوں سے مجھے اس طرح کے ظلم و زیادتی کی امید نہیں تھی۔" اواب اپنی سعادت مند، نیک فطرت کے باعث برہم تھا۔

"اور ہمیں بھی تم سے یوں فضول مطالبات کی امید نہیں تھی۔ یہ پڑھنے گئے تھے تم امریکا؟ کتنی زمینیں بیچ دیں تیری تعلیم کی خاطر اور یہ علم سیکھ کے آیا ہے تو کہ ماں باپ کو سکھانے چلا ہے کہ زندگی کے فیصلے کیا سوچ کر کرنے ہیں؟" رفاقت شاہ باپ ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ اواب شاہ قدرے پرسکون تھا۔

"ہاں بابا جان! تعلیم نے مجھے یہی سکھایا ہے

کہ سب برابر ہیں سید غیر سید سب...... کمی کمین بھی۔ اور برائی کا معیار بس تقویٰ ہے میرے نزدیک۔ مریدین آپ سب سے زیادہ عزت دار ہے جو اپنی عزت کی خاطر آپ جیسے طاقت ور شخص سے ٹکر لے رہا ہے۔ اور افسوس ہے کہ آپ جیسے سیدوں کی سوچ کتنی چھوٹی ہے بابا جان!" وہ شرمندگی سے نظریں جھکا کر بولا آخر سامنے باپ کا وجود تھا۔

"لعنت ہے بھئی، ایسی تعلیم پر جسے حاصل کرنے کے بعد تو اپنے خاندان کی، سیدوں کی لٹیا ڈبو رہا ہے۔" وہ پلیٹ میں چمچہ پٹخ کر اٹھ گئے تھے۔

"اگر یہ آپ کے نزدیک لٹیا ہے بابا جان، تو پھر ایسی لٹیا کو ڈبو ہی دینا چاہیے۔" وہ حقیقت پسندی کی آخری منزل پر تھا۔ ان کو جاتا دیکھ کر اس نے سابقہ اطمینان سے کہا۔

آمنہ بیگم بھی حیرت سے اواب پر ایک خفا سی نظر ڈال کر رفاقت شاہ کے غصے کو ٹھنڈا کرنے ان کے پیچھے گئیں۔ پیچھے بچ جانے والا فائق شاہ بھی کرسی کو ٹھڈا مارتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

"ہاؤ اسٹرینج" اواب کو حیرت اور پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ وہ اصول کی بات کر رہا تھا۔ حق کی بات کر رہا تھا اور سب اسے گناہ گار ٹھہرا کر اٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

"صاب! اس کی تو دو مہینے سے یہ حالت ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے، باہر کوئی گڈی گزر جائے تو ڈر کے مارے چیختی ہے۔ بکھار (بخاری) میں تپ رہی ہے آج بھی...... آدھی آدھی رات کو ڈر کے مارے اٹھ جاتی ہے۔ بین کرنے لگتی ہے۔" مریدین روتے ہوئے بیٹی کی حالت بتا رہا تھا۔

"کل تمہارے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی؟" اواب شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں صاب...... کوئی ادھا گھنٹہ ہوتی رہی تھی۔ عجت تو گئی جناب، اب جان باقی رہ گئی ہے۔ ایسی جندگی سے تو بہتر ہے رفاقت سائیں ہمارے سینوں میں گولیاں مروا دے۔" اس کے بوڑھے چہرے کی جھریوں پر آنسو پھیلنے لگے۔

"صاب! میری دھی مرجائے گی" زلیخا بھی ہاتھ جوڑے اس کے قدموں کے پاس آ بیٹھی تھی۔ اواب شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح سے ان کے دکھ کا مداوا کرے۔ بابا جان اس کی آخری امید تھے مگر اب تو گھر کے ہر فرد نے اس معاملے کی اہمیت سے انکار کر دیا تھا۔

"سائیں...... اللہ کا واسطہ ہے ہماری مدد کرو سائیں!" زلیخا سسک رہی تھی۔

"آپ لوگ فکر مت کریں۔ مریدین، میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ مجھے کچھ سوچنے کے لیے وقت چاہیے، مگر ڈر ہے کہ کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ تمہارے گھر پر ہونے والی فائرنگ اسی بات کا اشارہ ہے تم خوف زدہ ہو جاؤ۔ نہیں تو...... بابا......" وہ کچھ تذبذب کے عالم میں بولتے بولتے رک گیا تھا۔

"تو...... تو کیا ہوگا صاب جی؟" مریدین مزید فکر مند ہوا تھا۔

اواب نے چند لمحے اس کے کچے ٹوٹے پھوٹے مکان کو دیکھا پھر مریدین اور زلیخا کے چہروں کو...... اور پھر اندر سے آتی نوراں کی سسکیوں کو سنا وہ رفاقت شاہ کے ارادوں سے خوب واقف تھا۔

☆☆☆

اواب شاہ بنگلے کی ٹیرس پر ٹہل رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی سوچوں پر سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سوچوں کے در وا تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کے موبائل کی بیل نے اس کی سوچوں کے تانے بانے کو ادھیڑا۔ کمرے میں آ کر اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہائے! کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں مگر تم...... تم کہاں غائب ہو نہ فون اٹینڈ کرتے ہو نہ آن لائن آ رہے ہو۔" مشعل

کی آواز میں پریشانی تھی۔
"بس کچھ بزی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"مگر اتنی زیادہ مصروفیت خیر تو ہے؟ کہیں شادی تو نہیں کروانے لگ گئے؟"
"مشعل پلیز......ڈونٹ بی سلی۔" وہ چڑ گیا۔
"تو پھر کہاں گم ہو؟" وہ سنجیدہ ہوئی۔
"سنو! میں تم سے کچھ دیر بعد بات کرتا ہوں۔" اواب نے جیسے پریشانی میں کال منقطع کر دی تھی۔
مشعل یونیورسٹی فیلو تھی۔ جسے وہ امریکا میں اپنا انتظار سونپ کر آیا تھا۔ مگر پاکستان میں ایسا الجھا تھا کہ مشعل اور امریکا سب محو ہو گئے تھے۔ وہ اس وقت اتنا پریشان تھا کہ مشعل سے بات نہ کرنے میں عافیت تھی۔

☆☆☆

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا سوچ کر تم نے یہ فیصلہ کیا ہے؟" رفاقت شاہ آمنہ بیگم کے ہمراہ اس پر برس رہے تھے۔ وہ لان کی کرسیوں پر شام کی چائے کے لیے آ بیٹھا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں اس کے سر پر سوار تھے۔ اواب سے سنا ہوا فیصلہ آمنہ بیگم نے رفاقت شاہ کے گوش گزار کر دیا تھا۔ وہ سنتے ہی سیخ پا ہو گئے تھے اواب کو ان کے ایسے ہی رد عمل کی امید تھی۔ وہ اطمینان سے چائے کے سپ لینے لگا۔
"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" اس کے اطمینان پر انہوں نے مدعا دہرایا۔
"مرید دین اور اس کے گھر والوں کا بھلا سوچ کر۔" اس نے تیز ہوا سے لہراتے لان کے درختوں کو تکا۔
"تم ہوش میں تو ہو اواب شاہ؟"
"بابا! مرید دین اور اس کی بیٹی پورے گاؤں میں بدنام ہو چکے ہیں جس کے قصوروار ہم ہیں کیونکہ فائق شاہ کی اس گھٹیا حرکت کا مداوا نہیں کر سکے اب تک۔"
"بکواس بند کرو...... شرم آ رہی ہے مجھے تمہاری سوچ پر...... ایک اعلیٰ خاندان کے تعلیم یافتہ سید زادے ہو کر تم چلے ہو کمینوں کی لڑکی سے شادی کرنے......اور وہ......وہ بھی ایسی لڑکی جو داغ زدہ ہے اواب شاہ!" وہ تقریباً چلا رہے تھے۔
"اواب کچھ دیر انہیں غصے میں لال پیلا ہوتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور نرمی سے کہنے لگا۔
"بابا! سب انسان برابر ہیں۔ ہماری اور ان کی عزت برابر ہے۔ مجھے تو یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ فائق شاہ جیسا بدکردار میرا بھائی ہے۔ اور آپ......آپ میرے باپ جنہیں کسی کے دکھ درد کا کسی غریب پر ہونے والے ظلم و ناانصافی کا ادراک تک نہیں۔"
"خوب ڈھول ڈال رہے ہو ہمارے عزت سے اٹھے سروں میں......خوب جگ ہنسائی کرا رہے ہو ہماری عزت کی، خاندانیت کی۔ ارے نسل خراب کرنے جا رہے ہو سیدوں کی۔ کہاں تم؟ کہاں وہ بدبخت۔"
"جسے آپ نسل کا خراب ہونا سمجھتے ہیں بابا جان! وہ تو فائق شاہ نے کر دی ہے دو ماہ قبل......اور اسی نسل اور اسی عزت کو تو بچانے جا رہا ہوں میں۔ اور آپ کا سر ہی تو اونچا کرنے جا رہا ہوں اس سے پہلے کہ مرید دین کی بیٹی کسی سید زادے کی اولاد کو ناجائز طریقے سے جنم دے۔ ایسے وقت کو سنبھالنے ہی تو جا رہا ہوں میں بابا جان!"
وہ آمنہ بیگم اور رفاقت شاہ کو ہونق چھوڑ کر وہاں سے اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

گاؤں کی شام تھی اندھیرا کچی بستی پر پھیلا ہوا تھا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ کوئی جگہ روشنی دے رہی تھی۔ تو شاہ بنگلے کی عمارت تھی بس۔
مرید دین کے کچے مکان کے باہر اواب شاہ کی گاڑی لائٹیں روشنی دے رہی تھیں۔ وہ ٹوٹے دروازے پر تیز تیز دستک دے رہا تھا کہ ٹوٹی ہوئی

کنڈی خود بخود کھل گئی۔ دروازہ کھلا تو سامنے لالٹین جل رہی تھی جس نے اردگرد کے منظر کو پیلا کیا ہوا تھا۔ سامنے کمرے کے دروازے سے نکلتی وہ سترہ سالہ لڑکی تیزی سے جھکی لیتی کمرے میں گھسی تھی۔

"کون ہے نوری؟" زلیخا باہر نکلی تھی۔ مرید دین بھی گھر میں داخل ہو چکا تھا۔

"صاب......آپ......صاب اس وقت؟" وہ اواب شاہ کو تاریکی میں دیکھ کر پریشان ہوا۔

"ہاں وقت بہت کم ہے۔" وہ پریشان تھا۔

"کیا ہوا صاب؟"

"فائق شاہ تمہارے گھر کو آگ لگوا دے گا کل شام تک۔" اواب کے چہرے پر مسلسل سنجیدگی اور فکرمندی تھی۔

"صاب! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں! ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"بدنامی کی زندگی جینے سے بہتر ہے کہ ہم جل کر مریں۔ ٹھیک ہے۔ جو حکم رفاقت سائیں کا۔"

مرید دین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں تمہیں جلنے نہیں دوں گا مرید دین!" اواب شاہ نے اس کے کندھے تھامے اور حوصلہ دیا۔

"تم وہ واحد شخص ہو جس نے شاہ بنگلے کے ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے اپنے حق کے لیے، تم ایک غیرت مند انسان ہو جس نے دو وقت کی روٹی کی خاطر شاہوں کے آگے اپنی بیٹی نیلام نہیں کی۔ مجھے تم پر فخر ہے مرید دین!"

زلیخاں بے آواز رو رہی تھی۔ مرید دین بہتے آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑ رہا تھا۔ اواب شاہ نے مرید دین کے میلے کچیلے حلیے کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا کر ڈھارس بندھائی۔

زلیخاں حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

"آج رات تمہیں نوراں کے نکاح کا انتظام کرنا ہے۔ اور جتنی جلدی ہو گاؤں چھوڑ کر کے بھاگ جانا ہے۔ تاکہ تمہاری جان کو نقصان نہ ہو۔"

اس نے مرید دین کو قریب پڑی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"نوراں کی شادی؟" مرید دین نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں نوراں سے شادی کروں گا۔ اور اسے عزت دوں گا اور یہ ثابت کروں گا کہ عزت صرف سید کے لیے ہی نہیں ہے اور عزت اگر سید کے لیے ہے تو نوراں بھی اب سید کی بیوی ہے۔ اور اس کی بھی عزت ہے۔"

"مگر صاب......" زلیخا اور مرید دین دونوں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

"اگر مگر کچھ نہیں...... وقت بہت کم ہے مرید دین! میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے بھلے کے لیے جو مجھ سے ہو سکا کروں گا۔ بابا جان اور فائق اس شادی کے لیے تیار نہیں۔ مگر میں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ جسے میں پورا کروں گا۔"

مرید دین کو چپ لگ گئی تھی۔

"قاضی اور گواہوں کا انتظار میں خود کر لوں گا۔ تم نوراں کو اس بارے میں آگاہ کر دو۔"

"پر صاب! گاؤں چھوڑ کے ہم جائیں گے کہاں؟" ہمارا اللہ اور اس گھر کے سوا کوئی آسرا نہیں صاب۔" پریشانی مرید دین کے انگ انگ میں جھلک رہی تھی۔

"تمہیں منتقل کرنا اور گھر کا انتظام کرنا میری ذمہ داری ہے۔ تم اپنا ضروری سامان باندھ لو۔ آج رات ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ورنہ......" وہ لب بھینچتے ہوئے اپنی جیب ٹٹولنے لگا تھا۔ "یہ پیسے رکھ لو۔ میں اپنا ضروری سامان گھر سے لے آؤں تب تک تم تیاری کرو۔" وہ کہتے ہوئے مرید دین کے شانے تھپک کر نکل آیا تھا۔

اواب کے جانے کے بعد زلیخا نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ نوراں چارپائی پر بیٹھی رو رہی تھی اس کی لمبی چٹیا سے بال نکل نکل کر آنسوؤں سے تر چہرے پر چپک رہے تھے۔

زلیخا گٹھڑی فرش پر رکھے اس میں ضروری

سامان ٹھونس رہی تھی۔ لمحوں بعد وہ گھر کو ایک نظر دیکھتی اور ایک لمبی سی "ہائے" خارج کرتی ۔مریددین نوراں کے پاس بیٹھا تھا۔ نوراں بہت خوف زدہ تھی اور شادی کرنے پر راضی نہیں تھی۔

"اماں! ہم کو شادی نئیں کرنی اس سے، تم ہم کو جلنے دو ادھر۔" وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی۔

"اے پگلی! وہ ہم سب کا فیدہ (فائدہ) سوچتا ہے اور تو...... بے وقوپھ (بے وقوف)۔"

"اماں ...... مارے کو مار ڈال اماں! یہ جلم (ظلم) نہ کر۔" وہ کسی ضدی بچے کی طرح بستر پر مچل رہی تھی۔ اس کے موٹے موٹے ابر و تیوری کی زد میں تھے اور موٹی آنکھیں آنسوؤں کی زد میں۔

"حوصلہ کر میری دھی، اواب سائیں بوت اچھا آدمی ہے وہ مارا بھلا سوچتا ہے، وہ رفاقت سائیں جیسا نئیں ہے۔ بڑا پڑھا لکھا عقل مند بندہ ہے۔ میرے کو تو حیرت ہو رہی ہے کہ وہ تیرے سے شادی کرکے اپنی ساری جندگی کیوں برباد کر رہا ہے۔" مریددین اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں ابا! تو شاہ جی پر بھروسا نہ کر۔ ابا میں جل جاتی ہوں۔ تو چلا جا یہاں سے...... پر...... پر میرے کو اس کے حوالے نہ کر۔ وہ میرے سے ٹھیک چھلوک (سلوک) نئیں کرے گا۔"

وہ اس کے سینے سے لگ کے مچل پڑی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں اواب شاہ بیگ میں ضروری سامان ڈاکومنٹس ڈال کر شاہ بنگلے سے نکلا تھا مریددین زلیخا اور نوراں کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ پریشانی کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔

مریددین نے آنسوؤں سے اس گھر کو واپس آنے کی حسرت میں تالا لگایا تھا۔ جو ہونے والی رات میں جلا دیا جانا تھا۔

امریکہ پلیٹ اواب شاہ نے گھر کو دیکھا جس کی بظاہر کوئی وقعت نہ تھی۔ مگر مریددین کی وہ کل کائنات تھا۔ اواب شاہ نے بڑی سی کالی چادر کے پیچھے چھپی ہوئی کم عمر نوراں کو دیکھا جس کی کپکپاہٹ واضح تھی۔ اس کے ماتھے اور گال پر زخموں کے نشان ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے، دائیں ہاتھ سے اس نے دوپٹے کو کس کے تھاما ہوا تھا۔

وہ کم از کم مطمئن تھا کہ وہ مریددین کا گھر نہیں بچا سکا مگر اس کی عزت تو محفوظ کرنے کے قابل تھا۔

فطرتاً ہمدرد اور انصاف پسند طبیعت نے اسے اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس تعلق کو کیسے نبھائے گا قطع نظر اس کے، اسے اس وقت مریددین، بابا جان اماں جان کے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆☆

گاؤں سے اسلام آباد شہر تک کا سفر اواب شاہ کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ نوراں کی گھٹی ہوئی پھنسی ہوئی خوف زدہ ہچکیاں وقفے وقفے سے اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

اماں جان کو جب پتا چلے گا کہ اواب شاہ اپنے کمرے میں نہیں ہے اور بغیر بتائے کہیں چلا گیا تو ...... تو ان پر کیا گزرے گی، وہ نہیں جانتا تھا۔ اپنا نمبر اس نے پاور آف کر دیا تھا۔

وہ سیدھا اپنے دوست اسد کے گھر پہنچا۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک آج تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

اسد حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ پھر اسد کی فیملی شہر منتقل ہو گئی اور اواب شاہ امریکا چلا گیا۔

اواب کو فوری طور پر یہی سوجھی کہ اسد کے ہاں عارضی رہائش اختیار کرلے جب تک اسے کوئی مناسب گھر نہیں مل جاتا۔

"بس یار......" اواب خاموش تھا۔

"پریشان کیوں ہو؟ اور یہ لوگ؟ سب کون ہیں تمہارے ساتھ؟" اسد مریددین زلیخا اور نوراں

کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ جو اس کی بیوی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھے۔

اواب نے تمام معاملہ اسد کے گوش گزار کردیا تھا۔

"مگر اواب...... تم تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے کیا؟" وہ اواب اور نوراں سے شادی کرنے کا سن کر کافی تذبذب سے پوچھنے لگا۔

"ہاں اسد! تمہیں پتا ہے، میں فیصلے سوچ سمجھ کرہی کرتا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

مرید دین اور زلیخا کو اس نے خاصی رقم دے کر رخصت کیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں رخصت ہونا چاہتے تھے۔ اواب شاہ اور نوراں کا نکاح اسد اور اس کی بیوی اور چند دوستوں کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا۔ مرید دین اور زلیخا نے دعاؤں کے ساتھ نوراں کو الوداع کیا تھا۔ وہ ان سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی تھی۔ مچلتی رہی تھی۔ اسد اور اس کی بیوی کے سامنے اس کی یہی ایک رٹ تھی۔

"نارے کو نگیں رہنا شاہ جی کے ساتھ اماں!" ام (ہم) کو بھی لے چلو ساتھ ابا۔"

اواب شاہ کو شرمندگی تو ہورہی تھی مگر وہ معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نوراں پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا تھا وہ خاموشی سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا نوراں سے ڈائریکٹ کوئی رابطہ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور نہ وہ جانتا کہ وہ یہ تعلق کیسے بنائے گا یا کیسے چلائے گا۔ وہ خاموش تھا، پریشان تھا، سنجیدہ تھا۔ مرید دین کی دعائیں اواب شاہ کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔

☆☆☆

اسد کے دیے گئے بیڈ روم میں وہ اور نوراں اس وقت بیٹھے تھے۔ نوراں نے اسد اس کی بیوی مائرہ کے اصرار پر بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ بے آواز ہچکیاں لے رہی تھی۔ اواب شاہ کبھی اسے دیکھتا اور کبھی کھڑکی سے باہر نظر آنے والی سرسبز پہاڑیوں کو۔ کچھ دیر بعد مائرہ اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک گلابی سوٹ تھا۔

"یہ پہن لو نہا کر۔ واش روم میں شیمپو کنڈیشنر وغیرہ ہیں۔ اچھی طرح سے نہالو۔" مائرہ کے چہرے کے تاثرات واضح بتا رہے تھے کہ اسے نوراں کے وجود سے گھن آرہی تھی شاید اسی لیے اس نے اسے کپڑے تبدیل کرنے کا کہا تھا۔

"اٹھو بھی۔" اس میں کوئی حرکت نہ پا کر مائرہ نے بات دہرائی۔

"آپ کو کچھ چاہیے اواب بھائی...... چائے غیرہ؟" شانے اچکا کر اس نے اواب کی طرف رخ موڑا۔

"جی...... تھینکس تھنگ۔"

"اوکے...... گڈ نائٹ آل آف یو۔" وہ کہتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کے دروازہ مضبوطی سے بند کرنے پر نوراں کی سانسیں بے حد تیزی سے سنائی دینے لگیں۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ تھیں۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

"پلیز...... ڈونٹ بی ہیولائنگ ڈیٹ۔" اواب نے بے ساختہ کہا۔ مگر پھر وہ خود ہی شرمندہ ہوگیا۔ نوراں انگلش تو کیا اردو بھی ٹھیک سے نہ جانتی تھی۔ چند لمحے بعد وہ اٹھا اور تکیہ لے کر کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

اس کے چلے جانے پر نوراں کی سانس کسی حد تک بحال ہوئی تھی۔ وہ خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ کس قدر خوب صورت علاقہ اور گھر تھا یہ شاہ بنگلے سے بھی کہیں خوب صورت ایسا گھر اور ایسا سامان تو اس نے خوابوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر کچھ لمحے بعد ہی اس پر وہی ماضی طاری ہوگیا تھا جو پچھلے دو ماہ سے اس کی زندگی کو عذاب بنا چکا تھا۔ اس کے سامنے فائق شاہ اور اواب شاہ کے چہرے منڈلانے لگے تھے۔ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ اواب شاہ اس کی سسکیاں سننے کے باوجود جامد وساکت لیٹا ہوا تھا لاؤنج کے

صوفے پر۔ اس نے موبائل آن کیا تھا کچھ دیر بعد کال آنے لگی تھی۔

"ہیلو! ہاؤ آر یو اواب؟" مشعل کی بے تاب آواز تھی۔

"واٹ آ سائلنٹ ایٹ یور سائیڈ۔" مسلسل خاموشی پر اس نے کہا۔

"سائیلنس" اواب نے دہرایا۔

"اتنے دن بعد سیل آن کیا اور اب بات بھی نہیں کر رہے۔" "ناٹ فیئر" پھر سے خاموشی پا کر وہ بولی۔

"آئی نو۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"سو۔"

"ہیلو...... ہیلو، آر یو دیئر؟"

اواب کال منقطع کر چکا تھا۔

☆☆☆

تقریباً ایک ڈیڑھ ہفتہ اسد کے ہاں قیام کے بعد اسے بہتر گھر اور جاب بھی مل گئی تھی۔ وہ مارگلہ ہلز کے قریب خوب صورت بیش قیمت گھر خرید چکا تھا۔ اب نوراں کو لیے اسے وہاں آنا تھا۔ مائرہ بھابھی کی مدد سے اس نے یہ بات نوراں تک پہنچائی تھی۔ وہ خود نوراں سے کوئی بات نہیں کر سکا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس سے بات کیسے کرے؟ کس طرح کرے؟ اواب شاہ کے سامنے ہوتے وہ عجیب بی ہو کرتی تھی۔ کپکپانے لگتی۔ رونے لگتی۔ اواب شاہ نے اس کے لیے چند ملبوسات اور دوسرا ضرورت کا سامان خرید کر مائرہ بھابھی کو دے دیا تھا۔

"قسمت، چمک گئی یار! تیرے بنگلے کی معمولی ملازمہ کی۔" اسد نے اس کے لیے کی گئی بیش قیمت شاپنگ پر تبصرہ کیا تھا۔

"اس نے ایسی چیزیں کبھی خواب میں بھی نہ سوچی ہوں گی۔" یہ مائرہ بھابھی کا تبصرہ تھا۔

"اسد! اب وہ اس بنگلے کی ملازمہ نہیں ہے۔" اواب کو شاید یہ خطاب مناسب نہ لگا تھا مگر دنیا کے سامنے یہ حقیقت تھی۔

وہ ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اپنے گھر شفٹ ہونے کے لیے وہ کوئی دو گھنٹے تک کمرے سے باہر نہ آئی تھی۔

"باجی ام آپ کا سارا کام کر دوں گی۔ آپ مجھ کو ماسی رکھ لو۔ میں شاہ جی کے ساتھ نہیں جاؤں گی باجی۔ خدا واسطے۔" وہ مائرہ کے اصرار پر اس کے پاؤں پڑ گئی تھی۔

"دیکھو وہ تمہارا شوہر ہے۔ لڑکی اپنے شوہر کے گھر ہی رہتی ہے۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اواب بھائی نے بہت خوب صورت گھر لیا ہے۔ دیکھو گی تو پاگل ہو جاؤ گی۔" مائرہ اپنی سمجھ کے مطابق اسے قائل کر رہی تھی۔

"نہ باجی نہ...... چھوٹے شاہ جی نے بھی ایسا ہی کھبصورت گھر لیا ہوا ہے جی...... مارے کو روک لو۔" وہ ماضی کے ڈراما میں فائق شاہ اور اس کے فارم ہاؤس کو یاد کر رہی تھی۔

دو گھنٹے کے انتظار کی مسلسل اکتاہٹ میں اواب شاہ غصے سے اندر آیا تھا۔

"نوراں! چپ ہو جاؤ۔ بند کرو یہ رونا دھونا۔ بیگ اٹھاؤ اور باہر آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ غصے سے کہہ کر باہر آ گیا تھا۔

نوراں خوف زدہ کپکپاتی ہوئی بیگ اٹھا کر سسکیاں دباتی چل پڑی تھی۔

☆☆☆

"دیکھو! یہ بھوک کاٹنے سے تمہیں یا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" تین دن کے بعد وہ اس سے مخاطب تھا۔

"اپنے لیے کھانا وہ خود ہی بناتا اور اس کے قریب کھانا رکھ کر چلا جاتا تھا۔ وہ تین دن سے اسی کمرے میں تھی۔ جہاں اسے اواب شاہ نے لا کر بٹھایا تھا۔ اور وہ اسی پوز میں کارپٹ پر بیٹھی تھی کبھی روتی کبھی کمرے کا جائزہ لیتی۔ یہ گھر تو اسد کے گھر کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

قدموں کے نیچے مخمل کا قالین تھا۔ دیواروں پر

ریشمی پردے لٹک رہے تھے کھڑکیوں کے پار جھانکتی ہوئی پہاڑیاں سبزہ، نوراں جنت میں تھی شاید۔ بیڈ کا میٹریس اتنا نرم گداز تھا کہ اس سے سر ٹکاتے ہی اسے کارپٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی نیند آجاتی تھی۔ فائق شاہ کی زیادتی کا واقعہ اسے جگادیتا پھر سب کچھ دوزخ بن جاتا۔ یہ پہاڑیاں آگ برسانے لگتیں ،قالین قدموں تلے انگارہ ہوجاتا۔ اسے نفرت آتی اپنے آپ سے ،اواب شاہ سے اس گھر سے ،فائق شاہ سے ،شاہ بنگلے سے۔

''کھانا کھالو۔ کم از کم تم زندہ تو رہ سکوگی آسانی سے۔''

وہ کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ نوراں کو خوف کے ساتھ حیرت بھی تھی کہ وہ اپنے گھر کی ملازمہ کے لیے کھانا پکا کرلاتا ہے۔ وہ اسے گھر کا کام کرنے کو کیوں نہیں کہتا۔

روٹین کی طرح نوراں کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ بس یہ ضرور تھا کہ اس کے جانے کے بعد اس نے چند نوالے کھالیے تھے۔ یہ پیٹ کی مجبوری تھی یا کیا، بہرحال وہ اب کھانا کھالیتی تھی۔ چاہے دیر سے کمرے سے باہر ابھی تک نہیں نکلی تھی۔

اواب شاہ صبح آٹھ بجے جاتا اور رات آٹھ بجے آفس سے واپس آتا۔ کھانا کھانے کے بعد یا تو کوئی اسپورٹس چینل دیکھتا یا پھر کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ وہ خود کو حد درجہ مصروف رکھتا۔ تاکہ اسے اماں جان کی یاد نہ ستائے۔ اسے حیرت تھی کہ باباجان نے بھی اسے کوئی کال نہ کی تھی۔ شاید وہ سب لوگ اس سے نفرت کرنے لگے ہوں گے۔ یا شاید اس کا نمبر بند یا کرکال کرنا بند کردی ہوگی۔

ایک دن یوں ہی گھر کے نمبر پر کال کرکے وہ اماں جان کی آواز سننا چاہتا تھا۔ مگر اماں جان کی بے تابی اور حال احوال پوچھنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ رفاقت شاہ نے یہ کہتے ہوئے کال بند کردی تھی۔

''آئندہ اس گھر سے رابطہ مت کرنا۔ مر گئے ہم تمہارے لیے...... بہت عزت کروادی تم نے ہماری۔''

اس کی آنکھوں میں اداسی بھر گئی تھی۔

شب و روز بیت رہے تھے۔ ہر تیسرے روز اواب شاہ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھتا اور نوراں کے کمرے کی طرف دوڑتا۔ اس کی وجہ نوراں کا رونا دھونا اس کی چیخ و پکار ہوتی تھی۔ وہ زاروقطار رو رہی ہوتی تھی۔ اواب شاہ اسے سمجھاتا۔

''دیکھو۔ یوں شور مچانے سے کیا ہوجائے گا۔ وقت گزر چکا ہے بہتر ہے کہ تم اس زندگی کو قبول کرلو۔''

یونہی اک روز وہ گھر واپس آیا تو فضیلت آپا نے اسے بتایا کہ نوراں اپنے کمرے میں بے ہوش تھی۔ فضیلت آپا کو اواب نے نوراں کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا تھا۔ اسے اکیلا چھوڑنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خود کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتی تھی۔

''صاحب! میں نے ان کو ہوش دلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں اٹھیں جی۔'' فضیلت آپا حد درجہ پریشان تھی۔

اواب اپنا آفس بیگ لاؤنج میں ڈالتے ہوئے تیزی سے نوراں کے کی طرف بھاگا۔ وہ کارپٹ پر پڑی تھی۔ وہ فوراً اسے ہاسپٹل لے کر گیا۔

ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ نوراں کا مس کیرج ہوچکا ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کا خود کو پیٹنا اور خود پر تشدد کرنا تھا۔ اواب ڈاکٹر کے کیبن سے نکل کر ہاسپٹل کے لان میں آگیا تھا۔

وہ دو ماہ قبل ملنے والی اس خبر کو سوچ رہا تھا۔ جب اس نے رپورٹس پڑھ کر نوراں کو بتایا تھا۔ وہ ڈری سہمی اس کے ساتھ ہاسپٹل سے واپس آئی تھی۔ گویا وہ ایک تکلیف دہ لمحہ تھا۔ چونکہ اس بچے کا باپ وہ خود نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اس کی قصوروار نوراں تو نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خبر نوراں کے لیے بھی بری ہی ہوگی۔ اسے خود پر کنٹرول رکھنا تھا تاکہ نوراں کو بھی نارمل کرسکے۔

''مجھے...... مجھے تمہیں بتانا تھا کہ تم...... تم ماں

بننے والی ہو۔" بہت زیادہ وقت سے اس نے یہ جملہ ادا کیا تھا۔

پہلی بار زندگی میں نوراں نے بے ساختہ نظریں اٹھائی تھیں۔ چند لمحے اسے حیرانی سے دیکھ کر اس کی پلکیں خود بخود جھک پڑی تھیں۔ سفید گال سرخ ہو گئے تھے۔ وہ شرمندگی سے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"دیکھو...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... تم اپنی صحت کا خیال رکھو...... تم پہلے ہی فاقوں کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی ہو۔"

وہ اسے ایسی ہی نصیحتیں کر سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچے کے دنیا میں آجانے پر وہ کسی حد تک نارمل ہو جائے گی۔

وقتاً وقتاً وہ اسے خوش کرنے کے لیے بچے کے کپڑے اور کھلونے بھی لے آیا تھا مگر نوراں...... وہ شاید کسی اور سوچ میں تھی۔ وہ خود پر تشدد کرتی اپنے پیٹ پر گھونسے مارتی۔

"یا اللہ...... میرے کو موت دے دے...... کتنی گندی ہوں میں گند بھر گیا ہے میرے اندر۔"

"تم گندی ہو اور نہ ہی تم نے کوئی گناہ کیا ہے۔ تم فائق شاہ کے گناہ کی سزا اس بچے کو مت دو جس کی تم ماں ہو، ہاں اسے اذیت دے کر یا نقصان پہنچا کر تم ضرور گناہ کر رہی ہو۔"

مگر نوراں کی عقل ان سب باتوں تک نہیں جا سکتی تھی۔

مس کیرج کے حادثے کے بعد اواب شاہ کو ضروری لگا تھا کہ وہ نوراں کو کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جائے۔ اس نے اس کے لیے کتابیں خریدی تھیں تاکہ وہ مصروف رہے اور ماضی کی فضول یادیں اس کا مزید دماغ خراب نہ کریں۔ خلاف معمول نوراں نے کتابوں میں دلچسپی دکھائی تھی۔ شاید وہ پڑھنا چاہتی تھی۔

سائیکاٹرسٹ کی مدد سے نوراں کو پڑھائی کی طرف لانے میں کافی مدد ملی تھی۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں بدلتے گئے نوراں نے اب میٹرک کر لیا تھا۔ تعلیمی اسناد میں اس کا نام "ماہ نور" لکھا تھا۔ اواب شاہ بہت خوش تھا۔ اور نوراں کو اپنی کامیابی کا اندازہ اسے خوش دیکھ کر ہوا تھا۔

"شکر ہے تم نے بہت اچھے نہ سہی کم از کم پاسنگ مارکس تو لے لیے۔ حالانکہ تم جیسی ان پڑھ سے مجھے قطعی امید نہیں تھی۔ تھینکس گاڈ۔"

نوراں کو بس یہ انتظار تھا کہ اب وہ اس سے آگے کیا کرے گی؟ کیا پھر سے فارغ بیٹھی رہے گی گھر میں۔

اب وہ کسی حد تک فضیلت آپا کے ساتھ گھر کے کاموں میں مدد بھی کرنے لگی تھی۔ اواب کے ساتھ اس کا رویہ وہی تھا حد درجہ اجنبیت والا، نفرت دکھاتا۔ کم از کم اواب کو تو یہی لگتا۔ وہ جلد اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ اواب کو یا تو فضیلت آپا کی مدد لینا پڑتی یا جھنجلا کر اسے ڈانٹنا پڑتا۔ ڈانٹ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کئی کئی روز کمرے سے نہ نکلتی۔

☆☆☆

مرید دین اور زلیخا کو نوراں کی یاد ستانے لگی تو وہ اسد سے پوچھ پوچھ کے بعد اواب شاہ کے خوب صورت اپارٹمنٹ پر پہنچے تھے۔ فضیلت آپا انہیں پہچان نہ پائی تھیں لہٰذا وہ گھر کے گیٹ پر ہی بیٹھے رہے تھے نوراں کے کالج سے واپس آجانے تک۔

اواب شاہ نوراں کو گھر ڈراپ کرنے آیا تو مرید دین اور زلیخا تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف لپکے۔

"نوری...... رے نوری۔" زلیخا نے بے ساختہ پکارا تھا۔

"ماری دھی...... تو ماری دھی ہے؟" مرید دین اس کے بدلے حلیے پر حیرت اور خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

نوراں سفید یونیفارم میں سر پر سر دوپٹا اوڑھے کندھے پر بیگ لٹکائے ان سے بہت مختلف لگ

رہی تھی۔

''مریدین! اندر چلو نا...... وہاں چل کر ملتے ہیں۔'' اواب شاہ نے کہا تھا۔

''جی صاب...... جی۔''

سب اندر لاؤنج میں آ گئے تھے۔ اواب شاہ نے دیکھا تھا کہ وہ ان کے میلے کچیلے سینے میں سر دیے بہت پرسکون ہو کر بیٹھی تھی۔ جبکہ اس کا کشادہ اور ستھرا سینہ جس پر وہ بھی اعتماد نہیں کر پائے گی شاید۔

اواب شاہ کھانے کا آرڈر دے کر گھر سے نکل آیا تھا تاکہ وہ ماں باپ بیٹی سکون سے دکھ سکھ بانٹ سکتے، وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ نوراں زلیخا اور مریدین کے ساتھ چلی جائے گی۔ مگر وہ نہیں گئی تھی۔ کچھ روز کے قیام کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے تھے۔

''نوراں بی بی کے والدین نے بہت اصرار کیا تھا جی مگر وہ جانے کے لیے نہیں مانی۔'' فضیلت آپا کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اواب کو بتا رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے لیپ ٹاپ پر مصروف رہا۔

شہر کی سہولتوں والی زندگی اور گاؤں کی مشکل زندگی میں بڑا فرق ہے نا...... اس لیے...... اور پھر کالج اور تعلیم چھوڑ کر جانے کو کس پاگل کا دل کرے گا۔ یہاں تو عیش ہی عیش ہیں۔'' فضیلت آپا نے مزید اواب شاہ کو کریدا۔ جس کی حد درجہ خاموشی پر انہیں حیرت ہوتی تھی کہ اس طرح کی لڑکی کے ساتھ وہ کیوں ایک بور اور بے رنگ زندگی گزار رہا ہے۔

''فضیلت آپا! یہ گھر نوراں کا اپنا ہے۔ وہ یہاں سے کہیں اور کیوں جائیں گی۔''

''پھر بھی صاب...... آخر وہ یہاں رہ کر کون سا خوش ہیں۔ روتی رہتی تھیں اپنے والدین کے پاس جانے کو۔''

''تب وہ ٹھیک نہیں تھیں۔ اب بالکل نارمل ہیں۔ آپ جلدی سے کام ختم کریں اور نوراں بی بی کو اپنے ساتھ بازار لے جائیں۔ یہ ان کو کچھ چیزیں چاہئیں، میں ذرا مصروف ہوں۔'' اس نے سائیڈ ٹیبل سے لسٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی اور موضوع بدل دیا تھا۔

☆☆☆

اواب شاہ کی پروموشن ہو گئی تھی اب وہ باس کی سیٹ پر تھا۔ کمپنی کی طرف سے اس کے اعزاز میں عشائیہ دیا جا رہا تھا۔ تمام کولیگز چاہتے تھے کہ اواب شاہ اپنی مسز کو بھی ساتھ لائے۔ آفٹر آل اتنے ڈیشنگ بندے کی بیوی کو دیکھنے کے سب خواہاں تھے۔

کولیگز کی اس خواہش پر اسد کا قہقہہ نکل گیا تھا وہ بھی اسی کمپنی کا ورکر تھا۔

اواب شاہ کو اس کی ہنسی کا مطلب معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسد کے ذہن میں نوراں کا حلیہ ہے۔ وہ بس ذرا سا مسکرایا تھا۔

آفس سے واپسی پر اواب شاہ اسے لے کر شہر کے مہنگے ترین بیوٹی سیکشن میں آ گیا تھا۔

دو گھنٹے کی محنت کے بعد بیوٹیشن نے اسے اواب شاہ کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل بنا دیا تھا۔ منی کیور پیڈی کیور فیشل کٹنگ اور میک اوور کے بعد وہ نوراں نہیں لگ رہی تھی۔

دیے گئے ٹائم پر اسے پک کرنے کے لیے اواب شاہ واپس آیا تھا۔

معروف کالج میں تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ اور اواب شاہ کی بیوی جو اواب شاہ کے خریدے ہوئے بیش قیمت چاکلیٹ کلر کے ڈریس میں ہم رنگ اسٹونز کی جیولری پہنے اسٹیپ میں کٹے بالوں کے ساتھ دودھیا نکھری رنگت میں کسی اور ہی سیارے کی مخلوق لگ رہی تھی۔

اپنی فطری شرم کی بدولت وہ سلیولیس فراک میں اپنے برہنہ بازوؤں کو ہاتھوں کی اوٹ دے رہی تھی۔ اواب شاہ سے نظریں تو وہ پہلے ہی نہیں ملاتی تھی۔ مگر آج اس کا سر پہلے سے بھی زیادہ جھکا ہوا

تھا۔ اس کی وجہ شاید اواب شاہ کا مسلسل اس پر نظریں جمائے رکھنا تھا شاید۔

"ماہ نور" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ اور پھر وہ اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا۔

پورے ڈنر کے دوران تمام ممبرز اس سے ہیلو ہائے کر کے جاتے رہے تھے۔

"ہیلو! ہاؤ آر یو؟" اسد پر حیرت کا بم پھٹا تھا۔

"فائن!" ذرا سا مسکرا کر نوراں نے جواب دیا تھا۔

اواب شاہ نے بھی چند لمحے اسے تکا۔ کیونکہ اس کے نزدیک تو وہ ابھی بھی اتنی پر اعتماد نہیں تھی۔ وہ اپنے پہلو میں کھڑی نوراں کو پہچان نہ پایا۔

"یار...... بڑی محنت کی ہے لگتا ہے تم نے۔" اسد ایک سائیڈ پر کھڑا اسے سراہ رہا تھا۔ وہ بس مسکرا ہی پایا تھا۔

☆☆☆

گھر واپس آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اواب شاہ چند لمحے لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

دروازہ کھولنے پر اس نے دیکھا کہ وہ آئینے کے آگے کھڑی اپنا وجود دیکھ رہی تھی۔ اواب کے پہلی مرتبہ یوں دستک دیے بغیر اندر آنے پر وہ اچانک گھبرا گئی کیوں کہ رات پہلے بہت ہی بیت گئی تھی دو بج رہے تھے۔

"وہ...... وہ......" اسے گھبرایا ہوا پا کر وہ کوئی بہانہ سوچنے لگا۔ "وہ میں پوچھنے آیا تھا کہ تم چائے پیو گی۔ "میں چائے بنانے جا رہا ہوں۔" فوری طور پر وہ یہی کہہ سکا۔

"جی ...... جی نہیں۔" دوپٹا سر پر پھیلاتے ہوئے وہ تیزی سے انکاری تھی۔

اس کی تیز چلتی سانسوں نے اواب شاہ کو احساس دلایا تھا کہ اسے واپس چلے جانا چاہیے۔ وہ بہت گھبرا گئی تھی۔ اس کے سفید پاؤں جوتے سے آزاد تھے۔ جن کی حساسیت کی وجہ سے جوتے کے نشان پڑ گئے تھے۔ انہیں تکتا ہو وہ کمرے سے "گڈ نائٹ" کہہ کر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

نوراں اب یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اواب نے یونیورسٹی میں فونیٹکس (علم صوتیات) کے لیے اس کا ایڈمیشن کروادیا تھا۔ آج کی ماہ نور کل کی نوراں سے بہت مختلف تھی، وہ روانی سے انگلش بولتی۔ آؤٹ اسٹینڈنگ ڈریسز پہنتی۔ اس کے لہجے اور زبان میں حد درجہ نکھار آ گیا تھا۔ اواب کو اس کی کامیابیوں پر فخر ہوتا۔ وہ اواب سے اب پہلے کی طرح ڈرتی نہیں تھی اس تمام عرصے کے دوران اواب شاہ کو بھی گمان نہ گزرا تھا کہ اس کا اس سے کیا رشتہ ہے؟ وہ اس کا رہنما تھا محسن تھا؟ وہ اس کی کیا تھی؟ معلوم نہیں۔

وہ بہت پر اعتمادی سے اپنے اخراجات کے لیے اواب سے رقم مانگا کرتی۔ اس کی سہولت کے لیے اواب نے اپنا اور اس کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔

اسے اپنی چیزوں کو استحقاق سے استعمال کرتا دیکھ کر اواب کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ گھنٹوں اپنے لیپ ٹاپ پر رقصاں اس کی حسین انگلیاں دیکھتا رہتا۔ اس کے شانوں تک کٹے بال اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے ہوتے، وہ اس کے چہرے کو چھونا چاہتا تھا مگر، ان کے بیچ ایسا کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔

وہ لمبی چٹیا والی سہمی ڈری نوراں وہ تو نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ ماہ نور...... ماہ نور ہر لحاظ سے اواب کے قابل تھی۔ دس سال ہونے کو تھے ان کے اس خوب صورت مگر بے نام تعلق کو، کاغذی نکاح دس سال پرانا ہو چکا تھا۔ اواب شاہ کے بالوں میں سفیدی اتر آئی تھی۔ ہم عمروں کی زندگیوں کی ترقیاں اسے بتاتیں کہ اس کی زندگی کس قدر جمود کا شکار تھی۔ دس سال سے وہی ایک روٹین تھی۔ آفس جانا واپس آنا۔ کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنا۔ انٹرنیٹ پر مصروف ہونا۔ ماہ نور کی پڑھائی میں اس کی مدد

کر دینا۔ یا اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا کہ کبھی کبھار اس کی یونیورسٹی جا کر معاملات دیکھنا۔ اور ہر اتوار کے دن مسلسل بور ہونا۔

وہ اب کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ کوئی فیصلہ لینا چاہتا تھا وہ اس خاموش اور بے رنگ زندگی سے اکتا گیا تھا۔ اس کی زندگی کی خوشیاں بس ماہ نور کی تعلیمی ترقی سے منسلک تھیں۔ خوشی اس سے بڑھ کر بھی تو معنی رکھتی تھی زندگی میں۔

"ماہ نور!" گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے اسے پکارا۔

وہ یونیورسٹی جانے کے لیے اواب شاہ کے برابر کی سیٹ پر آبیٹھی پیازی رنگ کے شلوار قمیص میں وہ سفید دوپٹا اوڑھے معصوم پری لگ رہی تھی۔

"جی؟" اس نے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا اعتماد تھا۔

"تم یونیورسٹی سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد کیا کرو گی۔" آئی مین تمہارا فیوچر پلان کیا ہے؟"

ماہ نور صبح صبح اس قسم کے سوال پر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں جاب کروں گی اس کے بعد۔"

"پریکٹیکل لائف کب اسٹارٹ کرو گی؟" اواب نے گاڑی اسٹارٹ کر کے یونیورسٹی کے راستے پر ڈالی۔

"میں جاب کروں گی، آئی تھنک اٹ ول بی پریکٹیکل۔" گاڑی کے شیشے میں اپنی لپ اسٹک کو برائٹ کرتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

"میرا مطلب ہے ہم۔ ہم اپنی میریٹل لائف (ازدواجی زندگی) کب اسٹارٹ کریں گے۔ اواب شاہ نے بمشکل پوچھا۔

"اس کی نظریں بیک وقت آئینے میں جھلکتی اس کی آنکھوں اور سڑک پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔

"شاہ جی......" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر چپ ہو گئی۔

"تم آج سے مجھے یہ خطاب نہیں دو گی۔ جسٹ اواب شاہ!" اس نے ماہ نور کے گالوں پر تھرتھراتے پلکوں کے سائے کو تکا اور اس کی لب کشائی کا انتظار کرنے لگا۔

وہ تمام راستہ کچھ نہ بولی تھی۔ اواب نے بھی اسی پر اکتفا کر لیا تھا۔ وہ اسے ماضی میں واپس دھکیلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اب اس پہلو پر غور شروع کر دے گی۔ وہ بہت ذہین اور معاملہ فہم تھی۔ اسے جب مناسب لگے گا وہ اسے جواب دے گی۔ اس کا مقصد کبھی بھی اس کی خواہش کے خلاف جانا نہیں تھا۔

شاید وہ اب بھی اس سے ایسی کوئی بات نہ کرتا، زندگی کی ندی کو خود ساختہ دھارے پر بہنے دیتا۔ مگر وہ اپنی پھیکی زندگی سے تنگ آ گیا تھا۔ اسے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ اسے بیوی کی ضرورت تھی۔ جو شام کو گھر آنے پر اس کا بے تابی سے انتظار کرتی۔ اس کے لیے پانی لاتی۔ اس کی دن بھر کی ٹینشنز شیئر کیا کرتی۔ اس کا ہاتھ تھامتی تو دنیا بھر کی دوری کا احساس مدہم کر دیتی۔

اگلے روز جب اواب شاہ نے اسے یونیورسٹی ڈراپ کیا تو وہ گیٹ کی طرف جانے کے بجائے کھڑی رہی۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے اوجھل ہو جایا کرتی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کچھ گڑبڑائی پھر کہتی ہوئی گیٹ کی طرف چل پڑی۔

"پلیز۔" اس نے اصرار کیا۔

"شام تک۔" اس کی آنکھوں میں تفکر تھا۔ ہولے سے کہہ کر وہ چلی گئی۔

☆☆☆

اواب شاہ کا تمام دن بے تابی سے گزرا۔ شام ہونے کا انتظار بہت تکلیف دہ تھا۔ گویا ایک دن نہیں دس سالوں کا انتظار ہو۔

واپسی پر اس نے پلاٹینم اور ایمرالڈ سے بنا

خوب صورت بریسلٹ خریدا۔

خلاف معمول وہ ڈنر آج اس کے ساتھ ہی کر رہی تھی۔ ڈنر کے دوران وہ بار بار اسے دیکھتی اور نظریں جھکا لیتی۔ اس کی یہ کیفیت اواب کو بہت مزا دے رہی تھی۔ وہ شرما رہی تھی شاید اسے کچھ کہنا تھا۔

فضیلت آپا نے برتن اٹھا کر چائے سرو کی۔ بھاپ اڑاتی چائے کے پیچھے ماہ نور کا دھندلایا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' کہنیاں میز پر دھرے ہاتھوں کی پشت پر تھوڑی ٹکائے وہ نظریں جھکائے بولی۔

''کہو۔'' اواب مسکرایا، وہ اس کے تمام نقوش حفظ کر رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔

''کچھ چاہیے؟''

اواب نے اپنی مٹھی میں بند بریسلٹ کو محسوس کیا۔ وہ اب مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اور اواب اس کی آنکھوں کی گہری چمک میں غوطہ زن تھا۔

''ہاں۔'' اس نے پلکیں گرا دیں۔

''کیا؟''

''سیپریشن (علیحدگی)'' پتا نہیں ماہ نور نے کیا کہہ دیا تھا وہ اس کے لبوں کی حرکت کو دہرانے لگا۔ ماہ نور اس کے دہراتے لبوں کو تکنے لگی۔

''کوئی شکوہ ہے کیا؟ کوئی خفگی؟ مجھے بتاؤ...... کچھ چاہیے کیا؟ میں دوں گا۔ سب۔'' لاکھ کوشش کے بعد بھی اواب کے اندر کی توڑ پھوڑ اس کے لہجے میں در آئی تھی۔ وہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک اواب شاہ ماہ نور کے ایک لفظ سے تہس نہس ہو گیا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

وہ کتنی پراعتماد لگ رہی تھی اور وہ...... اسے نوراں سے ماہ نور بنانے والا، آج خود نوردین بن گیا تھا۔ شاید اس کا سارا اعتماد کرچیوں میں بٹ رہا تھا۔

''کیا...... کیا تم اب تک مجھے جان نہیں پائی ہو؟ کیا دس سال کا عرصہ کم ہے کسی کو جاننے کے لیے؟ کیا تم اب بھی مجھے فائق شاہ کا بھائی سمجھتی ہو صرف۔ تمہیں پتا ہے تم نوراں نہیں ہو۔ تم ماہ نور ہو ڈیئر...... تم میری ماہ نور ہو۔'' وہ اسے اسٹڈی کے دوران کچھ سمجھانے والے انداز میں سمجھانے لگا۔

''آپ مجھے ڈیوارس دے دیں۔'' وہ کسی بات کا جواب دینے کے بجائے کہہ کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔''

اواب اس کی پشت پر جھولتے سلکی بال دیکھتا رہ گیا۔ بریسلٹ کو اس نے بے دلی سے ٹیبل پر ڈال دیا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

وقت دیکھنے پر اسے احساس ہوا تھا کہ یہاں گہری سوچ میں ڈوبے اسے گھنٹا بھر سے زیادہ ہو گیا تھا۔

وہ اس کے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ چند لمحے دستک دینے کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی پیلی روشنی تاریکی پر کچھ زیادہ حاوی نہ ہو رہی تھی۔ اسکائی بلو سلکی نائٹی میں وہ دروازہ کھول کر مڑی۔

''مے آئی کم آن۔'' یہ اس کا بیڈ روم تھا۔ ہمیشہ کی طرح اسے اجازت لے کر ہی اندر آنا تھا۔

وہ کچھ کہنے کے بجائے ہونٹ چبانے لگی تھی۔

چند لمحوں بعد اواب آگے بڑھا۔

''ماہ نور!'' وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔

''ماہ نور! ہم نے دس سال بہت اچھا ساتھ نبھایا ہے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ تمہارا اعتماد بحال کرا دوں۔ تمہیں انسانوں کے بیچ فرق کرنا سکھا دوں۔ تمہارا ذات پات کا پیمانہ توڑ دوں۔ تم مجھے فائق شاہ، یا کسی کو بھی ذات کے پیمانے میں نہیں انسانیت کے پیمانے میں دیکھو، میری تلاش میری کوشش لاحاصل نہیں، غلط نہیں۔ مجھے صلہ تو نہیں چاہیے مگر...... ماہ نور، تمہیں اپنے لیے ٹھیک فیصلہ کرنا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ تمہاری ہر بات مانی ہے۔ تمہارا بھلا سوچا ہے۔ تم کہاں جاؤ گی یہ گھر چھوڑ کر؟ مجھ سے الگ ہو کر کہاں رہو گی؟''

وہ بہت سمجھ داری سے اس کے لیے ہمیشہ کی طرح فکر مند ہو کر کہہ رہا تھا۔ ماہ نور کے سیل کی بیل پر

دونوں کی توجہ بٹ گئی۔
ماہ نور نے سیل کو آف کر کے بیڈ پر اچھال دیا تھا وہ شاید اس کی بات دھیان سے سننا چاہتی تھی اواب کو یہی لگا۔
''آپ نے ہمیشہ میری بات مانی ہے، میرا بھلا سوچتے ہیں۔ تو جو میں چاہتی ہوں اس میں بھی میرا بھلائی ہے۔'' وہ سامنے بیڈ پر جا بیٹھی۔
''تم نادان ہو ابھی تک دس سال پرانی بات لے کر بیٹھی ہو۔'' وہ جھنجلا گیا۔
''نہیں میں نادان نہیں ہوں۔'' اس نے تیزی سے اس کی بات سے انکار کیا۔
''ماہ نور۔'' اواب نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی تمام تر توجہ اواب کے چہرے پر تھی۔ وہ اٹھا اور اس کے قریب گھٹنے ٹیک کر کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ اواب نے آہستگی سے ماہ نور کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔
There is a pian in my heart (مجھے تم سے محبت ہے)
اس کے ڈوبتے دل سے سرگوشی سی ابھری۔
وہ تیزی سے اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں ورجینیا وولف کا ناول تھا۔ ناول کو بک شیلف میں رکھنے کے بہانے وہ اواب سے کترائی۔
''مجھے نہیں رہنا آپ کے ساتھ۔'' وہ کرخت لہجے میں بولی۔
''ماہ نور! میرا خیال ہے تم اب باشعور، ہو پڑھ لکھ گئی ہو۔ تم مجھ میں اور فائق شاہ میں فرق سمجھ سکتی ہو۔ تم مجھ سے خوف زدہ نہیں ہو تو پھر۔ پھر یہ حماقت کیوں؟''
''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی اور میں انٹرسٹڈ ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ہی از مائی کلاس میٹ۔'' وہ کہہ کر بیڈ پر جا بیٹھی۔
''یہ حقیقت نہیں ہے ماہ نور...... صرف دھوکا ہے۔''
''یہ فریب ہے اور نہ جھوٹ۔'' وہ چلائی۔
وہ کبھی اواب کے روبرو نہیں چلائی تھی۔ وہ نوراں...... ماہ نور...... اواب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

آج کی رات ماہ نور کا چہرہ دوسری بار دھندلایا تھا۔ وہ باہر آ گیا تھا۔ بوجھل قدموں سے وہ اسٹڈی کی طرف آیا اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بالوں میں کچھ سفیدی تھی۔ دس سال بیت گئے۔ اور ''اتنی'' سی تبدیلی آ گئی تھی اس میں۔
رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر وہ کچھ لکھنے لگا۔ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ ٹیبل لیمپ آن کرنے میں اسے کوئی پانچ منٹ لگے۔ کھڑکی کے پار جھڑی تنہا کونج کی للکار سے زیادہ اواب شاہ کے قلم کی للکار میں سوز تھا۔ وہ لکھنے لگا۔

☆☆☆

پچھلے گزارے لمحوں کی بے چینی اس کے انگ انگ کو چیر رہی تھی۔ وہ کوئی گھنٹہ بھر نہاتی رہی۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وجود کو پرسکون کرنے کے لیے نہا رہی تھی۔ یا غلاظت دھونے کے لیے۔
اس کی آنکھوں کے آگے فائق شاہ کا مکروہ چہرہ تھا۔ یونہی پانی کے نیچے کھڑی وہ روتی رہی۔
اسے باہر کا گیٹ زور سے بند ہونے کی آواز آئی تو وہ چونکی۔ نجانے کیوں بے کلی سی بھر گئی تھی اس کے اندر۔ وہ تیزی سے پانی بند کر کے کپڑے پہن باہر نکلی۔
لاؤنج میں جہاں چند گھنٹے پہلے وہ ڈنر کر رہے تھے۔ پلاٹیم اور ایمرلڈ کے خوب صورت بریسلٹ کے نیچے ایک صفحہ دھرا تھا۔ سیاہ پنسل سے کچھ درج تھا اس پر پاس ہی چائے کے دو کپ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔
اس نے تحریر اٹھا کر پڑھنا شروع کی۔
''نوراں!''
تم میری طرف سے آزاد ہو۔ تم پر میرا کوئی دین نہیں۔ تمہیں قانونی طور پر بھی آزاد کر دوں گا جلد، مگر میری ہر چیز کی مالک ہو۔ میرا گھر تمہارا ہے، پراپرٹی تمہاری ہے۔ چاہو یہاں رہو، یا اسے بیچ ڈالو۔ میں فائق شاہ کا بھائی تمہاری زندگی سے اب جاتا ہوں۔ تمہاری خوشیاں تمہارا ساتھ دیں آمین!''
اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے تحریر ٹیبل پر جا گری۔
وہ گیلے بالوں اور گیلی آنکھوں سے مین گیٹ

کی طرف بھاگی وہ ننگے پاؤں سڑک پر تیزی سے چلتی جارہی تھی۔ اواب شاہ کسی زندہ لاش کی طرح دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔

"اواب...... اواب!" یہ کیسی پکار تھی۔ اواب کے قدم رک گئے۔

وہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔ گیلے بال، ننگے پاؤں، برستی آنکھیں، دسمبر کی سرد رات، سڑک پر دھند اتر رہی تھی۔ اس کے ہونٹ سردی کی وجہ سے کپکپا رہے تھے یا اندر کی لرزش سے۔

چند لمحے اس کا چہرہ دیکھ کر اواب نے نظریں جھکالیں اس کی کہی گئی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

وہ پھر سے چلنے کے لیے قدم اٹھانے لگا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟" وہ آنسوؤں سے رندھے حلق سے گویا تھی۔

"تمہاری زندگی سے دور۔ تم...... تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں نا......" اواب نے راستہ تکتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... نہیں...... میں...... تم...... میں...... میں آپ کے قابل نہیں...... شاہ جی!" وہ اس کے سینے سے لگ کے بلک پڑی۔ اواب کا وجود سر دہونے لگا۔ وہ جیسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر۔ مگر بس رو ہی سکی۔

"میں...... میں بری ہوں...... گندی ہوں...... داغ زدہ ہوں...... مم...... میں تو...... میں تو آپ کے ملازم کی کمین مرید دین کی بیٹی ہوں شاہ جی...... میں آپ کے قابل نہیں۔ آپ نے دس سال مجھے اپنے برابر لانے میں لگا دیے اور...... اور میں نے دس سال آپ کے برابر آنے میں...... مگر مگر میں اپنی زندگی سے یہ سب نہیں مٹا سکتی۔ میں آپ کے قابل نہیں شاہ جی۔ آپ کو تو اپنے جیسی کسی پاک صاف لڑکی سے شادی کرنی چاہیے۔"

وہ روتی رہی اتنا تو شاید وہ پچھلے گزرے سالوں میں نہ روئی تھی۔ جتنا اب رو رہی تھی۔

وہ اسے بازوؤں کا آسرا دیے فٹ پاتھ پر گھاس پر بیٹھ گیا۔ سڑک سنسان تھی، سردیوں کی رات تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

"مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ مجھے تم ایسے ہی قبول ہو ماہ نور! مجھے تو تم دس سال قبل نوراں کے روپ میں بھی قبول تھیں۔ ماہ نور میں نے تمہارے داغوں یا تمہاری کمین باپ سے شادی نہیں کی تھی۔ میں نے تمہاری پاکیزگی، تمہاری سادگی...... تمہارے سہارے کے لیے شادی کی تھی۔ کیا میں نے کبھی اپنے وعدے سے کم کیا تمہارے ساتھ۔"

"نہیں شاہ جی نہیں۔ میں ہی آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے سب اس لیے کہا تھا کہ آپ ...... آپ اپنی زندگی بھی اپنی مرضی سے گزار لیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں میرے لیے ضائع کردی۔" وہ روئے جارہی تھی۔

"اور وہ جو تم سے محبت ہوگئی ہے۔ اس کا کیا کروں؟" اواب نے اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے سینے میں سمو کے گرم کرنا چاہا۔

ماہ نور نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں ان سے ابھی بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

اواب شاہ نے اس کی سرد پیشانی چوم لی۔ وہ اب اسے مزید رونے نہیں دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شاہ بنگلے پر ایک بہت یادگار شام تھی۔ آج اواب شاہ ماہ نور کو لیے وہاں آرہا تھا۔ اور وہ پرامید تھا کہ کل کی نوراں تو شاید شاہ بنگلے کی بہو نہیں بن پائی مگر آج کی ماہ نور کو شاہ بنگلے کا ہر فرد حیرت سے دیکھتا۔

ماہ نور کے اندر فائق شاہ کا خوف ختم ہوچکا تھا۔ اس خوف کی جگہ اواب شاہ کے دیے گئے بے پناہ اعتماد نے لے لی تھی۔ وہ بنگلا جسے وہ کبھی حیرت سے دیکھتی تھی۔ آج وہ اس بنگلے کی بہو تھی۔ جو قرض تھا وہ اواب شاہ نے گزرے دس سالوں میں اتار دیا تھا۔ ماہ نور کا وجود قدرے پرسکون تھا اور اواب شاہ بھی لوٹ آنے کی خوشی سے سرشار تھا۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

تو میرا رنگِ عید

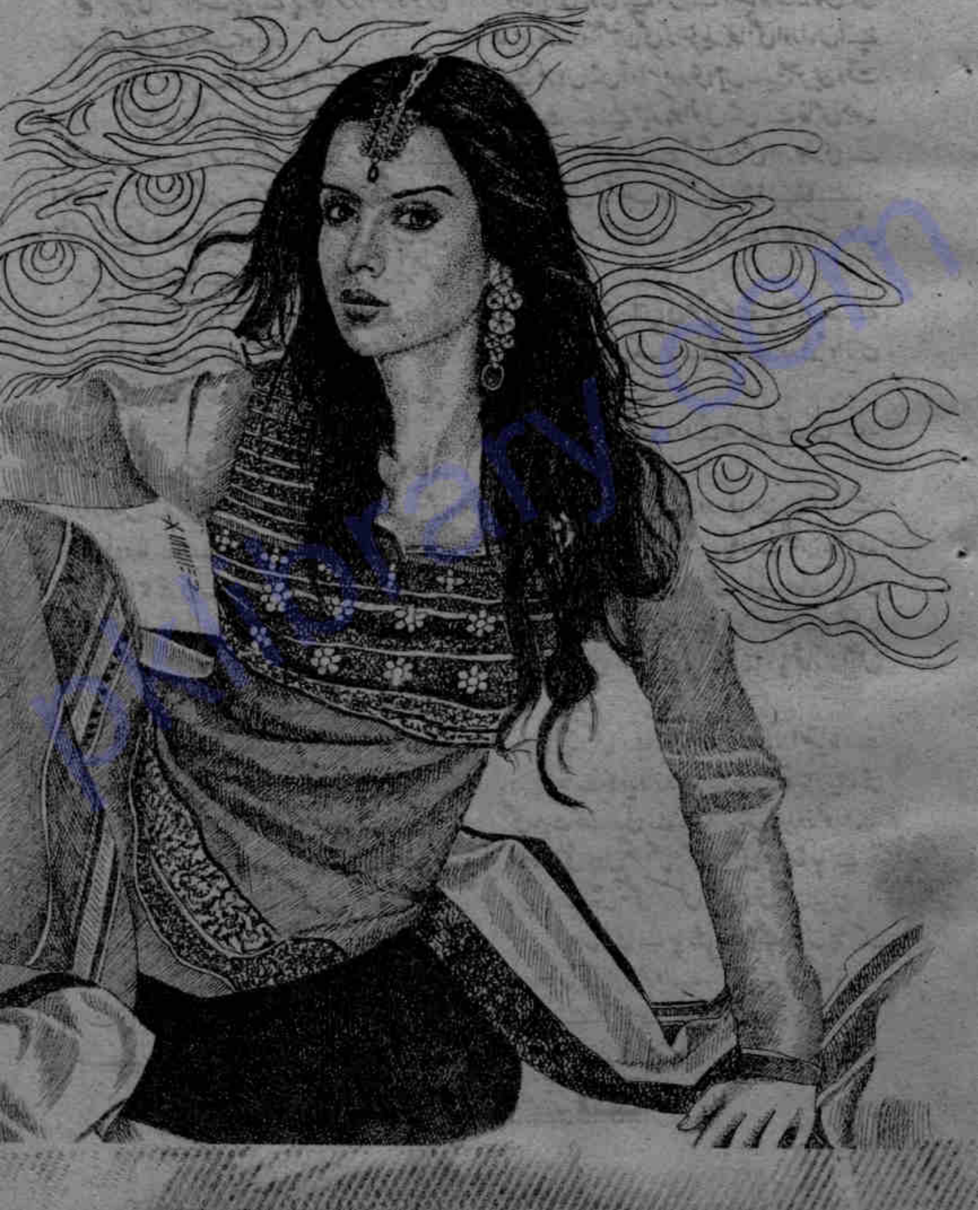
مجھ کو خوش رنگ بہاروں کی گھٹا ہونا تھا
مجھ کو حالات کی تپتی نے مگر ! ضائع کیا!

یہ شہر گلابوں کا نہیں تھا مگر اس شہر میں سرخ گلابوں کا موسم، محبت کرنے والے دلوں پر اتر کر مہکتے، ان چھوئے جذبوں سے سحر انگیز کہانیاں لکھ رہا تھا۔ لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، برف سے ڈھکے راستوں پر چلتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس نے جدید شہر کے کئی کافی شاپ چھانے مگر کوئی ایسا کونا یا جگہ نہ ملی جہاں سرخ گلابوں سے مہکتا گلدستہ، دو جوان دھڑکتے دلوں کے درمیان رکھا ہوا نہ ملتا۔ محبت کا موسم کافی شاپ کے لہو گرماتے ماحول تک رہتا تو تب بھی ٹھیک تھا مگر آج کل تو اکثر کبھی کسی سڑک کنارے، کبھی کسی پارک کے بینچ پر ہاتھ میں ہاتھ دیے محبت مناتے کئی جوڑوں کو دیکھا تو وہ



بے چین ہو کر بے ساختہ سوچتا کہ محبت موسم کب ہے جسے منانے کے لیے لوگ جمع ہو جاتے ہیں؟ اگر محبت موسم ہے تو یہ موسم اس کے دل میں سرخ گلاب کیوں نہیں کھلاتا؟ اسے اپنے اندر سرد اور سفید برف سے ڈھکے طویل مگر تنہا راستے نظر آتے تھے۔

روز کی طرح، مخصوص فوڈ پوائنٹ سے کافی اور سینڈوچ لے کر وہ جیسے ہی مڑا پیچھے، کھڑی بائیس سالہ لڑکی بے ساختہ مسکرائی۔ لڑکی اپنی خوب صورتی سے بخوبی واقف تھی اس لیے بہت ادا سے دعوت دیتی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ لڑکی نے سرخ کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے چہرے کی سرخی سے میل کھا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر گردن گھما کر آس پاس دیکھا۔



یہاں کے لوگوں کے لیے ایسے منظر اور چہرے بہت عام تھے۔

لوگوں پر سے ہوتی اس کی نگاہوں کچھ دور فلاور شاپ پر پڑی۔ جہاں ویلنٹائن ڈے کے لیے خاص گلدستے سجائے گئے تھے۔ لڑکی نے اس کی آوارہ پھرتی نگاہوں کا تعاقب کیا اور سرخ پھولوں کو دیکھ کر گہری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر نرم مگر دھونس جماتے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

"کیا تم میرے ویلنٹائن بنو گے؟"

مخصوص برکش لب و لہجے میں بولتی وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بہت آسان ہوتا ہے دھوکے کے سرخ گلاب کو چھو کر محسوس کرنا مگر جب سچ سامنے آتا ہے تو یہ سرخ گلاب، جہنم کی آگ میں تبدیل ہو کر سب سے پہلے اسی جسم کو جلاتا ہے جس نے پہلی بار اس لمس کو محسوس کیا تھا۔ یہ اذیت دہری تب ہوتی ہے جب اس آگ کی لپٹیں روح کو جھلساتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ گناہ اور ثواب کا سیدھا اثر روح پر پڑتا ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ بہک کر سرخ گلاب کو تھامتا، دور دیس کے کسی گھر کے عام سے کمرے میں بیٹھی لڑکی کی دعا نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ نفی میں سر ہلاتا تیزی سے مخالف سمت میں چلنے لگا۔ وہ لڑکی تیزی سے اس کے پیچھے آتے ہوئے فراٹے بھرتی انگریزی زبان میں اپنی قیمت مزید گراتے ہوئے اسے گناہ کی دعوت دینے لگی مگر وہ بھاگتے قدموں سے دور چلا گیا۔ یخ موسم میں پارک کے بینچ پر بیٹھ کر نیم گرم کافی پیتے ہوئے وہ خاموش نگاہوں سے ہاتھ میں پکڑے سینڈوچ کو دیکھ رہا تھا۔

"کبھی سوچا نہیں تھا زندگی میں یہ وقت بھی آئے گا کہ کھانا پیٹ بھرنے کے لیے، صرف بھوک مٹانے کے لیے کھانا پڑے گا۔"

اس نے بے دلی سے بدذائقہ سینڈوچ کی پہلی بائٹ لی۔ ہلکی نمی اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔ نجانے یہ نمی سرخ گلاب سے منہ موڑنے کی کسک میں تھی یا پیٹ کی بھوک کے سامنے ڈالتے پہلے ان چاہے اور بے ذائقہ نوالے کی! یا شاید ہجر کاٹتے ان چار سالوں کی جہاں واپسی کا کوئی راستہ اسے بھائی نہیں دیتا تھا۔

☆☆☆

نازک پیروں میں چاندی کی پتلی سی پائل اور کولہاپوری جوتی پہنے اس نے احتیاط سے کچن میں قدم رکھا۔ وہ مطمئن تھی کہ تنزیلہ بھابھی اور اماں اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہی ہیں۔ یہ بہترین وقت تھا دعوت کے لیے تیار پکوانوں میں سے خاص حصہ نکالنے کا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور جلدی سے کیبنٹ کھول کر مختلف سائز کے نئے ڈبے نکالے۔

"محسن! اتنے سارے کھانے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا ناں!"

وہ تصور میں اس کی خوشی کا سوچتے ہوئے بے احتیاطی سے کھانا پیک کرنے لگی جب شور کی آواز سن کر اماں ٹھٹک گئیں۔

"بہو! لگتا ہے باورچی خانے میں بلی ہے۔ جلدی سے دیکھو۔"

اماں جو جوڑوں کے درد کی وجہ سے فوراً اٹھنے سے قاصر تھیں اونچی آواز میں پکارنے لگیں۔ تنزیلہ جلدی سے کمرے سے باہر نکلی۔ ایک سالہ ریحان اس کی گود میں تھا۔ کچن کے دروازے سے جھلک دکھاتے دھانی آنچل نے اسے بتا دیا تھا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔

"پتا بھی ہے کتنی مہنگائی ہے۔ احتیاط سے باورچی خانے کا دروازہ بند کرنا چاہیے تھا۔ ویسے بلی بھی بہت تنگ کرتی ہے۔ مانا کہ میں ہر روز خود اسے کھانا ڈالتی ہوں مگر بھی کبھی صبر بھی کر لینا چاہیے۔"

اماں کمرے میں بیٹھی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

"اماں! بلی بے چاری کے پیچھے کیوں پڑ گئیں ہیں۔ کچن میں اپنی فروا ہے۔ محسن کے لیے کھانا پیک کر رہی ہے۔" تنزیلہ نے اطمینان سے کہا۔

فروا نے تڑپ کر کچن کے کھلے دروازے سے

برآمدے میں کھڑی بھابھی کی طرف دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے پہلے کانوں کو ہاتھ لگایا اور پھر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے پیک کیے ڈبے اٹھائے اور باہر کی طرف بھاگ گئی۔ اس کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ ایک گلی چھوڑ کر زرینہ پھوپھو کا گھر تھا جن کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے سے اس کی بات بچپن سے طے تھی۔

"اف! ایک تو میں اس لڑکی کی حرکتوں سے بہت تنگ ہوں۔ بھلا جب دعوت ہی ان لوگوں کے لیے ہے تو پہلے کھانا پیک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے بھی پتا ہے کہ محسن اس گھر کا اکلوتا داماد بننے والا ہے۔ اب بھلا کیا میں اسے کھانا بھی نہیں بھیجوں گی؟ حد ہے بے صبرے پن کی۔ چلو اب اگر ڈبے پیک ہو ہی گئے ہیں تو ایک طرف رکھ دو۔ مہمان کو واپسی پر یاد سے دے دینا۔ فروا بی بی کی بھی تسلی ہو جائے گی۔"

اماں کہتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

"اماں! کھانا تو اسے پہنچ بھی گیا۔"

اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ اماں جو پہلے اس کی بات سن کر چونکیں اور پھر سمجھ میں آنے پر غصے سے بے پا ہو گئیں۔ تنزیلہ جانتی تھی ان کا غصہ مہمانوں کی آمد تک ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ وہ سر جھکائے ریحان کو تھپکتے ہوئے آج کی دعوت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"تنزیلہ بھابھی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ عامر بھائی ان کے دیوانے ایسے ہی تو نہیں ہیں نا......! مزا آ گیا۔"

میز پر کھلے ہوئے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ فروا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی مسلسل منہ بنا رہی تھی جبکہ وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس، دونوں آستین چڑھائے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں چاولوں کا مینار بنائے کھاتے ہوئے جھوم رہا تھا۔ اچھا کھانا اور بہت سا کھانا اس کی کمزوری تھی۔ اس لیے وہ فربہی مائل جسم کا مالک تھا مگر موٹا نہیں تھا۔ اس کے لمبے قد پر بھرا ہوا جسم برا نہیں لگتا تھا۔

"تم مسلسل بھابھی کی تعریفیں کر رہے ہو اور جو میں دعوت شروع ہونے سے پہلے تمہارے لیے کھانا لے کر آئی ہوں۔ اس کی کوئی قدر نہیں۔" وہ منہ بسور کر بولی تو لاؤنج میں داخل ہوتی سارہ مسکرائی۔

"تمہیں پتا تو ہے کہ کھانا اس موٹو کی کمزوری ہے۔ خیر ہم سب تمہارے گھر جانے کے لیے تیار ہیں۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گی یا۔"

اس نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"میں کیا احمق ہوں جو یہاں رک کر اس موٹو کو دوسروں کے کھانے کھاتا دیکھ کر تعریفیں کرتا دیکھتی رہوں۔ میں جا رہی ہوں۔" وہ پیر پٹخ کر بولتی تیزی سے پلٹی۔

"ارے سنو!" اچانک کھانا کھاتے ہوئے اس کا ہاتھ رکا۔ وہ ایک دم رکی اور مسکرائی کہ محسن کو اس کا جانا تڑپا گیا تھا۔ وہ ایک ادا سے پلٹی تو چہرے پر سنجیدگی تھی۔ سوالیہ نگاہوں سے محسن کی طرف دیکھا۔

"کتنی نکمی لڑکی ہو۔ سارا کھانا لے آئیں حتیٰ کہ سلاد اور رائتہ تک یاد رکھا مگر سب سے اہم چیز تو بھول ہی آئیں۔ میٹھا کہاں ہے؟"

محسن نے منہ بنا کر کہا تو اسے ایسا لگا جیسے کسی نے یخ پانی اس پر ڈال دیا تھا۔ سارہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ محسن چونکا۔ فروا روہانسی ہو گئی۔

"میں اس کی خوشی کے لیے کیا نہیں کرتی ہوں مگر یہ ہمیشہ میرا دل دکھاتا ہے۔" وہ غصے سے کہتی پلٹی اور بھاگ کر دہلیز پار کر گئی۔

محسن نے ہاتھ اٹھا کر اسے پکارنا چاہا مگر پھر بھری پلیٹ پر نگاہ پڑتے ہی سر جھٹک کر کھانا کھانے لگا۔ اسے وہ بعد میں منا لیتا مگر ابھی کھانے سے انصاف کرنا بہت ضروری تھا۔

"سارہ آپی! میری طرف سے فروا کو سوری کہہ دینا۔ رات کو آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا تو خود

ہی مان جائے گی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''مشکل ہے جناب! تم دونوں کی شادی کی تاریخ طے ہو رہی ہے۔ آج سے تم دونوں کا آمنا سامنا بند ہے شادی تک!'' سارہ نے بارعب انداز میں کہا تو وہ پریشان ہو گیا۔

''پھر میرے لیے مزے مزے کے کھانے کون لائے گا؟'' وہ بڑبڑایا۔

سارہ نے گھورا اور سر جھٹک کر اندر کی طرف چلی گئی۔ اس نے خالی پلیٹ کو دیکھا تو میٹھے کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ جلدی سے کچن میں آ کر دیکھا۔ وہ جیسے ہی فریج کی طرف بڑھا تو کاؤنٹر پر رکھی مٹھائی نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ مٹھائی مختلف ڈبوں میں پیک تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور مہارت سے ایک ڈبے کو کھول کر گلاب جامن نکال کر منہ میں رکھا کہ پیچھے سے دھپ پڑی۔ جلدی سے مڑا تو عالیہ بیگم اسے گھور رہی تھیں۔ ماں کو دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر منہ پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔

''تم دونوں کے طریقے سب سے الگ ہیں۔ وہ تمہارے لیے سب سے پہلے کھانا لے کر پہنچ گئی اور تم مبارک باد کی مٹھائی پہلے ہی کھول کر بدشگونی کر رہے ہو۔'' ماں کو غصے میں دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گیا۔

عالیہ بیگم نے سارہ سے چھوٹی حرا اور مریم کو آواز دے کر بلایا۔ دونوں بالترتیب فرسٹ ائیر اور سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھیں۔ بھائی کی درگت بنتی دیکھ کر ہنستے ہوئے مٹھائی اٹھا کر کچن سے باہر چلی گئیں جہاں شبیر علی تیار کھڑے ان کے منتظر تھے تاکہ بیٹے کی ہونے والی سسرال وقت پر پہنچا جا سکے۔

''کمال کرتی ہیں عالیہ بیگم! کب سے آواز دے رہا ہوں۔ اب چلیں بھی۔'' عالیہ کو کچن سے نکلتا دیکھ کر وہ جھنجلا کر بولے تو وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئیں۔

ان سب کے جانے کے بعد وہ مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ روٹھی ہوئی فروا کو ایک سو تین میسج کر کے منانا بھی تو تھا ناں!

☆☆☆

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی جہاں اماں اور تنزیلہ کی آنکھیں اس کی جدائی کے خیال سے بھیگ گئیں تھیں، وہاں فروا دروازے کے پیچھے کھڑی دھڑکتے دل کے ساتھ، نئے سفر کے بارے میں سوچتے ہوئے مسکرانے لگی۔ بی۔ اے پاس خوبصورت اور نازک سی فروا کی چھوٹی سی دنیا تھی۔ والدین کے گھر تو لاڈلی تھی ہی، پھوپھو عالیہ بھی اس پر جان دیتی تھیں۔ اسی لیے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ بچپن میں ہی مانگ لیا تھا۔ فروا کے والد رضوان نے بہن کو زبان دے دی جوان کے مرنے کے بعد بھی قائم تھی۔ فروا بڑے بھائی عامر اور اماں کے ساتھ ساتھ اکلوتی بھابھی تنزیلہ کے بہت قریب تھی۔ تنزیلہ کے ساتھ اس کا رشتہ نند بھاوج سے زیادہ، بڑی بہن جیسا تھا۔

''کل کی بات ہے جب اس نے پہلی بار اماں بولا تھا۔ آج اس کی رخصتی کے دن بھی رکھے جا چکے ہیں۔ یہ بیٹیاں اتنی جلدی بڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟'' اماں نے اداسی سے سامنے والے صوفے پر سر جھکا کر شرمائی ہوئی بیٹھی فروا کو دیکھ کر خود کلامی کی۔

فروا کو سارہ کے کہنے پر حرا اور مریم ڈرائنگ روم میں لے آئی تھیں جہاں مٹھائی کھلا کر اس کا منہ میٹھا کیا جا رہا تھا۔

''آپ اداس کیوں ہو رہی ہیں۔ فروا ایک گھر سے دوسرے گھر میں جا رہی ہے۔ میرے مرحوم بھائی نے اس کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی میں جی جان سے اس کی حفاظت کروں گی۔'' عالیہ بیگم نے جلدی سے کہا تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگیں۔

''فروا بھابھی! آپ اپنی شادی پہ کون سے گانے پر انٹری دیں گی؟''

اچانک مریم نے جذباتی ہو کر پوچھا۔ سب چونک گئے جبکہ فروا جھینپ گئی اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی عالیہ بیگم نے بیٹی کو گھورا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے؟ کیا اپنی فروا اتنی چھچھوری نظر آتی ہے کہ دلہن بن کر ناچتی گاتی ہال میں داخل ہوگی۔ ہم مڈل کلاس لوگ ہیں۔ جہاں آج بھی ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی ہیں۔“

انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو فروا نے تھوک نگلتے ہوئے گھبرا کر سر اٹھایا تو سامنے کھڑی تنزیلہ ہنسی دبانے کی کوشش میں اپنے تینوں بچوں کو آوازیں دینے لگی۔ تنزیلہ سے بہتر بھلا کون جانتا تھا کہ پچھلے ایک مہینے سے فروا نے اپنی شادی کے لیے کئی گانوں پر ڈانس پریکٹس کر چکی تھی۔

رات گہری ہوئی تو مہمان نئی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ فروا نے نظر بچا کر ٹرائفل اور فرنی کا ڈبا مریم کو تھما دیا۔

”اپنے ندیدے بھائی کو دے دینا۔“

اس نے منہ بنا کر کہا۔ مریم ہنس پڑی۔

ان سب کے جانے کے بعد فروا اپنے کمرے میں آئی تو اس کے موبائل پر محسن کے کئی میسج آئے ہوئے تھے۔ سب میں اسے منانے کے لیے مختلف ایموجی بھیجے گئے تھے۔ اس کے میسج پڑھتے ہوئے وہ مسکرانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ محسن اس کی ناراضی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ اماں نے کئی سالوں سے اس کے لیے جمع کیا ہوا سب سامان نکالنا شروع کر دیا۔ فروا کو آدھی سے زیادہ چیزیں آوٹ ڈیٹیڈ لگی تھیں۔ اس کے اعتراض پر اماں نے جھاڑ کر رکھ دیا تو وہ منہ بسور کر رہ گئی۔ محسن کو پتا چلا تو ہنس پڑا۔

”تم بھی حد کرتی ہو۔ ممانی جان نے اتنی محبت سے سب کچھ بنایا ہے اور تم نخرے دکھا رہی ہو۔“

”تم جانتے ہو کہ میرے کچھ ہی شوق ہیں جس پر میں سمجھوتا نہیں کر سکتی۔ شادی کون سا روز روز ہوتی ہے جو میں پرانی چیزیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں؟ مجھے ہر چیز بہترین اور آج کے دور کے حساب سے چاہیے۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو وہ چپ ہو گیا۔ اس کی خاموشی سے گھبرا کر فروا نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا تو کال آن تھی۔

”ساری زندگی تم نے اپنی مرضی کا ہی پہننا اوڑھنا ہے۔ جو دل چاہے خرید لینا مگر ان کے جذبات کو بھی سمجھو۔ ایک ماں جب اپنی بیٹی کا جہیز جمع کرنے لگتی ہے تو اپنی کئی خواہشوں، خوابوں کو پس پشت ڈال کر بیٹی کی جہیز کی پیٹی میں سامان بھرتی ہے۔ اپنے زندگی میں آنے اور ملنے والی ہر بہترین اور مہنگی چیز یہ سوچ کر پیٹی میں رکھ دیتی ہے کہ بیٹی کے کام آئے گی۔ ایک ماں کی اس قربانی کی قدر بہت کم لوگ جان پاتے ہیں۔“ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

”تمہیں کیسے پتا؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ محسن کو اتنا سنجیدہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”اس لیے کہ میری ماں نے بھی اپنی تینوں بیٹیوں کے لیے اسی طرح جہیز جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ سارہ آپی کی شادی کے وقت ابا کی نوکری بہت اچھی تھی۔ کافی جمع پونجی بھی تھی۔ ان کی شادی اظفر بھائی سے بخوبی سر انجام پائی۔ اب حرا اور مریم کا وقت قریب ہے مگر ابا کی بیماری اور نوکری نہ ہونے کی وجہ سے امی بہت پریشان رہتی ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم فکر مت کرو۔ میں اپنے جہیز کا سب سامان انہیں دے دوں گی۔“ اس نے فراخ دلی سے کہا۔

”وہ سامان جو تمہیں پسند نہیں ہے۔ اس لیے ناں؟“ اس نے بظاہر سنجیدہ لہجے میں کہا مگر اس کے لبوں پر پُرسکون مسکراہٹ تھی جو اس کی ہمدردی کے بول سن کر روشن ہوئی۔

”جی نہیں! تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟ میں تم سے بات نہیں کروں گی۔“ اس نے دھمکی دی۔

”چلو ٹھیک ہے پھر میں بھی ہمارے کپل ڈانس

کے لیے کسی کو نہیں مناؤں گا۔" اس نے چھیڑا۔ وہ اچھل پڑی۔

"پلیز! کسی طرح ہماری اصول پسند ماؤں کو منا لو۔ آج کل تو سب کپل اپنی مہندی اور شادی پر ناچتے ہیں۔ ہائے میرا کتنا دل کرتا ہے کہ ہماری رومانٹک سی شادی ہو۔ بہت دھوم دھام سے۔ میرے سب ارمان پورے ہوں۔"

اس کے خوابوں کی لسٹ بہت لمبی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سننے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ شادی سے پہلے کا دور ایسے ہی حسین خوابوں اور بچکانہ خواہشوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بغیر بحث کیے اس کی باتیں سنتا رہتا۔

"میں جانتا ہوں ہماری محبت اور ساتھ سے بڑا اور خوب صورت خواب کوئی نہیں ہے۔" فون بند ہوا تو تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہوئے اس نے یقین سے سوچا تھا۔

☆☆☆

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ بھلا ہمارے خاندان میں لڑکیاں کب اپنی شادی پر ناچتی ہیں؟ خبردار جو دوبارہ ایسی بات کی۔ میں خاندان والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟" عالیہ بیگم نے بیٹے کو جھاڑ پلاتے ہوئے بات ختم کردی۔

محسن سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ اس مشکل مرحلے کو کیسے سر کرے جب بری کا سوٹ کھول کر دیکھتی سارہ نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے متوجہ کرنے کے لیے بہانے سے سوٹ آگے کر کے دکھانے لگی۔ اس دوران اس نے محسن کو اشارہ کیا کہ وہ سب سنبھال لے گی۔ محسن کا چہرہ کھل اٹھا۔

"تم نے اظفر کی آفر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" اچانک سارہ کو یاد آیا تو جلدی سے سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں! میں اپنی جاب اور زندگی سے خوش ہوں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ عالیہ بیگم چونکیں جبکہ لاؤنج میں داخل ہوتے شبیر علی کا منہ بن گیا۔

"زندگی میں صرف خوش ہونا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کو بہت سی ذمہ داریاں بھی نبھانی ہوتی ہیں۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"ابا جی! میں کب اپنی کسی ذمہ داری سے بھاگ رہا ہوں۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"مگر تم جانتے ہو کہ عام سی نوکری سے آنے والے مسئلے حل نہیں ہوں گے۔" ان کے لہجے میں اندیشے بسے ہوئے تھے۔ عالیہ بیگم کا دل گھبرا گیا۔

"ارے کوئی مجھے بھی تو بتائے کہ کس بارے میں بات ہو رہی ہے؟" وہ جھنجلا کر گویا ہوئیں۔ سارہ جلدی سے ان کی طرف متوجہ ہو کر تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔

"اظفر کے دوست کی کمپنی پاکستان سے کچھ لوگوں کو منتخب کر کے انگلینڈ کا ورک پرمٹ دے رہی ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی محسن سے بات ہوئی تھی۔ بہت اچھا چانس ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"تو اظفر خود چلا جائے۔ میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟" وہ ناگواری سے گویا ہوئیں۔ محسن نے پرسکون ہو کر باپ اور بہن کی طرف دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب جیت اس کی ہونی ہے۔

"اظفر کا یہاں اپنا کاروبار ہے جو بہت اچھا چل رہا ہے۔ ویسے بھی اس کے تین چھوٹے بچے ہیں۔ سارہ اکیلی کیسے دیکھے گی۔ اس لیے وہ نہیں جا سکتا۔" شبیر علی نے تحمل سے سمجھایا۔

"تو میں بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں۔ ویسے بھی ابھی شادی سر پر ہے۔ اس لیے ایسی باتیں کر کے ماحول خراب مت کریں۔" عالیہ بیگم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔

محسن مطمئن ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے کافی ہے۔ اسے پردیس جا کر بسنے سے سخت چڑ تھی۔

وہ تنہائی سے گھبراتا تھا۔ بچپن سے بھرے پرے ماحول میں رہا تھا۔ سب کی آنکھوں کا تارا اور لاڈلا۔ ماں اور بہنیں نخرے اٹھاتی نہیں تھکتی تھیں۔ باپ بظاہر اصول پسند مگر جوان بیٹے میں اپنا عکس دیکھتے تو سینہ پھول جاتا۔ وہ خوش نصیب تھا کہ اسے ہمسفر کے طور پر لڑکی بھی ایسی ملی جو اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اتنی محبتوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے وہ یہاں سے کیسے چلا جاتا۔

☆☆☆

گہری ہوتی شام آفس کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ سردی تو تھی مگر برف راستوں پر نظر نہیں آتی مگر اس کے دل کے سب موسم برفیلی رت میں منجمد ہو چکے تھے۔ اپنے کولیگ کو گڈ بائے کر کے وہ ان راستوں پر چلنے لگا جو اسے اس مقام تک لے جاتے جہاں وہ رہائش پذیر تھا۔

راستے میں رک کر اس نے ایک اسٹور سے کچھ ضروری سامان لیا جس میں ناشتے کی چیزیں اور کچھ فروزن آئٹم شامل تھے۔ آج اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ روز کی طرح پیسے بچانے کے لیے ستا برگر خریدنے کے بجائے، کچھ پیسے اپنے من پسند کھانے پہ بھی خرچ کرلے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اس نے اپنی زندگی کو خود مشکل بنادیا ہے۔ وہ خود ترسی کا شکار ہے جبکہ اس جیسے کئی لوگ صدیوں سے پردیس کے راستوں پر اداسی، دکھ، تکلیف، بھوک، اذیت کو برداشت کر کے اپنے پیاروں کا وہ مستقبل محفوظ کر رہے تھے جس میں ہر قربانی دینے کے باوجود وہ شامل نہیں ہو سکتے تھے۔

"آج بس اچھا اچھا سوچوں گا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھاؤں گا اور پھر کافی کے مگ کے ساتھ کوئی اچھی سے موی دیکھوں گا اور۔۔۔؟"

وہ خود سے باتیں کرتا ہوا جیسے ہی اپنے گھر جانے والی گلی میں مڑا۔ اچانک اندھیرے میں کھڑے تین لڑکے اس پر جھپٹ پڑے۔ نشے میں دھت لڑکوں کے ہاتھوں میں چاقو تھا۔ ایک ایشین کو دیکھ کر انگریزی میں گالیاں بکتے ہوئے انھوں نے ہاتھوں اور پاؤں سے اس کی دھلائی شروع کردی۔ تینوں نے سب سامان اور والٹ میں موجود پیسے چھین کر اس کی طرف دیکھا جو زمین پر گرا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیزی سے بھاگتے ہوئے انھوں نے اسے ٹھڈا مارنا ضروری سمجھا اور اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ باہر کی دیسوں میں ایسی وارداتیں عام تھیں۔

وہ پھٹے ہونٹ سے رستے خون کو صاف کرتا کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا اور آنکھ پر نیل تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو مکان مالک مسٹر فلپ اور ان کی مسز نے اسے لڑکھڑاتے ہوئے آتے دیکھا تو گھبرا گئے۔ اس نے انھیں تسلی دی اور پولیس میں رپورٹ کروانے کی یقین دہانی کروا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ساری رات اس نے اپنے زخموں پر خود ہی مرہم رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عام خواہشوں کے ادھورہ رہ جانے کی نمی تھی۔ اسے بے اختیار اپنی ماں یاد آئی۔

"ماں! جب سے تُو نے اپنے آنچل سے نکالا ہے، مشکل کی دھوپ جھلسانے لگی ہے۔"

ماں کو یاد کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ دیس کے ایک عام سے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں جائے نماز پر بیٹھ کر تہجد پڑھتی ماں نے تصور میں اس کا چہرہ لاتے ہوئے پھونک ماری تھی۔ ماں کی آنکھوں میں جدائی کے آنسو تھے۔ دل درد میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

مایوں کی چھوٹی سی گھریلو رسم سے ان کی شادی کی تقریبات کا آغاز ہوگیا۔ فروا کی خوشی دیدنی تھی جبکہ محسن کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس کی ایک جھلک دیکھ لے مگر اس بار پہرا سخت تھا۔ فروا بھی جان بوجھ کر اسے اپنی کوئی تصویر نہیں بھیج رہی تھی۔ مہندی پہ ان دونوں کا نکاح ہوگیا تو اسی خوشی میں محسن بہنوں اور رشتے دار خواتین کے جمگھٹے میں خوشی سے جھومنے

لگا۔ اس نے سارہ کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتی اسٹیج کی طرف بڑھی اور شرمائی، لجائی ہوئی فروا کا ہاتھ پکڑ کر سب کے درمیان لے آئی۔ وہ جو ہمیشہ سے سوچتی آئی تھی کہ اپنی شادی پہ ہنستے بولتے، گاتے رخصت ہو گی۔ نکاح کے بعد سے مسلسل خاموش اور چپ تھی۔ عجیب سی اداسی نے دل کو گھیرا ہوا تھا۔ بات بات پر آنکھ نم ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کو چھوڑ کر اپنی ماں کی آغوش میں چھپ جائے۔

محسن کی نگاہ سر جھکا کر اداس کھڑی فروا پر پڑی تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ فروا کی خوشی کے لیے یہ سب کر رہا تھا مگر وہ پھر بھی خوش نہیں تھی۔ انہی سوچوں میں گم مہندی کا فنکشن ختم ہوا۔

اگلا دن بہت مصروف تھا۔ صبح سے ہی گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ محسن چاہتے ہوئے بھی فروا سے بات نہیں کر سکا۔ وہ بارات لے کر پہنچا تو شان دار استقبال کے بعد اسے اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد فروا، کچھ لڑکیوں کے گھیرے میں دھیرے سے چلتی اسٹیج تک آئی۔ آج وہ اپنی خوب صورتی سے زیادہ، اپنی خاموشی اور اداسی کی وجہ سے محسن کو چونکا رہی تھی۔ رخصتی کے وقت وہ جس طرح سب سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ محسن کو اس کے رویے کی سمجھ آ گئی۔

''رخصتی کا لمحہ سچ میں بہت بھاری ہوتا ہے۔''
اس نے دل میں سوچا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں بھی ''رخصتی'' کا لمحہ بہت پاس تھا۔

☆☆☆

شروع کے چھ مہینے پلک جھپکتے گزر گئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں خوش تھے مگر ان کے آس پاس بہت کچھ ایسا تھا جو ان کی خوشی کو برقرار رہنے نہیں دے رہا تھا۔

''تمہاری طرح تمہارے بیٹے کو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ یہاں اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس کا باہر جانا بہت ضروری ہے۔ کیا تمہیں اپنی بیٹیاں نظر نہیں آتیں؟ انہیں کس طرح رخصت کرو گی؟''

آج پھر شبیر علی اور عالیہ بیگم میں بحث چھڑ گئی۔ ان کے لیے چائے بنا کر لاتی فروا ٹھٹک کر رک گئی۔ پہلے بھی اس نے سرسری سا ذکر سنا تھا مگر غور آج کیا۔ اسے رکتا دیکھ کر انہوں نے سر ہلایا تو وہ فوراً اندر داخل ہوئی۔

''فروا بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ وہ اگر چاہے تو محسن اس کی بات مان سکتا ہے۔ دیکھو! یہ تم لوگوں کے سنہرے مستقبل کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کچھ سال بیرون ملک گزارے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور ہم ابھی تک مڈل کلاس کے مسئلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

فروا حیرانی سے ان کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ عالیہ بیگم کا منہ بنا ہوا تھا۔

''سارہ نے پھر نئے خواب دکھائے ہیں نا! پتا نہیں کیوں بھائی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔'' وہ بڑبڑانے لگیں۔

''تم آنے والے وقت سے نظر چرا رہی ہو۔ بیٹیوں کو کیسے رخصت کرو گی؟ کیا خالی ہاتھ؟''
ان کی بات پر وہ پریشان ہو گئیں۔ یہ فکر تو اب انہیں بھی ستاتی تھی۔ فروا کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھی تو اس کا ذہن نئی سمت میں بھاگ رہا تھا۔

''اگر سچ میں باہر چلے گئے تو؟'' اس نے حیرانی سے سوچا اور پھر مسکرا دی۔ ''پھر تو ہماری قسمت ہی بدل جائے گی۔'' وہ خوشی سے سوچنے لگی۔

سارہ نے بھی اسے ایسی ہی باتیں سمجھائی تھیں مگر اس نے تب غور نہیں کیا تھا۔ اس نے جلدی سے سارہ کو کال ملائی اور محسن کے باہر جانے کے بارے میں بات کرنے لگی۔ سارہ سے بات کر کے اس کے خوابوں کا سلسلہ دراز ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

آج پھر سب جمع تھے۔ اظفر حتمی بات کرنے آیا تھا۔ محسن مطمئن تھا کہ ماں اور فروا کے ہوتے

ہوئے اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ دونوں ہی اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔

بات شروع ہوئی۔ فروا چائے پیش کرتے ہوئے بے تابی سے محسن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے چینی محسن کو سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ شبیر علی، سارہ اور اظفر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ وہ بہتر مستقبل کے لیے باہر چلا جائے۔ عالیہ بیگم خاموش تھیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔

''امی! آپ کی کیا مرضی ہے؟'' محسن نے چالاکی سے ماں کو آگے کیا۔

عالیہ بیگم نے تڑپ کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ منع کرتیں، اچانک ان کی نگاہ محسن سے ہوتی ہوئی پیچھے کھڑی مریم اور حرا پر پڑی تو وہ ساکت رہ گئیں۔ بیٹیوں کو شان سے رخصت کرنا ہے تو کڑوا گھونٹ بھرنا ہی تھا۔ انھوں نے تھوک نگلی اور نگاہیں پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا چانس ہے۔ ضرور جاؤ۔'' ان کی بات پر محسن کو زور کا جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے ماں کے جھکے چہرے کی طرف دیکھا۔ شبیر علی کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اور اگر تم فروا کی وجہ سے منع کرنا چاہتے ہو تو اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی راضی ہے کہ تم ضرور اس چانس سے فائدہ اٹھاؤ۔

کیوں فروا؟'' سارہ نے جلدی جلدی چائے سرو کرتی فروا سے پوچھا تو اس نے خوش ہو کر فوراً سر ہلایا۔ اس بار محسن ساکت رہ گیا۔ اسے سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ فروا جو اس کے آفس جانے سے لے کر گھر آنے تک کے ہر لمحے میں اانتظار کے سیکنڈ گنتی تھی وہ بھلا کیسے اسے اتنا دور بھیجنے کو تیار ہو گئی۔ وہ حیران ہو کر سوچتا رہا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ سب کچھ دوسروں نے طے کر لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں چل گیا۔

''آپ فکر مت کریں۔ پہلے پہل سب کچھ مشکل لگتا ہے مگر بعد میں سب سیٹ ہو جائے گا۔''

اظفر نے عالیہ بیگم کو تسلی دی تو وہ بے دلی سے سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''مجھے یقین نہیں آ رہا؟ اتنی جلدی یہ سب کیسے ہو گیا؟ آپ کا ویزا بھی لگ گیا اور کچھ دن بعد کی فلائٹ ہے۔''

فروا نے اس کی تیاری کرواتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ محسن کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''تم تو بہت خوش ہو گی ناں! تمھیں شوہر سے زیادہ، وہاں سے آئے ڈالر عزیز ہیں۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

فروا نے حیرانی سے دیکھا۔ جب سے اس کے باہر جانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اسی طرح بیزار اور تلخ رہتا۔ ہر بات پر غصہ اور شکوے کرنا، کھانے میں نقص نکالنا، سب سے الگ تھلگ اپنی سوچوں میں گم رہنا ان سب کے لیے حیران کن تھا۔ خاص کر فروا حیران تھی کہ محسن کیوں روٹھے بچے کی طرح منہ پھلا کر سب سے ناراض رہتا ہے؟

''مگر جانے کا فیصلہ آپ کا اپنا ہے۔'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی وہ طنزیہ مسکرایا۔

''ہاں! میرے اپنوں کی خواہشوں کا ایسا پہاڑ میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے کہ جسے سر کرنے کے لیے مجھے پردیس کی خاک چھاننی ہو گی۔'' اس کے لہجے میں اداسی تھی۔ وہ الجھ گئی۔ اسی الجھن کے ساتھ جب وہ میکے ماں سے ملنے آئی تو تنزیلہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔

''کیا محسن کے جانے کی وجہ سے اداس ہو؟''

اس کے اندازے پر وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

''محسن بھی بہت خاموش ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ کہیں تم دونوں ایک دوسرے سے خفا تو نہیں؟''

تنزیلہ کے درست اندازے پر وہ رو پڑی اور ساری بات بتا دی۔

''اسے روک لو۔'' تنزیلہ نے ساری بات سننے کے بعد بے ساختہ کہا۔ وہ چونک گئی۔

"یہ ممکن نہیں! تین دن بعد اس کی فلائٹ ہے۔" فروا نے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر وہ جانا نہیں چاہتا۔ ذمہ داری کا جو بوجھ اس پر ڈالا جا رہا ہے وہ اس وجہ سے مجبور ہے۔ تم چاہو تو اسے روک سکتی ہو۔"

اس کی بات پر فروا الجھ گئی۔ اس کے ذہن میں سارہ کی باتیں گونجنے لگیں۔

"اگر اچھی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو محسن کو مت روکنا۔ ویسے بھی کچھ مہینوں کے بعد وہ تمہیں باہر بلا لے گا۔"

سارہ کے دکھائے خواب بہت حسین تھے۔ فروا نے تنزیلہ سے ذکر کیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"تم بے وقوف ہو۔ سارہ کا شوہر اظفر اتنے سال باہر رہ کر اچانک واپس کیوں آ گیا؟ اس نے اپنے بیوی بچوں کو باہر کیوں نہیں بلایا؟ اور ابھی اسی کی کمپنی میں محسن کی سخت ضرورت کیوں درپیش آ گئی ہے؟ تم اتنی نادان کیوں ہو؟ لازمی نہیں ہے جو بظاہر تمہارے ہمدرد بن رہے ہوں وہ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہوں۔" تنزیلہ نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

فروا کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ واپس آئی تو سارہ اور اظفر بھی وہاں موجود تھے۔ محسن کے باہر جانے کی سب تیاری وہ خود کر رہے تھے۔ ابھی بھی سارہ بہانے سے فروا کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی اور پچھلے کئی ہفتوں کی طرح اس کی برین واشنگ کرنے لگی۔ فروا نے تنزیلہ کی باتوں کا ذکر کیا تو وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئی۔

"تمہاری بھابھی ہیں ناں! کیسے برداشت کریں گی کہ تم ان سے آگے نکل جاؤ۔ جب تم محسن کے ساتھ لندن سے اپنی پکس بھیجا کرو گی تو تب دیکھنا ان کا جلن سے کیا حال ہوگا۔" سارہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تنزیلہ بھابھی ایسی نہیں ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"خیر وہ جیسی بھی ہیں تم ان کے حال پر چھوڑ دو اور محسن کا حوصلہ بڑھاؤ۔ اس کے لیے یہ آسان نہیں ہے۔"

سارہ نے فکرمندی سے کہا تو فروا نے سر ہلایا۔

محسن کے جانے کا لمحہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا فروا کا دل ڈوبنے لگا۔ کئی بار اس کا دل کیا کہ اسے روک لے۔ کسی طرح منع کرے مگر پھر خود کو سنبھال لیتی۔

محسن کی جدائی کا سوچ کر عالیہ بیگم بھی بہت اداس تھیں مگر سارہ کی باتیں سنبھلنے پر مجبور کر دیتیں۔

"میرے سسرال میں بہت اچھے لڑکوں کے رشتے موجود ہیں مگر میں تب ہی بات چھیڑوں گی جب ہمارے پاس ان کے ہم پلہ شادی کرنے کے لیے کچھ ہوگا۔ خالی گھروں میں کون آتا ہے؟"

سارہ فکرمندی سے کہتی تو وہ چپ ہو جاتیں۔

حرا اور مریم کی تیزی سے بڑھتی عمر ان کے اندیشے بڑھا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اچھے رشتے اس لیے ہاتھ سے نکل جائیں کہ وہ شان سے بیٹیوں کو رخصت نہیں کر سکتے۔

محسن کے جانے کا دن آیا تو فروا اور عالیہ بیگم بار بار اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے معمول کے کاموں میں مصروف تھیں۔ وہ گھر سے رخصت ہوا تو فروا کو ایسا لگا جیسے اس کے وجود کا ایک حصہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ محسن کے جانے کے کچھ گھنٹوں بعد ہی اسے شدت سے احساس ہو گیا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ محسن دیارِ غیر کی ہواؤں کے سپرد بہت دور کی اڑان بھر چکا تھا۔

☆☆☆

زندہ ہونا تو نہیں ہجر میں زندہ ہونا
ہم اسے کہتے ہیں ہونے کے علاوہ ہونا
کیا ضروری ہے محبت میں تماشا ہونا
جس سے ملنا ہی نہیں اس سے جدا کیا ہونا؟
(عباس تابش)

چار سال سے وہ پردیس کی سرد ہواؤں میں اپنے پن کی خوشبو تلاش کرتے ہوئے، خود سے ہی انجان رہنے لگا۔ وہ ناراض تھا یا ضدی۔۔ چاہتے

ہوئے بھی واپس نہیں گیا اور نہ فروا کو اپنے پاس بلا سکا۔ ایک سزا جو اسے دوسروں سے ملی تھی، اس نے بہت محبت سے وہ سزا ہی انہیں لوٹا دی۔ ایماندار اتنا تھا کہ جو بھی کماتا اپنی ذات پر نہیں لگاتا تھا۔ سب ماں کے نام بھیج دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے اپنے، اس کے بھیجے پیسوں سے سب خوشیاں خرید لیں۔ گھر والوں، محبوب بیوی کے لیے اپنے واقف کاروں کے ہاتھ گئی تحفے بھیجتا۔ ہر فون پر ان کی فرمائشیں خوش دلی سے نوٹ کرتا۔ وہ واپس آنے کی بات کرتے تو ہنس کر ٹال دیتا۔ وہ مشین بن کر زندگی گزار رہا تھا۔

فروا جو پہلے بے تابی سے اس کی کال اور میسج کا انتظار کرتی مگر وہ جان بوجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔ جس کا اندازہ اسے بہت جلد ہو گیا تھا۔ اس کے پاس فروا سے بات کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا یا شاید وہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ محسن کی بیزاری محسوس کرتے ہی وہ اپنے خول میں سمٹ گئی۔ اس کی نادانی اور ناسمجھی کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ وہ اپنی تنہائی کو اس کی یادوں سے سنوارتی تھی مگر اس سے بات نہیں کرتی۔ نہ وہ میسج کرتی تھی نہ محسن۔ مگر دونوں ہی تنہائی کے کسی بے بس لمحے میں خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کے نمبر دیکھتے ہوئے آن لائن نظر آنے پر خاموش لبوں سے چھوتے ہوئے رو پڑتے۔ دونوں ایک ہی وقت میں آن لائن ہوتے ہوئے بھی، خاموش رہتے۔ بس ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کرنے کی کوشش کرتے۔

میرے سارے سوال شرمندہ
اتنی حاضر جواب خاموشی

بہت جلد فروا کو اندازہ ہو گیا کہ سارہ نے اپنے شوہر کی کمپنی کو بچانے کے لیے، اپنے بھائی کو خود غرضی کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ یہ بھی تب پتا چلا جب محسن کے باہر جانے کے ایک سال بعد اظفر کی بنائی کمپنی گھاٹے کا شکار ہو کر بند ہو گئی۔ محسن کو دوسری جگہ کام تلاش کرنا پڑا۔ محسن کو پہلے سے زیادہ اچھی جاب مل گئی۔ جس پر اظفر اور سارہ حسد کا شکار ہو گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ محسن ساری زندگی ان کے لگائے سرمائے کی حفاظت کرتے ہوئے، پھی کو سنبھالے گا۔ اظفر کا خاندانی کاروبار پاکستان میں تھا۔ جس کے لیے اسے واپس آنا پڑا کیوں کہ اگر وہ خاندانی بزنس کو نہ سنبھالتا تو اس کی جگہ دوسرے بھائی لے لیتے۔ اسی لیے اظفر نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اپنی جگہ محسن کو باہر بھیج دے۔ محسن کی طرف سے دھوکا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سارہ بھی لالچ اور اپنے اچھے مستقبل کی خاطر مان گئی۔ ان دونوں نے عالیہ بیگم اور فروا کی برین واشنگ کی کیونکہ یہ دونوں ہی محسن کو باہر جانے سے روک سکتی تھیں۔

پھر سب ویسا ہی ہوا جیسا انہوں نے سوچا تھا مگر ان کی بری نیت کا نتیجہ جلد سامنے آ گیا۔ اظفر کا پیسہ ڈوب گیا مگر اب وہ چاہتا تھا کہ محسن واپس پاکستان آ جائے جبکہ محسن نے باہر ہی اپنی دنیا بنا لی تھی۔ اظفر اور سارہ کے حالات زوال پذیر تھے جبکہ محسن کے بھیجے پیسوں نے اس کے گھر والوں کی زندگی سنوار دی تھی۔

☆☆☆

عالیہ بیگم محسن کے بھیجے پیسوں سے بیٹیوں کا اعلا جہیز بناتے ہوئے کئی بار روئیں کہ ان پیسوں سے بیٹے کی جدائی کی خوشبو آتی تھی۔ انہوں نے بہت سے خواب سجا کر بیٹے کی شادی کی تھی مگر سونے آنگن اور فروا کی سونی کلائیاں دیکھ کر وہ آہ بھر کر رہ جاتیں۔ فروا جس کی شوخیاں اس گھر کی پہچان تھیں، اب گہری چپ تلے گم ہو کر رہ گئیں۔ گھر میں سب کچھ تھا اگر نہیں تھا تو ان کا لاڈلا بیٹا۔ جس کے ہونے سے خوشیوں کے سب رنگ تھے۔ حرا اور مریم کے رشتے طے ہو گئے۔ جلد ہی ان کی شادیاں ہونی تھیں۔ جس کی تیاری بھی مکمل تھی۔ انتظار تھا تو محسن کی واپسی کا۔

"محسن صرف تمہارے پکارنے پر ہی لوٹے گا۔"

شبیر علی نے شادی کا کارڈ دیکھتے ہوئے کہا تو عالیہ بیگم نے شکوہ کناں نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا جو نگاہیں چرا گئے۔

"اظفر اور سارہ نے وہ کیا جو انہیں مناسب لگا مگر آپ نے ان کا ساتھ دے کر اچھا نہیں کیا۔ اپنی

بیٹیوں کا سوچا مگر اس بچی کی فکر نہیں کی جو صرف چھ مہینے شوہر کے ساتھ رہ سکی۔ ہماری بیٹیوں کے اچھے مستقبل کی ذمہ داری، فروا کی نہیں تھی کہ وہ سہاگن ہوتے ہوئے بھی، ہجر زدہ زندگی گزارے۔"

عالیہ بیگم کے سخت انداز پر وہ شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گئے۔ فروا نے سب سنا اور خاموشی سے پلٹ گئی کہ کہیں نہ کہیں قصوروار وہ بھی تھی۔

فروا کو ملنے والی رقم الگ تھی۔ وہ من پسند شاپنگ کرتے ہوئے بھی خوش نہیں تھی۔ اس کے پاس باہر سے بھیجا گیا اعلا میک اپ موجود تھا مگر وہ یہ میک اپ کر کے کسے دکھاتی؟ جب اس کے وجود کے سب رنگ، اس کے جانے سے خزاں میں بدل گئے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ محبوب کی بہار تن من کو کیسے ہرا رکھتی ہے اور اس کی جدائی وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہے۔

کچھ تو ہے جو اُسے ویران کیے رکھتا ہے
ورنہ ایسے ہی کسی کو نہیں حلقے پڑتے!
خواب میں بھی، مَیں پہنچتا نہیں، پر دیکھتا ہوں
خود کو اپنی طرف آتا ہوا، گرتے پڑتے!!

☆☆☆

جہاز کی سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ کبھی واپس نہیں جائے گا مگر عالیہ بیگم کی اچانک خراب ہوئی طبیعت اور ان کی نقاہت زدہ آواز سن کر وہ خود کو روک نہیں سکا۔

"محسن! ایک بار اپنی ماں سے مل جاؤ۔ شاید پھر یہ موقع نہ ملے۔"

عالیہ بیگم نے انجائنا کے اٹیک کے بعد بیٹے سے روتے ہوئے کہا تو وہ تڑپ گیا۔ واپسی کے سب دروازے کھلے ہوئے تھے بس وہ ہی مڑ کر نہیں دیکھتا تھا۔ سفری بیگ اٹھائے جب وہ گھر کی دہلیز پر پہنچا تو پہلا سامنا فروا سے ہوا جسے دیکھ کر وہ پہچان ہی نہیں سکا۔

"اتنی بے رنگ، کمزور اور سانولی سی میری فروا نہیں ہو سکتی؟"

وہ ہکا بکا رہ گیا جبکہ فروا اسے دیکھ کر نم آنکھوں سے مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔

تُو نے آنے میں بہت دیر لگا دی ورنہ
میں نہیں چاہتا تھا ہجر میں بوڑھا ہونا!

وہ دھیرے سے کہہ کر عالیہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھی۔ بیٹے کو سامنے دیکھ کر عالیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ محسن بھی ماں کے ہاتھ اور پاؤں چومتا ہوا رو رہا تھا۔ پاس کھڑی سارہ کو پہلی بار احساس ہوا اس نے کتنے لوگوں کی خوشیوں کو بے رنگ کیا تھا۔ اس نے فروا کی اجڑی صورت دیکھی۔ اس کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان جدائی آئی۔ ان کی زندگی کے حسین ترین دن بدگمانیوں اور شکووں میں گزر گئے۔

"اب تم آ گئے ہو تو میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

عالیہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ محسن ماں کے سینے سے لگا، گزرے سالوں کی ہر اذیت کو بھلا دینا چاہتا تھا۔

"باپ سے نہیں ملو گے؟"

شبیر علی نے اپنے بازو پھیلائے تو محسن جلدی سے اٹھ کر باپ سے گلے ملا۔ بوڑھے باپ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھرا تو وہ نم آنکھوں سے اس کا شانہ تھپتھپانے لگے۔

"آج لگ رہا ہے کہ میں سچ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔" وہ مسکرائے تو محسن نے نفی میں سر ہلایا۔

"عید کے بعد تمہاری بہنوں کی شادی ہے۔ شکر ہے تم ہمارے درمیان ہو۔ ہماری خوشیاں مکمل ہو گئی ہیں۔" عالیہ بیگم نے نم لہجے میں کہا۔

"میں آپ سب سے شرمندہ ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ سب کو مجھ سے شکوے ہیں مگر میں اپنی خودغرضی میں اپنوں کی خوشیاں نہیں دیکھ سکی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔"

سارہ نے شرمندہ لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ محسن نے حیرانی سے عالیہ بیگم کی طرف دیکھا جیسے وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"یہاں آؤ! میں سب بتاتی ہوں۔"

عالیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا اور محسن کو اظفر اور سارہ کے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ وہ ساکت رہ گیا۔

"مگر آپ کو کیسے پتا چلا؟" اس نے بے یقینی سے سوال کیا۔

"سمجھ تو ہم بہت پہلے گئے تھے۔ پھر سارہ نے بھی اعتراف کرلیا۔ بہر حال ہم اسے معاف کر چکے ہیں۔ ہماری بیٹی ہے وہ۔ تم بھی کھلے دل سے بہن کو معاف کردو۔ اللہ صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔"

عالیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا تو وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ کر اپنے سادہ سے کمرے میں آ گیا۔ بہن سے بدلہ اس نے کیا لینا تھا مگر بہن کی خود غرضی نے اس کی زندگی کو منجدھار میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹنے لگا جب فروا کسی کام سے اندر آئی اور اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کچھ دیر دیکھتی رہی اور پھر مسکرائی۔

"اتنے سالوں سے عادت نہیں رہی ناں! آپ کو کمرے میں دیکھنے کی۔ عجیب سا لگ رہا ہے۔ بہر حال آپ کے کپڑے نکال دیے ہیں۔ فریش ہو جائیں۔ افطار میں کچھ دیر باقی ہے۔"

اس نے سنجیدگی سے کہا اور واپس چلی گئی۔ افطار پہ آج سب بہت خوش تھے کیونکہ وہ ان کے درمیان موجود تھا۔ محسن پہلے کی طرح ہنستا، بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ فروا حیران تھی کہ ایسا لگ ہی نہیں تھا کہ وہ کہیں گیا تھا۔

"عید کا چاند مبارک!" جیسے ہی چاند نظر آیا اس نے سب سے پہلے کچن میں کام کرتی فروا کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا اور چاند مبارک کہا۔ وہ گم صم سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم بھی بالوں میں لیے برف چلے آئے ہو
میں بھی اک شکوہ تاخیر لیے پھرتا ہوں!"

محسن نے شرارت سے اس کے بالوں میں لگے سفید ذرات کی طرف اشارہ کیا تو وہ چونک کر جلدی سے بال جھاڑنے لگی۔ آٹا چھانتے ہوئے، بے دھیانی میں ہاتھ بالوں میں لگا تو سفید ذرات سر پہ چمکنے لگے۔

"شکوے شکایتیں ساری زندگی کرتے رہیں گے۔ ابھی چلو۔ چوڑیاں اور مہندی لے کر دیتا ہوں۔"

اس نے جلدی سے کہا اور بائیک کی چابی لینے اندر کی طرف بڑھا۔

"میرے پاس عید کا سوٹ بھی نہیں ہے اور نہ نئے جوتے لیے اور۔۔۔!"

اس نے جلدی سے کہا تو اس نے مڑ کر گھورا جبکہ کمرے سے باہر نکلتی عالیہ بیگم ہنس پڑیں۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ جو کپڑے اور جوتے میں نے بنا کر دیے ہیں وہ تو ویسے ہی تھے۔ اصل عید تو اس کی تمہارے سنگ ہے۔" وہ محبت سے مسکرائیں اور پاس آ کر اس کا ماتھا چوما۔

"ان چار سالوں میں فروا نے کبھی مجھ سے شکوہ نہیں کیا۔ کبھی ضد نہیں کی۔ میرا بہت ساتھ دیا۔ اللہ میری بچی کو بہت خوشیاں دے۔ آمین"

"ساری محبت بھتیجی کے لیے ہی ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"تمہاری وجہ سے ہی یہ محبت مضبوط ہوئی ہے۔ ویسے بھی جب یہ تمہارے ساتھ باہر چلی جائے گی تو میں بہت یاد کروں گی کہ۔۔۔" اچانک کہتے ہوئے وہ رکیں اور فوراً منہ پر ہاتھ رکھ لیا جبکہ فروا حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"اف امی! آپ نے سرپرائز خراب کر دیا۔ چلیں خیر ہے۔ بیٹا بتائے یا ماں! ایک ہی بات ہے۔" وہ مسکرایا جبکہ فروا ابھی بھی بے یقین کھڑی تھی۔

"واپس حال میں آجاؤ! ابھی کچھ دن لگے گے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے میں۔ میں نے وہاں سے آتے وقت ہی سوچ لیا تھا کہ اگلی بار اگر یہاں واپس آیا تو تمہیں لے کر ہی آؤں گا تاکہ تمہاری سنگت میں پردیس بھی اپنے دیس جیسا لگے۔"

وہ مسکرایا تو وہ بھی نم آنکھوں سے ہنس دی۔ ہجر کے دن کڑوے اور تلخ ضرور تھے مگر محبت کی ہلکی سی آہٹ بھی بہاروں کے سب موسم واپس لے آتی ہے اور اس کے اردگرد تو محبت کا موسم اپنی تمام تر خوشبوؤں سمیت مہک رہا تھا۔

☆☆

حفیظہ لعل دین

جیون کہانی

آسمان کی کھوکھ سے اجالے کے جنم کو کافی دیر بیت گیا تھا، فلک کے ماتھے پہ کوئی بھی شکن اس دیر نہیں تھی۔ اسی لیے اس کا ماتھا صبح صادق سے لے کر اب تک بے حد صاف اور شفاف تھا۔ وہاں اسی خالی آسمان تلے شیشم کا ایک تناور درخت تھا۔ اس درخت سے چار رستے نکلتے تھے۔ تین مختلف گاؤں کو موٹی اینٹوں والی سڑکیں اور آخری سڑک شہر بورے والا کی طرف جاتی تھی۔ اسی شہر کو جاتی سڑک پہ ایک فیکٹری بن رہی تھی۔ تینوں پنڈوں کے مرد اپنے گھروں میں پڑے ٹھنڈے چولہوں کو جلانے کے لیے وہاں کام کرتے تھے۔ اس نیلی چھتری تلے دور دور تک کوئی بادل شیشم کی اونچی اٹھان نے نہیں دیکھا تھا مگر وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ سورج اپنی مدت ختم کر رہا ہے۔ سانس توڑ رہا ہے کہ نئی سانس ملے گی۔

فیکٹری سے مزدوروں کو چھٹی ہوئی تو سب مزدور اسی شیشم کے درخت کے نیچے سے گزر کر اپنے اپنے گاؤں کی طرف جانے لگے۔ انہی مزدوروں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ جس کی سیاہ آنکھیں ڈھلتے سورج کو دیکھ رہی تھیں مگر جن پہ بوجھ تھا۔ بے تحاشا بوجھ۔ بحرالکاہل سے بھی گہرا۔ کے ٹو سے بھی وزنی۔ مگر آنکھیں وفا کر رہی تھیں۔ اتنے بوجھ کے باوجود بھی وہ کھلی رہ کر رستہ بتا رہی تھیں۔ ہوا میں جیٹھ کی وجہ سے بے حد گرم تھیں مگر پھر بھی نظر بھر کر آسمان کی سمت دیکھو تو وہ اجلے پھولوں والا نیلا غالیچہ لگ رہا تھا۔ اس نے تلخی سے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں۔ وہ شیشم کے نیچے سے اٹھا۔ اس نے دس کلو گندم اٹھائی اور دوسرے گاؤں والے رستے کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

☆☆☆

1955

”رزق کا ذمہ اس باری تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے مگر ہمت کا م لو اس نے تمہارے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اپنے یقین کے گریبان میں جھانک کر دیکھو عاشق حسین۔ تمہاری ہمت جواب دے جائے گی مگر اس کا کرم کبھی بھی اپنی راہ سے نہیں ہٹے گا۔ بس اس پہ توکل رکھو۔ یقین کامل ہو تو کامل اپنی کاملیت ظاہر کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔“

سرداراں بی بی کے اندر جب بھی خالی پن پھیلنے لگتا تو وہ اپنے چھوٹے بیٹے عاشق حسین کو لے کر بیٹھ جاتیں۔ عاشق حسین ماں سے بڑے بڑے جملوں کی وجہ پوچھتا تو سرداراں بی بی صحن میں لگے نیم کے درخت کی ہری ہری ڈالیوں کو دیکھ کہتیں۔

”عاشق حسین! تمہارا ابا کہا کرتا تھا کہ سرداراں مجھے تمہارا بولنا پسند ہے۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کائنات میں مجھے اچھا کیا لگتا ہے تو میں یہی کہوں گا۔ تمہیں سننا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہارے ابا کے سامنے ہی بولا کرتی تھی میں، بس پھر وہ چلا گیا تو لگا میری قوت گویائی چلی گئی۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے بولوں۔ تو تجھ سے بول لیتی ہوں۔“

سرداراں بی بی نے بات ختم کی تو عاشق حسین کی بیوی چنگیر میں روٹی اور اچار لے کر آ گئی۔ وسیع صحن گوبر اور مٹی کے کیچڑ سے برابر کر کے لیپا گیا تھا۔ اسی صحن میں لگے نیم کے درخت تلے ایک تخت ہمیشہ پڑا رہتا تھا۔ بید کی لکڑی کا تخت اسی تخت پر سرداراں بی بی بیٹھا کرتی تھیں۔ وجہ وہاں بیٹھنے کی یہ تھی کہ نیم



کے درخت کے عین سامنے لکڑیوں والا چولہا پڑا تھا۔ ایک طرف دو کمرے تھے جو کہ بے حد اچھی طرح لیپے گئے تھے جبکہ دوسری طرف صرف ایک کمرا تھا۔ وہ بھی لیپا گیا تھا مگر ویسا نہیں تھا جیسا معشوق حسین کا نظر آتا تھا۔

معشوق حسین سرداراں بی بی کا جیٹھا بیٹا۔

انہوں نے تاج محمد کے جانے کے بعد اپنے بڑے بیٹے معشوق حسین کو گھر کا سربراہ دیکھا تو سکھ کا سانس اس وجہ سے آیا کہ شکر ہے ایک کے جانے سے دوسرا تو حیات ہے نا! مگر دوسرے سربراہ میں خامی یہی تھی کہ اسے شہر میں نئی نئی کپڑے کی دکان میں ملی نوکری نے غرور کو پلو سے باندھ کر باقی سب کو بیچ جاننے کا علم آ گیا تھا۔ اسی احساس اس برتری نے اس کی اور اس کی بیوی شاہدہ کی آنکھیں آسمان پر ٹکا دی تھیں اور مزدوری کرتا عاشق حسین کھلنے لگا تھا۔

سرداراں بی بی نے سب سے پہلے یہ بات محسوس کی تھی مگر گھر کا بڑا فرد ہونے کی وجہ سے مصلحتاً خاموش رہیں۔ دبے لفظوں میں چولہا علیحدہ کرنے کی بات بھی ہوئی مگر بلند اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ ابھی سرداراں بی بی موجود تھیں۔ انہی دنوں میں چرچا پورے گاؤں میں ہوا کہ فیکٹری بن رہی ہے شہر کے راستے پہ۔ وہاں مزدوروں کی مانگ ہے۔ یہ سنتے ہوئے عاشق حسین بھی چل پڑا۔ سارا دن مزدوری کرکے وہ اجرت لے کر گھر آ جاتا۔ اور سارے پیسے ماں کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔ عاشق کی بیوی سلامت بھی صبر والی عورت تھی۔

گاؤں میں بارشیں ہوئیں تو پانی عاشق حسین کے کمرے کی چھت میں سوراخ کرنے لگ گیا، بات سرداراں بی بی کے علم میں بھی آئی مگر کوئی حل نہ نکلا۔ سرداراں بی بی خالی جیب تھیں اور معشوق حسین اس کے پاس تو تھے ہی نہیں۔ تب عاشق نے مزدوری سے ملنے والی اجرت سے پیسے جوڑنے چاہیے۔ جس میں سلامت نے ہاں ملا دی۔ تب سلامت پیسے سرہانے میں رکھنے لگی۔ ایک روپے ملنے والی دہاڑی ایک روپے ہی رہی۔ مگر کسی نہ کسی بہانے سے ٹیڈی پیسہ جوڑتے جوڑتے تین روپے جڑ گئے جو اس سمے بہت تھے۔ مل مکمل ہونے میں ابھی وقت تھا مگر جو حصے بن گئے تھے ان میں کام شروع ہو چکا تھا۔ بس ایک شام معشوق حسین کے بیٹے نے چپکے سے عاشق حسین اور سلامت کو تکیے میں پیسے رکھتے دیکھ لیا۔ باتیں کانوں تک پہنچیں اور

لے بھی چند ہی گھڑیوں میں ہوگئے۔

سرداراں بی بی نے اس سے گندم دیکھی، وہ
س کلو پڑی تھی اور باقی سب شاہدہ نے لڑائی کے
وران سائیڈ پہ کر دیا تھا۔ معشوق نے عجیب لہجے میں
چھ سنا کر دس کلو گندم عاشق حسین کے کھاتے میں
ال دیا۔ بس سرداراں بی بی تھیں جو کہیں دو بیٹوں
کے درمیان رہ گئی تھیں۔ وہ رات سلامت اور عاشق
سین نے کھلی آنکھوں کے ساتھ گزاری تھی۔ تب
لامت نے آہستگی سے کہا تھا۔

"میرا اللہ بڑا رحیم ہے عاشق، وہ دلوں کے
الوں سے بھی باخبر ہے۔ دیکھنا وہ سوکھی گھاس کو ہرا
رنے میں دیر نہیں کرے گا۔"

عاشق کچھ نہ بولا تھا بس خاموشی سے تاروں
رے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

گھنگھور اندھیرے کے بعد صبح کی سنہری روشنی ہر
و پھیلنے لگی تھی۔ عاشق حسین کی آنکھ ساری رات نہیں لگی
ی صبح سلامت نے نماز پڑھ کر عاشق حسین سے کہا تھا۔

"عاشق ہمارے حصے میں جو گندم آئی ہے ناں اسے
وادو پھر مالک کی رضا۔ وہ ہمارا برتن خالی نہیں رکھے گا۔"

اس نے دس کلو کا تھیلا عاشق حسین کے سامنے
ھا۔ تب ہی کمرے تک پراٹھوں کی خوشبو آئی اور وہ دل
سوس کر رہ گئے عاشق نے تھیلا اٹھایا اور باہر نکل گیا۔
ارا دن مزدوری کرنے کے بعد وہ دوسرے گاؤں
لے رستے کی طرف آیا۔ راستے میں شیشم کے درخت
ے پاس آ کھڑا ہوا۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ
س کی طرح سلامت نے بھی صبح سے ایک بھی نوالہ حلق
ے نیچے نہیں کیا ہوگا۔ خالی سانسوں، بھری آنکھوں اور بے
اشادھوں کے ساتھ وہ چکی کی طرف چل دیا۔ مگر چکی بند
ی۔ باہر بیٹھا مالک یہ کہہ رہا تھا کہ چکی خراب ہے۔ صبح شہر
ا کر کسی کو لے کر آؤں گا۔ وہ ٹھیک کرے گا تب۔

"بھائی میں بڑی دور سے آیا ہوں۔"

"میں کچھ نہیں کرسکتا۔" مالک آرام سے اٹھا
ر شتر اٹھاتے ہوئے بولا۔ حسین کی آنکھیں چمکیں۔

"ہاں تو کیا ہوا بھائی؟" عاشق بغور دیکھ رہا تھا۔

"چلتے چلتے بند ہو گئی۔ اللہ جانے کون سی بیماری لاحق ہو گئی ہے اسے۔" وہ بے زار سا تھا، ظاہری بات تھی، کاروبار بند پڑا تھا۔

"میں دیکھ لوں۔"

"دیکھ لو۔"

عاشق حسین مشین دیکھنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد مالک بولا۔

"تم نے کہیں یہ سیکھا ہے عاشق!"

"ہاں جی، جہاں پہلے کام کرتا تھا نا بھائی، وہاں کے مالک نے مجھے سکھایا ہے یہ سب۔" وہ اب ایک نٹ کس رہا تھا۔

"پڑھے ہوئے ہو!"

"ہاں جی۔ پڑھا ہوا تھا میں نے، یہ بھی مالک نے ہی سکھایا۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد عاشق حسین نے بٹن دبایا تو چکی اسی روانی سے چلنے لگی۔ جس روانی سے چلا کرتی تھی۔

مالک حیران وپریشان سا چلتی چکی کو دیکھنے لگ گیا۔

"اوئے مدثر، باؤ کے لیے میٹھی لسی لے کر آ۔"

تقریباً بیس منٹ کے بعد چکی کے مالک نے عاشق حسین کی عاجزی دیکھ کر اسے پانچ کلو دیسی گھی، دس کلو دیسی چینی، بیس کلو آٹا اور تین کلو شکر اپنے بیٹے کے ہاتھ عاشق حسین کے ساتھ روانہ کی اور دس روپے دے کر ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

"بھائی عاشق، میں تمہاری خدمت نہیں کرسکا، لیکن کل صبح آپ مل آجانا۔ وہاں میں بجلی والوں میں تمہیں رکھوادوں گا۔ وہ تمہیں پکا مکان بھی دیں گے اور سب کچھ بھی مہیا کریں گے جو ضرورت ہوگی۔ پانی اور بجلی بھی فری۔" عاشق حسین نے مالک کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ خالی آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

جن آنکھوں میں دکھ تھا۔ وہاں شکر آ گیا تھا اور یہ سلامت کے کامل یقین اسے سب کچھ ملا تھا اور بے شک یقین کامل ہی تو بندگی ہوتی ہے۔

☆☆

شعلہ عزیز

کرن کرن خوشبو

القرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔
کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر خدا کے حکم سے اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ اور خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔
(سورۃ التغابن...... 11)

حدیث نبوی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
کثرت سے "لاحول ولاقوۃ الاباللہ" پڑھا کرو کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے
(مسند احمد 5473 لیلۃ الصحیح 2780)

پانچ گناہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"جس قوم میں خیانت ظاہر اور کھلم کھلا ہونے لگتی ہے۔ تو اللہ پاک اس قوم کے دل میں اس کے دشمنوں کا خوف اور ڈر ڈال دیتا ہے۔ اور جب کسی قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے تو اس قوم میں بکثرت موتیں ہونے لگتی ہیں۔ اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے۔ اس قوم کی روزی کاٹ دی جاتی ہے اور جو قوم ناحق فیصلہ کرنے لگتی ہے اس قوم میں خون ریزی پھیل جاتی ہے۔ اور جو قوم عہد شکنی اور بدعہدی کرنے لگتی ہے اس قوم پر اس کے دشمن کو۔ غالب ومسلط کردیا جاتا ہے
۔(مشکاۃ المصابیح۔ 2/276 حدیث 5370۔ الکامل فی ضعفاء الرجال 4/402 رقم 801)

"اے ابوالحسن! آپ نے سچ کہا۔"

عائشہ کیانی......لاہور

سنہری موتی

☆ لوگ آپ کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کریں گے اگر آپ ہمیشہ شکایت کرتے رہیں گے اور اپنی ناراضی اور غم کا اظہار کرتے رہیں گے۔
(اسٹیفن ہاکنگ)

☆ جرأت انسانی صفات میں سب سے بنیادی صفت ہے باقی سب اس کی وجہ سے ممکن ہوا کرتی ہے۔ (ارسطو)

☆ شہر کے لوگوں نے آزادی کے لیے تابوت بنائے اور محبت کے لیے بارڈر۔ لیکن اس بات سے بے خبر تھے کہ نہ تو آزادی تابوت میں دفن ہوتی ہے اور نہ ہی محبت سرحدوں پر ختم ہوگی ہے۔ (چی گویرا)

☆ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا مذہبی عقیدہ کسی دوسرے سے نفرت کی ترغیب دے رہا ہے تو پھر یقیناً آپ کو مذہب کی ضرورت نہیں بلکہ شعور کی ضرورت ہے (مولانا وحیدالدین)

عائشہ کیانی......لاہور

ہمدردی یا سر دردی

ایک شخص نے ڈاکٹر کو فون پر بتایا۔ "ڈاکٹر صاحب میری بیوی کے گلے میں کچھ تکلیف ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل رہی ہے اور وہ بول بھی نہیں پا رہی آج یا کل صبح یا اس ہفتے میں کسی دن آپ کا اتفاق گزر ہو تو اس کا گلا دیکھ لیجیے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "ارے جناب! جب آپ کی بیوی کچھ بول نہیں پا رہی ہے تو میں ابھی آتا ہوں۔ میں بالکل فرصت میں ہوں۔"

اس شخص نے پست آواز میں جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب میں کسی مصروف ڈاکٹر سے رابطہ کرلوں گا۔"

حریم مسلمان......کراچی

اللہ الصمد

عطا اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ میں جیل میں تھا تو خیال آیا کہ قرآن مجید کا وہ ترجمہ پڑھنے کی سعادت حاصل کروں جو حضرت شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

میں نے قرآن مجید جیل میں منگوایا اور پڑھنا شروع کیا جب میں "اللہ الصمد" پر پہنچا تو اللہ الصمد کا جو معنی شاہ عبدالقادرؒ نے لکھا تھا وہ اس سے پہلے نہ کہیں پڑھا تھا نہ سنا تھا۔

شاہ صاحب نے اللہ الصمد کا معنی "نراسترک" لکھا ہوا تھا جو مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں بڑا بے چین ہو گیا پھر مجھے خیال آیا جیل میں ایک ہندو پنڈت بھی قید ہے اس سے "نراسترک" کے معنی پوچھتا ہوں۔ حضرت عطا اللہ شاہ بخاری کہتے ہیں میں اس پنڈت کے پاس گیا اس سے ساری بات کی اور پوچھا کہ "نراسترک" کے کیا معنی ہیں۔ میرا پوچھنا تھا کہ پنڈت وجد میں آ کر جھومنے لگا۔ کافی دیر بعد وہ ہوش میں آیا تو میں نے اس سے کہا۔

"بندے میں نے تو نراسترک کے معنی پوچھے اور تو وجد میں آ گیا۔ اس میں ایسا کیا ہے؟"

پنڈت نے جواب دیا۔ "سن سکے گا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کیوں نہیں۔"

پنڈت نے کہا "پھر سن۔ نراسترک، سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "وہ جس کا کام کوئی روک نہیں سکتا اور اگر وہ نہ چاہے تو کسی کا کام ہو نہیں سکتا۔"

(فرخندہ سلیم......ملتان)

بائیس سالہ ٹریننگ

ایک شخص بائیس سال کی ٹریننگ کے بعد جب محاذ پر گیا تو اس نے آفیسر سے پوچھا سر!

"بندوق کا منہ اپنی طرف کرنا ہے یا دشمن کی طرف؟"

آفیسر غصے سے بولا: "بیٹا! تو جدھر بھی کرے فائدہ ملک کا ہی ہے۔"

تبلیغی اجتماع

پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا۔

"تبلیغی جماعت والوں کو کہیں، اتنا بڑا مذہبی اجتماع بھارت جیسے سیکولر ملک میں نہ کیا کریں۔"

جواب میں ابوالکلام رحمتہ اللہ نے کہا۔

"جی آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ ان کے اجتماع میں جا کر آپ بھی ان کی باتیں، تقاریر اور نصائح سنیں، وہ آسمان سے اوپر کی باتیں کرتے ہیں یا زمین سے نیچے کی باتیں کرتے ہیں۔ زمین کے اوپر کی باتیں نہیں کرتے۔"

نظم

تم نے پوچھا تھا نا
محبت کیا ہے
تو سنو!
محبت سحری میں پیے گئے
آخری گھونٹ کی طرح ہونی چاہیے
جس کو پینے کے بعد دوسرے کی گنجائش
نہ ہو......!

نوشی مغل......جلال پور بھٹیاں

☆☆

بُشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

افشاں سمیع کی ڈائری میں تحریر

راحیل فاروق کی غزل

مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا
کم بخت محبت میں مگر کیا نہیں ہوتا

محسوس تو ہوتا ہے، ہویدا نہیں ہوتا
اک حشر ہے سینے میں کہ برپا نہیں ہوتا

کب سامنے آنکھوں کے مسیحا نہیں ہوتا
گویا نہیں ہوتا تو مداوا نہیں ہوتا

آئینہ کی صورت کا بھروسا نہیں ہوتا
تجھ سا کوئی ہوتا ہے وہ مجھ سا نہیں ہوتا

ہم تیرے سہی، وقت کسی کا نہیں ہوتا
کس بھول میں ہے تو کہ ہمارا نہیں ہوتا

اس حال کو پہنچائے ہوئے آپ کے ہیں ہم
پہچان ہی لیں آپ سے اتنا نہیں ہوتا

مردے بھی تو آخر کبھی جی اٹھتے ہیں
بیمار ترا وہ کہ اچھا نہیں ہوتا

دانستہ محبت میں کسی کی ہو گرفتار
اتنا بھی کوئی عقل کا اندھا نہیں ہوتا

شاید ترے جوہر نہ کھلیں عشق میں راحیل
افسوس، یہاں ایسے کو تیسا نہیں ہوتا

فوزیہ ثمر بٹ کی ڈائری میں تحریر

کومل جوئیہ کی غزل

ضبط کھونے کی اذیت کو کہاں سمجھو گے
چھپ کی رونے کی اذیت کو کہاں سمجھو گے

جس جگہ خواب اگائے تھے وہاں آنکھوں میں
درد ہونے کی اذیت کو کہاں سمجھو گے

جس کو رعنائی تلک گھر میں رکھا جاتا ہے
اس کھلونے کی اذیت کو کہاں سمجھو گے

گھر کے دالان، سدا وسعتیں آباد کہ تم
ایک کونے کی اذیت کو کہاں سمجھو گے

سینکڑوں لوگ میسر ہیں رفاقت کے لیے
تم "نہ ہونے" کی اذیت کو کہاں سمجھو گے

فرخندہ سلیم کی ڈائری میں تحریر

پروین شاکر کی غزل

اب بھلا چھوڑ کے گھر کیا کرتے
شام کے وقت سفر کیا کرتے

تیری مصروفیتیں جانتے ہیں
اپنے آنے کی خبر کیا کرتے

جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے شمس و قمر کیا کرتے

وہ مسافر ہی کھلی دھوپ کا تھا
سائے پھیلا کے شجر کیا کرتے

خاک ہی اول و آخر ٹھہری
کر کے ذرے کو گہر کیا کرتے

رائے پہلے سے بنا لی تو نے
دل میں اب ہم تیرے گھر کیا کرتے

عشق نے سارے سلیقے بخشے
حسن سے کسب ہنر کیا کرتے

☆☆

کچھ موتی چنے ہیں ...... ادارہ

زرِ مبادلہ

ایک بار میں نے خط لکھا، کچھ روپے بھیج دیجیے کارِ خیر کے لیے درکار ہیں۔

خط ملتے ہی روپے بھیج دیے۔ توقع سے زائد میں نے شکریہ کے خط میں لکھا۔

"بخاری صاحب! میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا۔ اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا۔ مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی۔ کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور اگر اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لے لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کارِ خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک کے تمام گناہوں کے لیے ایسی ہی ثابت ہوگی۔"

بخاری نے لکھا؟ مژدے کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو شرحِ مبادلہ زرا تنا خاطر خواہ نہ رہے۔"

(رشید احمد صدیقی ...... ہم نفسانِ رفتہ)

فرخندہ سلیم ...... ملتان

ذہنی معیار

ادبی حلقوں اور شام نشستوں کی ایجنسیوں کے لوگوں کا ذہنی معیار کیسا ہوتا تھا۔ اس کے دلچسپ قصے مشہور تھے۔ اس واقعہ کے راوی فارغ بخاری ہیں۔ پشاور سے نکلنے والا جریدہ "سنگ میل" ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا ادارہ میں فارغ بخاری اور رضا ہمدانی شامل تھے۔ شمارے کے سرورق پر ادارہ اور اس کے نیچے ان دونوں کے نام ہوتے تھے انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگی تو سنگ میل کی اشاعتیں ممنوع قرار پائیں۔ پولیس ان دونوں حضرات کو پکڑ کر لے گئی۔ دو دن بعد تھانیدار نے فارغ بخاری کو بلایا اور کہنے لگا۔

"فارغ صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان شاء اللہ آپ کو کوئی تکلیف بھی نہیں ہونے دوں گا۔ آپ صرف اتنی مدد کریں کہ اپنے تیسرے ساتھی کو پکڑوا دیں۔ دو کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ لیکن تیسرے کے لیے ہم نے سارا شہر چھان مارا ہے۔"

فارغ بخاری نے پوچھا "تیسرا کون؟"

تھانیدار بولا۔ "ادارہ جس کا نام سب سے اوپر لکھا ہے۔"

(رشید امجد ...... تمنا بے تاب)

فوزیہ ثمر بٹ ...... گجرات

تقدیر

انسان کس قدر مختار ہے اور کتنا مجبور اس کا اپنا ارادہ نتائج پر کہاں تک حاوی ہے اور نتائج اس کے ارادے سے کیسے آزاد ہیں؟"

"تم جانو کہ اللہ نے ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی۔ مرد عورت زوج ...... رات دن زوج ...... نیکی بدی جوڑا۔ حتیٰ کہ پہاڑ بھی male اور Female ہوتے ہیں دل میں لہو بھی زوج کی شکل میں رہتا ہے، گندا اور صاف لہو ساتھ ساتھ ...... اگر صرف پوزیٹو کرنٹ سے روشنی پیدا کرو گی تو بجلی نہیں جلے گی، پھر نیگیٹو کرنٹ بھی ملانا پڑے گا۔ ایسے ہی انسان کی خود مختاری اور قسمت زوج ہیں۔ ساتھ ساتھ ریل کی پٹڑی کی طرح چلتی ہیں۔ جہاں دونوں کا میل ہوتا ہے۔ وہاں کرنٹ پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی کا بقعہ نور ...... بربادی کا گھپ اندھیرا سب ان دونوں کے ملاپ سے ہے۔"

(بانو قدسیہ ...... سامانِ وجود)

عائشہ گیلانی ...... لاہور

لب پہ بکھرے رنگ

خواتین سے اگر پوچھا جائے کہ میک اپ میں سب سے زیادہ انہیں کیا پسند ہے؟ تو اکثر خواتین کا جواب ہوگا "لپ اسٹک۔"

اس بات میں شک نہیں کہ میک اپ کی اصل شان لب پہ بکھرے منفرد رنگ ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لپ اسٹک کا انتخاب آپ کی شخصیت کے لیے بہت زیادہ اہم ہوتا ہے کیوں کہ آپ کے ہونٹ ہی آپ کے چہرے میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

لپ اسٹک لگاتے وقت چار اہم اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ (۱) ہونٹوں پر کسی بھی طرح کی لپ اسٹک لگاتے وقت ہونٹوں کی خشکی دور کرنے کے لیے ہلکا سا موائسچرائزر لگانا چاہیے یا کوئی معیاری کریم لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد کسی کھردرے کپڑے یا تولیے سے پونچھ لیں۔ (۲) ہونٹوں پر فاؤنڈیشن کی بے حد خفیف سی تہ لگائی جاتی ہے تاکہ ہونٹوں کی رنگت متوازن ہوسکے۔ (۳) لپ اسٹک سے ایک شیڈ گہرے رنگ کی لپ پنسل۔ (۴) باریک بالوں والا لپ برش، تاکہ لپ پنسل اور لپ اسٹک کو بلینڈ کیا جاسکے۔

لپ اسٹک کے رنگ کے انتخاب سے پہلے اپنی جلد کی رنگت کو پہچاننا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس کی مناسبت سے لپ کلر خریدا جائے عام طور پر جلد کی چار اقسام ہوتی ہیں کالی، سانولی، گندمی اور گوری رنگت۔ اپنی جلد کی رنگت کو پہچاننے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنی کلائی کی نسوں کے رنگ کو پہچانیں اگر آپ کی نسوں کا رنگ نیلا یا جامنی ہے تو آپ کی رنگت گوری یا ٹھنڈی کہلائے گی، اور اگر نسوں کا رنگ ہرا ہے تو آپ کی رنگت سانولی، کالی، ڈارک یا گرم کہلائے گی اور اگر آپ ہرے یا نیلے رنگ کو پہچان نہیں پارہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی جلد کا رنگ نیوٹرل یا گندمی ہے جسے (اولیو) کلر بھی کہا جاتا ہے۔

لپ اسٹک ہمیشہ جلد کی رنگت اور ہونٹوں کی شیپ کے مطابق لگانی چاہیے۔ اگر لباس اور جیولری سے میچنگ کرکے لپ اسٹک لگائی جائے تو چہرہ بدنما اور بھدا بھی لگ سکتا ہے۔ اگر لباس سادہ، نفیس اور ہلکے رنگ کا ہو تو لپ اسٹک ڈارک شیڈ کی (سرخ، بیج اور برائٹ) لگانی چاہیے اور اگر کپڑے چمکیلے اور کھلتے ہوئے رنگ کے ہوں تو لپ اسٹک ہلکے شیڈ کی لگانی چاہیے کلائی یا ہتھیلی پر لپ اسٹک لگا کر چیک کرنے کے بجائے فنگر ٹپ پر لپ اسٹک کا شیڈ چیک کریں جو کہ ہمارے ہونٹوں کے رنگ سے قدرے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ ایک وقت میں آنکھوں اور ہونٹوں پر ڈارک شیڈ نہیں لگانا چاہیے۔

لپ اسٹک لگاتے وقت پہلے لپ پنسل سے ہونٹوں کی آؤٹ لائن دیں تاکہ ہونٹوں کی شیپ واضح ہوسکے۔ عام طور پر خواتین ڈارک شیڈز کی لپ پنسل استعمال کرتی ہیں اسے بلینڈ نہیں کرتیں جو کہ غلط طریقہ ہے، اس لیے لپ اسٹک برش کی مدد سے لپ اسٹک ہونٹوں کے وسط سے لگاتے ہوئے آؤٹ لائن تک لائیں اس دوران ہونٹوں کو بالکل ڈھیلا چھوڑیں۔

اگر آپ کی رنگت گلابی مائل گوری ہے تو (چیری ریڈ) کا انتخاب کریں اور اگر آپ کا ڈیلو کلر ہے تو سرخ رنگ (فائر ریڈ) استعمال کریں۔ گل اناری۔ براؤن، میرون رنگ کی لپ اسٹک ہر رنگ کی عورتوں کو سوٹ کرتا ہے۔ ڈارک رنگت والی خواتین کو ڈیپ اور ڈارک کلر چاکلیٹی براؤن، ڈیپ پلم اور ڈارک ریڈ لپ اسٹک سوٹ کرتی ہے۔ ڈارک رنگت والی خواتین کو (لائٹ پنک اور بیج کلر استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ گوری خواتین پلم اور پنک کے تمام شیڈز آسانی سے استعمال کرسکتی ہیں۔ سانولی اور ڈارک براؤن رنگت والی خواتین کو روز میری اور پنک کے ڈارک شیڈز استعمال کرنا چاہئیں۔ کوپر بے بی پنک، گولڈن اور شمرز کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ چکنی جلد اور سانولی رنگت والی لڑکیوں کو گلوز کے بجائے میٹ لپ اسٹک کا استعمال کرنا چاہیے۔

چکن تواپیس

اجزاء

مسالے کے لیے

دہی	دو کپ
جائفل جوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
نمک	حسب ضرورت
پسی کالی مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچ
پسا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچ
پسی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
پسا زیرہ	ڈیڑھ چائے کا چمچ
کٹا دھنیا	ڈیڑھ چائے کا چمچ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
چکن	رانیں تین لیگ اور دو سینہ کے
نمک	حسب ذائقہ
سرکہ	دو کھانے کا چمچ
کوئلہ	ایک ٹکڑا
تیل	ایک چائے کا چمچ

چکن توا کے اجزاء

تیل	دو چائے کے چمچے
ہری مرچ	تین سے چار عدد
لیموں	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چکن کے ٹکڑوں پر کٹ لگائیں اور نمک اور سرکہ لگا کر دو تین گھنٹے کے لیے میرینیٹ کریں۔ ایک پیالے میں چکن مسالے کے سارے اجزاء ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔

چکن کو کوئلہ کا دھواں دیں۔ پھر توے پر تیل گرم کریں اور چکن کو دونوں طرف سے تین سے چار منٹ تک فرائی کرلیں۔ چکن مسالا جو پہلے تیار کیا تھا اسے چکن پر اچھی طرح لگائیں اور پانی خشک ہونے تک پکالیں۔ اس میں ہری مرچ، ہرا دھنیا اور لیموں کا رس شامل کردیں۔ دس منٹ پکائیں اور نان کے ساتھ پیش کریں۔

عید اسپیشل ڈیزرٹ

اجزاء

چاشنی کے لیے

چینی	ایک کپ
پانی	دو کپ
زعفران	دو سے تین پتیاں
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ

کریمی ربڑی کے لیے

دودھ	ڈھائی کپ
چینی	دو کھانے کے چمچے
کارن فلار	دو کھانے کے چمچے
فریش کریم	آدھا کپ
بادام۔پستہ	سجاوٹ کے لیے
رسک	حسب ضرورت

ترکیب:۔

ایک پین میں دو کپ پانی ڈالیں پھر اس میں ایک کپ چینی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ اس میں زعفران یا زردے کا رنگ اور لائچی پاؤڈر ڈال دیں۔ جب چپچپاہٹ آجائے تو چولہا بند کردیں۔ آدھا کپ دودھ میں کارن فلار گھول لیں۔ ایک پین میں دو کپ دودھ ڈالیں جب دودھ میں ابال آجائے تو چینی ڈال دیں۔ پھر اس میں کارن فلار تھوڑا تھوڑا کرکے ڈالیں۔ چمچہ مستقل ہلاتے رہیں۔ پانچ منٹ ہلکی آنچ پر پکانے کے بعد اس میں کریم ملادیں۔ چولہا بند کردیں۔

اسکوائر ڈش لیں اس میں کیک رس کی تہ لگادیں۔ اس پر اچھی طرح چاشنی ڈالیں۔ رسک بھیگ جائیں۔ اب دودھ کریم کا آمیزہ ڈالیں۔ اسی طرح دوبارہ رسک کی تہ لگائیں، چاشنی ڈالیں اور پھر باقی دودھ کریم کا آمیزہ ڈال دیں۔ پستہ بادام سے سجائیں اور فریج میں رکھ دیں ٹھنڈا ٹھنڈا پیش کریں۔

ٹوٹکے

اکثر قمیص دھلنے کے بعد اس کا کالر پوری طرح صاف نہیں ہوتا اس کے لیے قمیص دھونے سے پہلے کالر پر تھوڑا سا شیمپو لگا کر رگڑیں پھر قمیص دھولیں کالر بالکل صاف ہو جائے گا۔

☆ اگر آپ چاہتے ہیں کہ جوتے کی پالش چمکے تو پالش سے پہلے جوتے پر تھوڑا سا سرکہ ملیں پھر پالش کریں جوتے چمک جائیں گے۔

☆ آنکھوں کے گرد وٹامن ای کا تیل لگائیں اس سے حلقے ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ ململ کے کپڑے پر نارنگی کا رس لگا کر آنکھوں پر رکھنے سے بھی حلقے ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ صابن کی ٹکیہ پر نمک چھڑک دو۔ صابن بہت دیر استعمال ہوگا۔

☆ کپڑوں پر اگر بال پوائنٹ کا دھبہ لگ جائے تو جہاں دھبہ لگا ہو وہاں کپڑے کے نیچے اخبار رکھ دیں پھر تھوڑ روئی میں بھگو کر لگائیں، دھبا اخبار میں جذب ہو جائے گا۔ بعد میں کپڑے کو صاف پانی سے دھولیں۔

☆ اگر کسی کو شوگر ہو جائے تو اسے لہسن زیادہ مقدار میں کھلائیں۔

☆ بے خوابی کی شکایت دور کرنے کے لیے سرخ ٹماٹر پر چینی چھڑک کر کھائیں۔

☆ جو لوگ گڑ والی چائے پیتے ہیں ان کی چربی کم ہونے لگتی ہے اور قبض کا مسئلہ نہیں رہتا۔

☆ املی کے پانی سے برتن دھونے سے برتن چمک جاتے ہیں۔

☆ پیاز کو کوٹ کر سونگھنے سے سر کا درد ختم ہو جاتا ہے۔

☆ بعض دفعہ مہندی کا رنگ ہلکا آتا ہے جب مہندی سوکھ کر جھڑ جائے تو اس پر پان میں استعمال ہونے والا چونا لگا لیں۔

☆ دمہ اور مٹی سے الرجی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے روزانہ صبح اور شام دو مرتبہ ڈیڑھ کپ پانی میں ایک چمچ گل زوفہ شامل کریں اور اس پانی کو اتنا پکائیں کہ یہ ایک کپ رہ جائے اسے چھان کر گرما گرم پی لیں۔ دن میں دو مرتبہ استعمال کریں۔

☆ ناف میں اصلی گھی انگلی کی مدد سے لگائیں۔ اور مستقل ایکنی، پھٹے ہونٹ چہرے کے داغ دھبوں سے نجات پائیں۔ یہ ٹوٹکا مستقل کرتے رہیں۔

صبح پان کے پتے کا ایک ٹکڑا کھانے سے جوڑوں کے درد میں فائدہ ہوگا۔ ہاضمے کے لیے بھی مفید ہوگا۔ اکثر لوگوں کا ہاضمہ خراب رہتا ہے۔ جگر میں خرابی رہتی ہے۔ پیٹ میں گیس بنتی ہے تو صبح پان کے پتے کا ٹکڑا چبائیں۔ پان کا پتا خون صاف کرتا ہے اور معدے کی گرمی کم کر کے ایکنی کا صفایا کرنے کے ساتھ ہی یہ چہرے کو صاف وشفاف اور رنگ صاف کرنے میں آپ کی مدد کرتا ہے۔

☆ اگر کچن کیبنٹ میں لال بیگ ہو جائیں تو وہاں تھوڑا سا پودینہ جلا دیں۔

☆۔ ہیر ریمور کریم میں تھوڑا سا ٹوتھ پیسٹ ملا کر لگائیں کئی مہینوں تک بغل میں بال نہیں بڑھیں گے۔

☆ جو لوگ زیادہ پیدل سفر کرتے ہیں ان کی ایڑیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے پیاز کا آدھا ٹکڑا ایڑیوں پر ملیں اور پھر دھولیں۔

☆ ٹماٹر پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر روزانہ دانتوں پر ملیں اس سے آپ کے دانت جلد صاف ہو جائیں گے۔

☆ بلغمی یا سوکھی کھانسی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک چمچ میتھی دانہ، ایک چمچ السی کے بیج اور ایک چوتھائی چمچ کلونجی کو تین کپ گرم پانی میں شامل کریں اور زیادہ سے زیادہ چار منٹ پکائیں پھر چولہا بند کر دیں۔ چھان لیں۔ دن میں دو مرتبہ نیم گرم پئیں۔

☆۔ گھر کے فرش اور ٹائلوں کو چمکانے کے لیے نیم گرم پانی ایک بالٹی۔ سفید سرکہ چار چمچے، ڈش واش لیکوئڈ تین چمچے۔ سرف تین چمچے۔ نمک چار کھانے کے چمچے۔ دو لیموں کا رس اور تیل کے دو چمچے۔ نیم گرم پانی میں تمام اجزاء ملا لیں صاف موٹے کپڑے کو بالٹی میں بھگو کر ٹائلوں اور فرش کو اچھی طرح صاف کریں۔ یہ عمل ایک ہفتہ تک روزانہ کریں۔

☆☆

نامے میرے نام

فرخندہ سلیم ...... ملتان

میری طرف سے آپ تمام کو عید بہت بہت مبارک ہو۔ سرورق تو سالگرہ کی مناسبت سے بہت ہی دلکش دیا گیا۔ "اداریہ" پڑھ کر خوشی ہوئی کہ کرن نے 46 سال مکمل کر لیے ہیں اور کچھ سال بعد گولڈن جوبلی منائے گا "حمد و نعت" پڑھ کر سکون سا ہوا۔ ساتھ رائٹرز کا سروے کر کے شاہین رشید نے سالگرہ کا پہلا تحفہ دیا اور تمام رائٹرز نے بہت اچھے جوابات دیے خاص کر نایاب جیلانی جو بہت اچھا لکھتی ہیں، کرن میں کہانی دیں، نازیہ کنول نازی کا ابھی کچھ وقت پہلے کرن کا ناول "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" مجھے بہت پسند آیا تھا کاش یہ مزید کرن میں لکھیں قرۃ العین ہاشمی وسکندر، سنیعہ عمیر، راشدہ رفعت اور بشریٰ احمد کی حاضریاں بھی خوب تھیں۔ اداکار سے ملاقات بالکل پسند نہیں آئی۔ "دامن سحاب" کی آخری قسط بہت شاندار تھی۔ سلوئی کی زندگی میں نئے شخص کی آمد ہوئی جو اچھی رہے گی، حیا اور جرار کی خوش گوار اینڈنگ۔ اسفند کو اپنی غلطی احساس ہوا مگر دیر ہو چکی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیرون ملک چلا گیا اور یہ ناول کرن میں ہر ماہ کامیابی سے آیا اور ہم سب نے بہت ہی پسند بھی کیا تو میری طرف سے مہوش کو بہت مبارک باد۔ "تاش گھر" تو مجھے ہمیشہ سے ہی اپنی انفرادیت کی بناء پر بے حد پسند ہے ایمل نے بہت ہی منفرد انداز میں ناول لکھا ہے خاص کر ماضی کے حالات و واقعات ہمیشہ سے ہی اچھے رہے۔ اب باریشہ کو اللہ کرے جلد عقل آ جائے جواب بھی چاند کو غلط سمجھ رہی ہے جو اس کی سچی خیر خواہ ہے اور اپنے دشمنوں کے جال میں بری طرح پھنستی جا رہی ہے۔ صندل کا اس قسط میں ذکر نہیں ہوا خیر تحریر کامیابی سے اپنی منازل طے کر رہی ہے۔ "سپاس گزار" پر اگلے ماہ بعد تبصرہ کروں گی کہ آخری قسط ہو گی۔ سالگرہ نمبر کا دوسرا تحفہ نگہت سیما کا طویل ترین مکمل ناول تھا جس نے سالگرہ نمبر کا لطف دوبالا کر دیا۔ یہ ناول اتنا پسند آیا کہ الفاظ نہیں تعریف کے، کہ روانی تحریر میں بہت تھی۔ طویل ہونے کے باوجود بھی بالکل بوریت نہیں ہوئی بلکہ طویل ہونے کی وجہ سے ہی ناول زیادہ پسند آیا۔ فاخرہ شاہین کی بلاوجہ کی انا کی وجہ سے کتنے لوگوں کی زندگیاں متاثر ہوئیں۔ نور اور نجلہ کا آخر میں کتنی طویل مسافت کے بعد ملن ہوا۔ کہانی میں حویلی کی منظر کشی اور واقعات اور تفصیل بہت عرق ریزی سے نگہت نے لکھے۔ کردار زیادہ تھے مگر سب اچھے سے ہینڈل کیے۔

اس بار سالگرہ کی وجہ سے افسانے زیادہ تھے اور سارے ہی بہت دلچسپ اور سبق آموز تھے یعنی "سپر اسٹار بھابھی" جو آج کل کی یہ خرافات ٹک ٹاک میں پڑ گئی اور جب جگ ہنسائی ہوئی تو آخر میں عقل آئی۔ نازنین فردوس کا مزاحیہ سا افسانہ بھی پسند آیا کہ کچھ منفرد رہا۔ لڑکی سگھڑ شاید اگلے گھر جا کر ہی ہو جائے۔ عندلیب زہرا ہمیشہ سے ہی بہت دلچسپ و متنوع موضوعات پر لکھتی ہیں ساتھ ساتھ اصلاحی بھی ہوتے ہیں۔ افسانہ لکھنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ "اباجی کی دلہن" گھر اباجی کی پسند سے آئی تو یہ ہی اچھا ہوا جس کو دیکھ کر بہوؤں کے منہ پر بارہ بج گئے۔ فاتحہ رابعہ نے اپنی تحریر میں اچھا سبق دیا جو بیٹے نے باپ (جس میں کچھ پاگل پن سا نظر آ رہا تھا نفسیاتی سا لالچی شوہر کہیں کا) کی عادت نہیں اپنائی بلکہ ماں کی سیکھ صحیح تھی جو ایک نئی سوچ دے رہی تھی۔

نظیر فاطمہ بھی افسانہ نگاری میں ایک اچھا اور جانا پہچانا نام ہیں اور "عیدی" افسانہ بھی ایک اچھی سوچ عطا کر رہا تھا جس میں نند کا کردار بہت مثبت تھا جو قابل غور ہے افسانہ "ری مائنڈر" میں بالکل درست کہا گیا کہ کسی دوسرے کو آزمائش میں دیکھو تو یہ نہ سوچو کہ یہ مکافات عمل ہے بلکہ یہ ری مائنڈر ہوتا ہے کہ یہ وقت کسی پر بھی آسکتا ہے خیر، بھابھی کی سوچ اچھی تھی۔ آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول بھی اچھا تھا اور انداز کچھ منفرد تھا۔ مستقل سلسلوں کی طرف چلی تو "کرن کرن خوشبو" تو ایک اچھا سا مکسچر تھا جس میں اصلاحی باتیں بھی تھیں اور دلچسپی بھی تھی۔ "یادوں کے دریچے" میں افشاں سمیع اور اقصیٰ شہزاد کا انتخاب زیادہ پسند آیا۔ "موتی چنے" میں کوئی بھی اقتباس پسند نہیں آیا کہ مجھے مرد حضرات کی تحریریں پسند نہیں تو خواتین کی ہی تحریریں اور اقتباس پسند ہیں۔ پکوانوں میں کرنچی چیز اسٹک کچھ منفرد تھی باقی سب روایتی مگر رمضان کی مناسبت سے صحیح تھیں۔

اس بار رمضان اور ہماری صحت پر بہت کارآمد سی ٹپس شامل رہیں جو ہمارے لیے بہت فائدے مند ہوں اگر عمل کریں تو ہی۔ بیوٹی باکس بھی ہمارے فیس کو خوب صورت بنانے کے لیے اہم کردار ادا کر رہا تھا کہ ساری ٹپس بہت آسان اور بے ضرر تھیں۔ نامے میرے نام میں اقصیٰ شہزاد کرسی صدارت پر اچھے سے متمکن تھیں۔ نوشی مغل، طیبہ شوکت اور صائمہ ریاض ہاشمی کی آمد بھی خوب رہی ہاں مگر پرانے قارئین یعنی فوزیہ ثمر بٹ، ساجدہ جاوید سندھیلو، مسکان نور، دیپک امان کور، ماریہ نظیر، حنا کنول فرحان، بشریٰ، فرزانہ امین، سسٹرز صدف، طوبیٰ اور مقدس سسٹرز، ثریا راجپوت، عائشہ کیانی، زرتاشیہ نعمان، اقصیٰ امان اور دیگر جلد حاضر ہوں۔

ج: فرخندہ! طویل عرصے بعد اس محفل میں شریک ہوئیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اتنے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری دی۔ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔ ہمارے لیے تو قارئین کی رائے تو بہت ضروری ہوتی ہی ہے۔ لیکن ہماری رائٹرز بھی منتظر ہوتی ہیں کہ ان کی تحریر کو کتنا پسند کیا گیا۔

حسینہ کرم راؤ......لیہ سے

سب سے پہلے تو میری طرف سے سب ادارے والوں پڑھنے اور مصنفین کو ماہ رمضان اور ایڈوانس میں عید مبارک ہو اور میری کیوٹ اور پیاری سی دوست نوشی کو اسپیشلی عید مبارک اور منگنی کی سالگرہ مبارک ہو۔

کرن کے صفحات پر اپنا نام دیکھ کر میری آنکھیں پتھر کی ہوئیں۔ اور پھر معدے گردے دہلا دینے والی میری ڈھیروں ڈھیر چیخیں زمین کی حدود کو چھونے لگیں۔ مجھے بالکل بھی یقین نہیں آیا کہ یہ میرا نام ہے۔ مارچ کا شمارہ سالگرہ کا تھا تو بہت ہی انتظار کروایا کرن نے اس بار۔ شرمائی لجائی سی ماڈل ہم سے نظریں چرائے ہوئے تھی۔ جو ہمیں اچھا لگا۔ (ہاہاہا)

"اداریہ" پڑھا تو پتا چلا کہ کرن میاں ہمارے دنیا کو شرف بخشنے سے تیس سال پہلے تشریف آور ہو چکے تھے۔ خیر کرن کو میری طرف سے سالگرہ مبارک ہو۔ ایک بات اور بتاتی چلوں۔ امی کا رویہ میرے کرن کے ساتھ سوکنوں سے بدتر ہوتا جا رہا ہے اور بہن بھائی اور ابو تو ظالم سماج بن کر میرے اور کرن کے درمیان آ چکا ہے۔ (ہاہاہا) اور سارے رسالے اب ٹرنک کی زینت بن چکے ہیں۔ ویسے مجھے کوئی منع نہیں ہے مگر اب فرسٹ ایئر کے پیپرز قریب آ رہے ہیں تو سختی بڑھتی جا رہی ہے۔ خیر کرن کو چھوڑنا میں نے بھی نہیں ہے۔ ای رکھ کر بڑی مشکل میں ہوں پلیز کمپیوٹر کو جسٹ پاس کرنے کا طریقہ بتا دیں۔ یہ کیس میں پھر ٹرین سے اتر گئی۔

اپنی پیاری پیاری رائٹرز کے بارے میں جان کر بڑا اچھا لگا اور تصویریں دیکھ کر تو بڑی خوشی ہوئی۔ پھر "دامن سحاب" سے آخری ملاقات تھی تو اس طرف دوڑے۔ مگر راستے میں حمزہ خان نے کالی بلی کی طرح راستہ کاٹا اور روکنے کی کوشش کی جس میں وہ

ناکام ٹھہرے۔

آخری قسط بہت اچھی تھی۔ بے چارے بہادر کے ساتھ تھوڑا برا ہوا۔ مگر غلطی اس کی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ حیا اور جرار والا سین اچھا لگا۔ نبیل اور سلوی کو بھی رائٹر نے ملوا دیا۔ اب اس سلسلے وار ناول کی جگہ آپ آسیہ رئیس خان یا سمیرا سرفراز سے لکھوائیں۔ جس کا ہیرو پولیس میں ہو۔

فاطمہ ہمارے انتظار میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی اسے حوصلہ دینے "سپاس گزار" پڑھنے آگئے۔ یہ سب اچانک کیا ہوا یہ موئی رطابہ سدھرنے والی نہیں۔ یہ کیا آخری قسط۔ میمونہ جی یہ آپ نے کیا کیا۔ پلیز سموئیل اور فاطمہ کو ملا دیجیے گا۔ اور زکی کو تو کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے، سمجھیں۔ "تاش گھر" کے بارے میں تو مت ہی پوچھیں۔ مجھے لگا تھا کہ سانول باریشہ کا ہیرو ہے مگر یہاں تو تین تین آگئے۔ مجھے لگتا ہے یہ ضامن ضرور کوئی گل کھلائے گا۔ سنبھل جا باریشہ۔ "نی کمالے تیرا بیڑا اتر جائے یہ تو کیا کر رہا ہے اپنی تعبیر کے ساتھ۔

"مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ بلکہ نمبر ون تھے۔ ایک بچ دو اجنبی۔" وصی تھوڑا خود غرض تھا مگر ثمرین نے اسے باور کروایا کہ انسان رشتوں کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔

افسانے اس بار اچھے تھے۔ اور نمبر ون قانتہ رابعہ جی رہیں۔ ان کا نام پہلی بار پڑھ رہی ہوں مگر انہوں نے لاجواب لکھا ہے۔ لاسٹ سین تو بہت مزے کا تھا۔ نازنین فردوس نے پکا میری نقل اتاری ہے۔ "کرن کرن خوشبو" سب ایک سے بڑھ کر ایک۔ مظلوم کون؟...... معصوم تو صرف ہم ہیں۔ (ہی ہی ہی)

"یادوں کے دریچے سے" افشاں کی ڈائری نمبر ون تھی۔ میری ڈائری میں تو صرف میری اپنی غزلیں ہیں مگر آپ کہاں چھاپتے ہو عام شاعروں کی۔ خیر طیبہ اور اقصیٰ کی غزلیں بھی اچھی تھیں۔

"کچھ موتی چنے ہیں" میں نوشی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ "کرن کا دسترخوان" آپ عجیب عجیب ڈشز کی ریسپیز بتاتے رہتے ہو۔ آپ سبزی بنانے کے طریقے بتایا کرو۔ تاکہ ہم بھی ٹرائی کر سکیں۔ میرا چہرہ بالکل صحیح ہے مجھے کسی چیز کو تھوپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (ہاہاہا)

پھر موسٹ فیورٹ "نامے میرے نام" پر آ گئے۔ خط اس بار مجھے کم لگے۔ نوشی کا خط پڑھا۔ نوشی چھیالیس کے تو میرے ابو ہوں گے۔ اپنے ان کا نام ہی بتا دیں۔ کان میں (ہاہاہا) آپ کے ابو کو نہیں پتا کہ آپ لکھتی ہیں میں تو ہر کام ابو سے پوچھ کر کرتی ہوں۔ میری طرف سے آپ کے بھائیوں کو شادی کی تیسری سالگرہ مبارک ہو۔ آپ دعا کرو میرے گیارہویں کے پیپر اچھے ہو جائیں۔ سب پڑھنے والے ہاتھ اٹھاؤ۔ اللہ میتوں کمپیوٹر پاس کرا دے۔ بس میکو چپلی نہ لگے۔ لمبا سا "آمین" بولیں۔ طیبہ کا خط بھی پڑھا اور یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی یہ بھی میری طرح معصوم ہے اور مجھ سے بھی دو تین سال چھوٹی ہیں حالانکہ میرے خیال میں ایک خرانٹ سی عورت کا خاکہ بنتا تھا۔ (ہی ہی ہی)

صائمہ ریاض سے تو میں کچی والی ناراض ہوں ان کو میرا نام نظر ہی نہیں آیا۔ میری آپ کی کٹی (ہاہاہا)

ج: حسینہ! آپ خط لکھیں گی تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ قارئین کی رائے ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ نوشی کو ادارے کا نمبر دیا ہے۔ آپ امتحانوں کے بعد ڈائجسٹ پڑھیے گا۔ پہلی ترجیح اپنی ایجوکیشن کو ہی دینی چاہیے۔

اقصیٰ شہزاد...... تلہ گنگ

ٹائٹل گرل اچھی لگ رہی تھی۔ "اداریہ" اب جب کرن ملا تو چھٹا روزہ تھا۔ اگلی بار جب ملے گا عید گزر چکی ہوگی اس لیے سب کو ایڈوانس عید مبارک۔ کرن 47 سال کا ہو گیا۔ مجھ سے تقریباً 24 سال بڑا ہاہاہا اب ساری بہنیں میری عمر کا حساب لگائیں گی ہاہاہا۔ آپی آپ کو اور پورے ادارے کو کرن کی

سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کرن یونہی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے اور اسی طرح اسے قابل اور محنتی لوگ ملتے رہیں آمین۔

"حمد اور نعت" کے بعد رائٹر سے ملے سب نے خوب جواب دیے۔ ان میں سے اب کوئی قسط وار ناول بھی لکھے۔ اور آپی سمیعہ عمیر کی پہلی کہانی کیا کرن میں شائع ہوئی تھی......؟

"دامن سحاب" کا اینڈ اداس کر گیا۔ اسفند اور سلوئی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ہادی اور ایلیا کی شادی کا بھی کوئی سین دکھاتے خیر اینڈ اچھا ہو گیا۔ مہوش جی بہت بہت مبارک اتنا اچھا ناول لکھنے پر۔ "گھمنڈ لڑکی" ہمارا تو اب تک کسی گھمنڈ لڑکی سے پالا نہیں پڑا ہاہاہا ہاں ڈائجسٹ میں تو پڑھتے رہتے ہیں۔

آسیہ جی کا ناول ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بعد میں پڑھوں گی۔ "سپر اسٹار بھابھی" پھر آ گئیں نئے شوشے کے ساتھ ویسے بھابھی نے تو عبایا پہن لیا لیکن جاوید بھائی بھی تو ساتھ تھے ویڈیو میں ہاہاہا "سپاس گزار" کی ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ شمشاد نے بالکل اچھا نہیں کیا فاطمہ کے ساتھ اب فاطمہ اور سموئیل کو ملا دیجیے گا۔ اور ذرار طابہ کو بھی عقل سکھایے گا۔ "ابا جی کی دلہن" واہ ابا ہوں تو ایسے ہاہاہا مجھے سوتیلے رشتے بہت اچھے لگتے ہیں۔ سوتیلے بہن بھائی ہاہاہا "تاش گھر" باریشہ کو ڈرانے والا زویا کا بیٹا نہ ہو۔ اسے تو باریشہ سے پیار ہو گیا لیکن لگتا ہے باریشہ کو ضامن اچھا لگا۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ تعبیر پھر پھنس گئی ایمل جی کچھ تو رعایت کریں تعبیر کے ساتھ۔

"دیا جلائے رکھنا ہے" اچھا افسانہ تھا شکر ہے شاہ زیب اپنے باپ جیسا نہیں نکلا بچوں کی تربیت کرنا صرف ماں کی ذمہ داری تو نہیں ہے۔ باپ کا کام کیا صرف پیسے کمانا ہے۔ "مجھے تاوان کیا دو گے" نگہت جی کا مکمل ناول اچھا تھا۔ شروع میں تو ناموں کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ لیکن آگے جا کے کہانی مزے کی تھی۔ "عیدی" اور "ری مائنڈر" سبق آموز افسانے تھے۔ "کرن کرن خوشبو" مظلوم کون ...... واقعی شہرزاد سمیت تینوں غزلیں پسند آئیں۔ "نامے میرے نام" پہلا خط میرا...... واہ! آپی آپ کا بہت سارا تھینکس اب جب ہر مہینے میرا خط پہلے نمبر پہ لگتا ہے تو ایسے میں چاچو حبیب کو تھینکس نہ کہنا غلط ہو گا۔ (جو مجھے ڈائجسٹ لا کے دیتے ہیں اور خط پوسٹ کرواتے ہیں) اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ آپ کے بچوں پہ ہمیشہ سلامت رکھے۔ اور آپ کو صحت و تندرستی والی لمبی زندگی دے۔ آمین۔ نوشی مغل منگنی کی بہت بہت مبارک۔ میں سمجھ سکتی ہوں آپ کی حالت جو آپ نے ہزار ہزار کے نوٹ دیکھ کے کنٹرول کیا ہاہاہا۔ آپی ام طیفور کب لکھیں گی۔

ج: اقصیٰ شہرزاد! دعاؤں کا شکریہ۔ ام طیفور ان شاء اللہ جولائی سے لکھنا شروع کر دیں گی۔ آپ کے چاچا کے ہم بھی شکر گزار ہیں کہ وہ آپ کو ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں۔ سمیعہ عمیر کی پہلی تحریر "کرن" میں نہیں شائع ہوئی تھی۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران حریم فاطمہ آمنہ بتول...... گجرات

ٹائٹل مجھے بہت پسند آیا۔ ہانیہ عمران بالکل ایسی ہی ہے۔ نظر بد سے بچائے دونوں کو ارے بھئی میری شہزادی ام ہانی اور ماڈل کو۔ عائزہ خان جان جہاں میں چھائی ہوئی ہیں۔

فروری کے "مقابل ہے آئینہ" اقصیٰ شہریار دل سے دعا کی تھی تمہاری تینوں خواہشات بہت جلد پوری ہو جائیں سب۔ اک نکی جی ریکویسٹ ہے۔ اسی لوڑ گئے بھئی ایس بے وفا دنیا سے تے سانوں بھلا ناں۔ جاناں، کبھی کبھی یار بھول کے یاد کر لینا۔ جیسے تمہاری خواہش سے دل بہت خوش ہوا ہے۔ پھر روح کو سکون ملے گا۔ ساڈے ارمان تے ذرا چیک کرنا۔

برسات میں چیزیں سمیٹتے ہوئے آدھی بارش ہو جاتی۔ کیا مطلب اس کا، کیا گھر میں چھتیں نہیں

دلوائیں۔ الغرض اقصیٰ شہزاد تمہارا پورے کا پورے آئینہ گھر پسند آیا ہے مجھے۔ "تاش گھر" اب زیادہ مزے کا ہوگا۔ کومل بیگم کے تھیلے میں جو بلی ہے۔ وہ باریشہ کو دکھا دیں یہ بلی چوہے کا کھیل ختم کریں۔ اب باریشہ کو بھی اپنی حماقتوں کا اندازہ ہو ذرا۔ چاند بی بی کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ کچھ لوگ پیدائشی بدنصیب ہوتے ہیں کہ دعائیں بھی ان کے آگے بے بس ہو جاتی ہیں۔ رائٹر جی اب بوڑھی جانوں کو کچھ رعایت دے دیں۔ کہ ان کے غم دیکھ دیکھ کر خود کا دل کرلانے لگتا ہے۔

"سپاس گزار" رطابہ نے زیور بابا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ آئینور کی رخصتی نہیں ہو سکتی۔ کیا شمشاد کہیں روپوش ہو گیا۔ یا پھر اوپر کا بلاوا آ گیا ہے۔ اللہ خیر رکھے۔ شمشاد نے بس دس سال میں آئینور کے ترلے منتیں ہی کی ہیں۔ ہنوں ایسا کیا ہو گیا کہ رخصتی ہی نہیں ہو گی۔

"دامن سحاب" اسفند یار تمہیں بس یہی کہنا تھا جب محبت اور محبوب کو بڑے جتنوں سے پایا ہو پھر اس کی جی جان سے قدر بھی کرتے۔ غصہ سلوئیٰ سے زیادہ ہم سب کو ہے۔ ہم سب کی اور سارے زمانے کے ہاتھوں کی لعنتیں بھی تمہارے لیے کم جو تم نے سلوئیٰ کے ساتھ کیا ہے۔ اب بھگتنا ساری عمر۔

"کسوف" اس تحریر کا موضوع ہمارے معاشرے کا ناسور بن گیا۔ بات تو کوئی نئی نہیں۔ ازل سے شاید یہ بدفعلی ہوتی آ رہی ہے۔ مگر پہلے ایسی باتیں دبا دی جاتی تھیں مگر اب ایسی باتوں کو بلکہ ایسے مردوں اور شہ دی رہی۔ جو صاحب حیثیت ہے وہ بچ جاتا ہے۔ اور کمزور ایسی جرات کر نہیں سکتا۔ ذیشان سر کو بھولنا نہیں چاہیے تھا۔ کہتے ہیں دشمن اور دشمنی کو اتنا ہلکا نہیں لینا چاہیے۔ پاؤں کے نیچے دشمن کو اپنا سایہ سمجھنا چاہیے۔ جہاں غفلت برتی دشمن کا وار چل گیا۔ اب وار خنجر کا ہو یا زبان کا، وار تو وار ہی ہوتا ہے۔ یہ تو میرا فقرہ ہے میں سب پر ترس کھاتی رہی اور اب جب مجھے ضرورت پڑی تو کوئی ترس بھری مسکراہٹ بھی نہیں دیتا۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ چوتھی دہائی گزارے جو یہ دنیا شہد سے بھی میٹھی لگتی ہے۔ اب اس کا زہر ہضم نہیں ہو پا رہا۔ ارے بھئی دنیا گول پہیہ ہے۔ اس کے چکر میں سب نے آج ہی آنا ہے۔ تحریر کا موٹو یہی تھا۔ کہ دشمن سامنے ناں ہو تو اسے بھولنا نہیں چاہیے۔

مکمل ناول "ایک لمحہ جاوداں" ایک سادہ سے گھریلو ماحول کی داستان جسے پڑھ کر مزا آیا۔ اب کہاں ایسی اماں بیگم اور میاں صاحب جدید دور ماما اور پاپا میاؤں میاؤں بن گئے۔

طیب جیسے کزن کی تو رج کے چھترول کرنی چاہیے۔ اور وہی گیارہ نمبر چھتر سے ہوش ٹھکانے آ جائے کہ شریف گھرانے کے شریف زادوں کو ایسی گھٹیا پن زیب نہیں دیتا۔ فردوس اور فخر النساء دونوں کی لڑائی مزے کی تھی مگر کوئی اس دوران ہمارا بھی تو کھلا منہ بند کروا لے یہ بتلا دے یہ منگوچیاں آخر ہوتی کیا ہیں۔ جو مرغیاں ڈکار گئیں اور ہمیں کانوں کان خبر تک ناں ہوئی۔ (منگوچیاں اے کی چیز اے) افسانے اس بار سب ہی اچھے تھے مگر تیشہ فرہاد آپ نے تو دل کو کرلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اتنا روئی ہے اس تحریر کو پڑھ کر آپ نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے رونا کس بات پر آ رہا۔ لڑکی کی بے بسی پر، ماں کی لاچاری پر یا ماں جائے کی بدنصیبی پر۔ بہر کیف ہمارا معاشرہ ایسی تحریر کی عکاسی کر رہا ہے۔ "کبھی کبھار" بھئی یہ تو ازلی دھاندلی ہے بیویوں کی۔ یا یہ کہیں میاں کی کمائی پر میکے کا ٹیگ لگاتا۔ کبھی کبھار یا پھر ایک آدھ بار تو ٹھیک ہے۔ کہ یہ بھی ایک قسم کا چس کہہ لیں۔ عورتوں کا (منگر مکو والی چس) کہیں تو ایسی

ہوتی ہیں۔ پورے کا پورا میاں پر بھی میکے کا ٹیگ لگا دیتی ہے۔

''کرن کرن خوشبو'' اس بار مجھے سارے کا سارا پسند آیا۔ ''یادوں کے دریچے'' کہیں کہکشاں تھی تو کہیں عصیاں کا ہجر۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' سبق آموز تھے۔ گاجر کہاں میں سبزی 100 - 150 سے کم ہوئی نہیں۔ اب کیا کسی نے چسکے لگانے تھے اب تو دو ٹائم کا پورا ہو جائے تو غنیمت ہے۔

''نامے میرے نام'' سرفہرست اقصیٰ شہزاد مقابل ہے آئینہ۔ واہ جی کرن سے محبت کا حق ادا کر رہی ہو۔

''مقابل ہے آئینہ'' میں پڑھا ہے۔ اقصیٰ آپ سب گھر والے۔ کبھی کبھار درازی عمر کے دو نوافل پڑھا کریں۔ اللہ پاک آسانیاں فرمائے گا۔ رنگ کے لیے اولیویا کا لوشن ایک چمچہ، ایلوویرا ایک چمچہ، روغن بادام چار پانچ قطرے، وٹامن ای کے چار کیپسول مکس کر کے فیس پر لگانے سے شرطیہ رنگ گورا ہو گا۔ نوشی مغل جلال پور بھٹیاں ہیں کہاں۔ اتنا اچھا شعر نوشی مغل شاعرہ ہو گئی۔ آمنہ بتول میر رئیس میری اکلوتی بھانجی کہہ رہی ہیں خالہ جانی نوشی آپو کو کہیے۔ آپ لوکیشن بتائیں ہم بنفس نفیس خود لینے آ جاتے ہیں۔ نال گال بات وی ہو جاوے گی۔ ویسے اک گل تجی تجی دسنا اتنی فنی باتیں کیا کھا پی کر لکھتی ہیں۔ آمنہ بتول نے تبصرہ پڑھا یہ تو آپ سے بھی زیادہ مذاقاً ہیں۔

حسنہ کرم کی باتیں سے میرا بھی اتفاق ہے کہ رطابہ جیسی عورتیں نہیں جھک سکتیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بھی کوئی دماغ کے خلل کی نشانی ہے۔ ایسے لوگ برداشت کا امتحان ہوتے ہیں کہ دوسروں کو مرنے پر مجبور کر دیں۔

16 مارچ اور 24 مارچ کو زرعائشہ عمران کی پہلی سالگرہ اور ام ہانیہ عمران کی گیارہویں سالگرہ ہے۔ دونوں شہزادیوں کو خوش آباد رکھے۔ آمین

زندگی سے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے۔

شرف کالونی کراچی کی نادیہ۔ فائزہ نسیم کو سلام۔ کیسی ہیں آپ سب۔ صفیہ تبریز بھاگوال سے معلوم ہوا آپ بھی کرن کی شوق سے پڑھتی اور مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ افسوس آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ نادیہ آپ کے والد صاحب کی وفات کا دلی افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت و بخشش فرمائے۔ آمین

ج: فوزیہ! ہماری طرف سے ام ہانیہ اور زرعائشہ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد۔ منگوچیاں مونگ کی دال پیس کر کچھ لوگ دھوپ میں سکھا کر پکاتے ہیں۔ اور کچھ پھلکیاں تل کر شوربے میں ڈالتے ہیں۔

عائشہ کیانی......راولپنڈی

امید ہے کہ سب قارئین خیر و عافیت سے ہوں گی۔ سب بہنوں کے لیے میرا پیار بھرا اسلام۔ سب سے پہلے تمام قارئین کو عید مبارک اور میری عید......! میں کیسے مناؤں عیدیں میرا چاند مجھ کو نظر آوے نہ ایسا میرے ساتھ ہے۔ نومبر اور دسمبر کا ماہانہ ایک ساتھ ہی لے کر آئی۔ نومبر کے ماہنامے پر ماڈل بہت معصوم سی لگی۔ کیوٹ سی۔

''میری بھی سنیے'' ثناء نادر کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ ام ہانی کا افسانہ ''پیاری خالہ گندی ماما'' اچھا تھا۔

نگہت سیما کا مکمل ناول ''کیمیا گر'' زبردست تھا۔ ناول پڑھتے پڑھتے نجانے کب آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ آپا جی کی ایک بار کی کہی بات میرے دل پر جا لگی۔ ''زندگی میں آپ کو دو طرح کے لوگ ملتے ہیں ایک وہ جو ہیرو کو زیرو کر دیتے ہیں۔ سونے کو مٹی کر دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو پیتل کو سونے میں تبدیل کر دیتے ہیں اور پتھروں کو ہیروں میں۔ تو خالو اپنی دعاؤں میں یہ دعا بھی شامل کر لو کہ تمہارا واسطہ اچھے لوگوں سے پڑے۔ عندلیب زہرا کا افسانہ ''ماموں کی دلہن'' پڑھ کر مریم کی جگہ خود کو

محسوس کر رہی تھی۔ میرے بابا کی آنکھوں پر بھی دوسری عورت کے عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی بلکہ ہے۔ نجانے کب کھلے گی۔

فلک تنویر کا مکمل ناول "سرخ" پڑھ کر اچھا لگا۔ امامہ نے سبکتگین کی قدر نہیں کی اور خود غرضی کی انتہا پر پہنچ گئی۔

عروج آصف کا افسانہ "ساتھ" پڑھ کر طارق صاحب کے ساتھ میرے بھی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور ان کی کہی ہوئی بات "مشکل وقت ٹل تو جاتا ہے مگر اس مشکل وقت کے لگائے گئے گھاؤ اتنے گہرے ضرور ہوتے ہیں۔ کہ ان کو مندمل ہونے میں اک عرصہ لگ جاتا ہے۔"

حفصہ منظور کا افسانہ خاتون کی ڈائری سے ہاہاہا دل کی بات کہہ ڈالی حفصہ صاحبہ نے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی سوال اتنا غصہ دلاتا ہو گا جتنا کہ یہ سوال "تم کرتی کیا ہو سارا دن؟" ہاہاہا۔

فرح بھٹو کا افسانہ "ڈیلیور ٹو ڈے" کافی اچھا تھا۔ فیملی خدا کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ ماہر کو اس بات کا احساس صدیقی صاحب نے دلا دیا۔ افراح شاہینہ کا افسانہ "مجھ سے پہلی سی محبت" اچھا تھا۔

"کرن کرن خوشبو" میں بہت اچھی اچھی باتیں پڑھنے کو ملی مگر لقمان حکیم کا جواب دل کو جا کر لگا۔ "کہ جب کوئی صاحب ظرف، کسی کم ظرف کا محتاج ہو جائے تو یہ زندگی میں موت سے بھی تلخ لمحہ ہے۔"

نامے میرے نام میں سب بہنوں کے خطوط پڑھ کر اچھا لگا۔ فوزیہ، فہمیدہ، اقصیٰ شہزاد اور ماریہ نذیر کرن کی پکی لکھاری ہیں۔ طیبہ شوکت کو کرن کی محفل میں خوش آمدید۔ مریم اور عائشہ کو بھی خوش آمدید۔

ج: عائشہ! نصیب انساں اوپر سے لکھوا کر دنیا میں آتا ہے۔ ہمیں بس صبر و برداشت سے کام لینا ہوتا ہے۔ آپ کے نصیب کی خوشیاں آپ کو ضرور ملیں گی ان شاء اللہ۔

ماہ رخ بلند...... کراچی

سب سے پہلے میری طرف سے سب کو السلام علیکم (کوئی جواب بھی دے دیا کرو)۔ "نامے میرے نام" میں نوشی آپی کا خط دیکھا۔ جس میں نوشی آپی نے کہا ہے کہ (میں دو ماہ غائب ہو گئی تو مدیرہ آپی سمیت کوئی مجھے یاد کرے گا یا میری کرن سے گمشدگی کی رپورٹ درج کروائے گا۔) تو نوشی آپ کی اس بات کی وجہ سے ہی میں نے قلم اٹھایا ہوا ہے اور اب بھی خط لکھ رہی ہو۔ رہا آپ کی اس بات نے مجھے بہت hurt کیا ہے۔ آپ کی وجہ سے ہی تو کرن میں اتنی رونق لگی ہوتی ہے۔ جب میں غائب ہوتی ہوں آپ ہی تو مجھے یاد کرتی ہیں آپ کے علاوہ یہاں پہ میرا اور ہے ہی کون اور آپ نے وہ بات کر دی کہ میں دو ماہ غائب ہو گئی تو۔ کوئی مجھے یاد کرے گا کسی اور کا تو نہیں پتا لیکن آپ غائب ہو گئیں تو میں ایک سال کے لیے غائب ہو جاؤں گی۔ سن لیں نوشی آپی، کیوں کہ میں خط دو وجہ سے لکھتی ہو ایک کرن کی وجہ سے دوسری آپ کی وجہ سے۔

(ویسے ایک بات بتائیں نوشی آپی) یہ کرن کی قارئین صرف اپنی فرینڈز کو ہی یاد کرتی ہیں اور ان سے ہی باتیں کرتی ہیں مجھے تو کسی نے (wellcome) بھی نہیں بولا تھا سوائے آپ کے، عشو آپی، ماریہ ثناء، اقصیٰ آپی لوگو کے۔ ویسے پلیز کوئی میری بات کا برا نہ مانے کسی کو میری بات بری لگی ہو تو سوری۔ میں خط بہت سوچ سمجھ کر لکھتی ہوں کہ کسی کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔ اقصیٰ شہزاد، ثنا آپی، ماریہ آپی کیا آپ لوگ مجھ سے دوستی کریں گی آپ کے جواب کا انتظار کروں گی میں نوشی آپی اور عشو آپی تو آل ریڈی میری دوست ہیں۔ اوکے میں اب جا رہی ہوں۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ پورے تبصرے کی ساتھ حاضر ہوں گی۔

☆☆